امریکہ میں جمہوریت

ڈی ٹاکیویل۔

مترجم

محمد اسمعیل

(سلسلۂ پاک امریکن مطبوعات ۴)

امریکہ میں جمہوریت

امریکہ میں جمہوریت

مصنّف: ـــــــ ڈی ٹاکیویل

ترجمہ: ـــــــ حماد سہیل

پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ ۰ ۱۷۶ انارکلی ۰ لاہور

(بہ شرکت ہیرز فیفر اینڈ سائمن، انکارپوریٹیڈ، نیویارک)

اشاعتِ اوّل ———— پندرہ ہزار

دسمبر ۱۹۵۹ء

محمد امین پرنٹر پبلشر نے علمی پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر
پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ ۱۷۶ انارکلی لاہور کے لئے شائع کیا

فہرست مضامین

جزو اوّل

		صفحہ نمبر
۱	اینگلو امریکن قومیت کا آغاز	۹
۲	اینگلو امریکیوں کی جمہوری اور سماجی حالت	۲۴
۳	امریکہ میں عوام کا اقتدارِ اعلیٰ	۳۵
۴	حکومت مقامی	۳۹
۵	امریکہ میں عدم مرکزیت اور اس کے اثرات	۴۴
۶	امریکہ میں عدالتی اختیارات اور ان کا اثر	۵۷
۷	وفاقی آئین کے چند پہلو	۶۵
۸	سیاسی جماعتیں	[illegible]
۹	امریکہ میں آزادیٔ صحافت	۸۴
۱۰	امریکہ میں سیاسی انجمنیں	۹۰
۱۱	امریکہ میں جمہوریت کے فوائد	۹۶
۱۲	اکثریت کے غیر محدود اختیارات اور اس کے اثرات	۱۰۶

		صفحہ نمبر
۱۳	اکثریت کے استبداد میں اعتدال پیدا کرنے والے عوامل	۱۱۹
۱۴	جمہوریت کو برقرار رکھنے میں مدد دینے والے عوامل	۱۲۷
۱۵	امریکہ کے مستقبل کے امکانات	۱۳۳
۱۶	اہلِ امریکہ کا فلسفۂ حیات	۱۴۰
۱۷	مذہب پر جمہوریت کا اثر	۱۵۱
۱۸	مساوات کا اثر انسانی تصورات پر	۱۵۶
۱۹	سائنس، ادب اور آرٹ کے بارے میں جمہوری قوموں کا مذاق	۱۵۹
۲۰	امریکی عملی علوم کو نظریاتی علوم پر کیوں ترجیح دیتے ہیں؟	۱۶۶
۲۱	امریکی اور فنون	۱۶۹
۲۲	جمہوری دور کی ادبی خصوصیات	۱۷۴
۲۳	جمہوری اقوام میں شاعری کے چند ماخذ	۱۷۸
۲۴	امریکی ادیبوں اور مقررین کا اسلوب	۱۸۵
۲۵	جمہوری دور کے مؤرخین	۱۸۷

جزوِ دوم

۲۶	جمہوری اقوام مساوات کو آزادی پر کیوں ترجیح دیتی ہیں؟	۱۹۲
۲۷	جمہوری ملکوں میں انفرادیت	۱۹۶
۲۸	انفرادیت اور آزاد ادارے	۱۹۹
۲۹	عوامی انجمنیں اور شہری زندگی	۲۰۴

صفحہ نمبر

۳۰ عوامی انجمنوں اور اخبارات کا تعلق ۲۱۰
۳۱ سیاسی اور شہری انجمنوں کے تعلقات ۲۱۴
۳۲ امریکہ میں جسمانی راحتوں کا مذاق ۲۱۸
۳۳ امریکیوں کی صنعت وحرفت سے وابستگی ۲۲۲
۳۴ کیا صنعت امریکہ میں اشرافیہ پیدا کرے گی ۲۲۶

جزوِ سوم

۳۵ جمہوریت کا اثر افراد کے باہمی روابط پر ۲۳۱
۳۶ امریکی غیر ممالک میں زیادہ حساس کیوں ہو جاتے ہیں؟ ۲۳۵
۳۷ جمہوریت کا اثر اُجرتوں پر ۲۴۱
۳۸ جمہوریت کے اثرات خاندان پر ۲۴۵
۳۹ جمہوریت میں عورتوں کی حیثیت ۲۵۳
۴۰ مساواتِ اور اخلاقِ عامہ ۲۶۰
۴۱ امریکی اور جنسی مساوات ۲۶۷
۴۲ اصولِ مساوات اور گروہ بندیاں ۲۷۰
۴۳ امریکیوں کے طرزِ معاشرت کے بارے میں ۲۷۴
۴۴ امریکیوں کا قومی غرور ۲۷۹
۴۵ امریکی معاشرہ کی چند نمایاں خصوصیات ۲۸۲
۴۶ امریکہ میں حوصلہ مندوں کی کثرت ۲۸۵
۴۷ جمہوری ملکوں میں عہدہ پرستی ۲۹۱
۴۸ عظیم انقلابات ناپید کیوں ہو جائیں گے؟ ۲۹۴

جمہوری اقوام امن اور جمہوری فوجیں جنگ کیوں چاہتی ہیں ؟ ۳۰۳
۵۰ جمہوری افواج کی چند خصوصیات ۳۱۲
۵۱ جمہوری ممالک اور جنگ ۳۱۸

جزوِ چہارم

۵۲ مساوات اور آزاد ادارے ۳۲۵
۵۳ جمہوری اقوام کے افکار اور اقتدار میں مرکزیّت ۳۲۷
۵۴ جمہوری قوموں کے جذبات سیاسی اقتدار میں مرکز کے ہم آہنگ ہوتے ہیں ۳۳۰
۵۵ مرکزیّت کی طرف لے جانے والے مخصوص اسباب اور رکاوٹیں ۳۳۴
۵۶ جمہوری قوموں کو کس قسم کے استبداد کا خدشہ ہو سکتا ہے ؟ ۳۴۰
۵۷ حاصلِ کلام ۳۴۵

(حصّہ اوّل)

۱۔ اینگلو امریکن قومیّت کا آغاز

بچّے کی پیدائش کے بعد، اس کی زندگی کے ابتدائی چند سال بچپن کی صعوبتوں یا مسرّتوں میں خاموشی سے بسر ہو جاتے ہیں۔ جب وہ بڑا ہوتا ہے اور سنِ شعور میں داخل ہوتا ہے تو دنیا اس کا خیر مقدم کرتی ہے اور وہ اپنے دوستوں اور ہم عمروں سے میل جول بڑھاتا ہے۔ اس وقت پہلی مرتبہ اس کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ اس دَور ہی میں اس کی آئندہ زندگی کی اچھائیاں اور برائیاں بنتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ طریقہ کار درست نہیں ہے۔ ہمیں انسان کے مطالعہ کا آغاز اس سے پہلے کر دینا چاہیئے، بچہ کا بغور مطالعہ اس وقت ہی کرنا چاہیئے جب وہ ماں کی گود میں ہو —— ان اوّلین نقوش کا جو بچہ کے ذہن پر دنیا کے بیرونی اثرات مترتب کرتے ہیں اور اس کے اوّلین مشاہدات کا جائزہ لینا چاہیئے۔ ان الفاظ کو سننا چاہیئے جو اس کی خوابیدہ قوّتِ تخیل کو بیدار کرتے ہیں اور جو اس کی اوّلین مساعی میں اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ اسی طریقہ کار سے ہم انسان کے ان تعصّبات، عادات اور جذبات کو سمجھ سکتے ہیں جو اس کی زندگی پر حکمران ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ انسان کا مطالعہ سب سے پہلے اس کے گہوارہ ہی میں کرنا چاہیئے۔

قوموں کی نشوونما اور ارتقاء بھی فرد کی زندگی سے مماثلت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے ابتدائی دور کے اثرات کی حامل ہوتی ہے۔ وہ حالات جن کے تحت قومیں پیدا ہوتی ہیں اور ترقی کرتی ہیں، ان کی ساری زندگی پر اثر انداز رہتے ہیں۔ اگر ہم ریاستوں کے اجزائے ترکیبی سے اپنے مطالعہ کا آغاز کریں اور تاریخ کے قدیم ترین ماخذوں کا جائزہ لیں تو یقیناً اس بات کا اندازہ ہوگا کہ قوموں کے تصوّرات، تعصبات، عادات، مختصر یہ کہ وہ تمام خصوصیات جنہیں ہم قومی کردار کہتے ہیں کس طرح تشکیل پائی ہیں اور ان کے اسباب کیا تھے؟ اس سے بعض ایسے رسوم پر روشنی پڑے گی جو بظاہر مروج عادات سے مختلف نظر آتے ہیں ایسے قوانین کی ابتداء کا پتہ چلے گا جو مروجہ اصولوں سے متصادم دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے بعض اقوام کی تقدیر کی وضاحت ہو سکے گی جنہیں بعض نامعلوم قوتوں نے ایسے مقاصد سے وابستہ کر رکھا ہے جن کے بارے میں خود انہیں کچھ علم نہیں۔ لیکن اس قسم کی تحقیقات کے لیے جس مواد کی ضرورت ہے اس کی اب تک ہمیشہ کمی رہی۔ خود قوموں میں تحقیق و تجسّس کا جذبہ بعد میں پیدا ہوا۔ اور جب انہوں نے اپنے آغاز و ابتداء کی کہانی معلوم کرنے کی کوشش کی تو وقت نے اس پر گہرا پردہ ڈال دیا۔ یا جہالت یا فخر و خودستائی کی بناء پر قوموں کی ابتداء ایسی کہانیوں کا مجموعہ ہوگئی جنہوں نے صداقت کو چھپا دیا۔

امریکہ ایسا واحد ملک ہے جہاں معاشرہ کو قدرتی اور پر امن طور پر نشوونما پاتے ہوئے مشاہدہ کرنا ممکن ہو سکا۔ اور جہاں ان اثرات کی واضح طور پر تمیز کی جا سکتی ہے جو ریاستوں کے مستقبل پر ابتداء سے مرتب ہوئے، نتیجۃً امریکہ ایک ایسی عظیم حقیقت کو روزِ روشن میں دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے جسے عہد قدیم کی جہالت اور لاعلمی نے ہمارے محققین سے چھپا رکھا ہے۔ عہد حاضر کے امریکی خوش قسمت ہیں کہ وہ امریکہ کی ریاستوں کے معرضِ وجود میں آنے کے زمانے سے اس قدر قریب ہیں کہ وہ اس

وقت کے حالات اور واقعات سے ٹھیک ٹھیک طور پر واقف ہیں اور وہ اس زمانے سے اس قدر دور بھی ہیں کہ اس زمانے کے بعض نتائج اور کارناموں کا کماحقہٗ اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس طرح وہ انسانی ارتقاء کے مختلف ادوار کا اپنے پیشروؤں سے زیادہ بہتر طور پر مطالعہ کرنے کے موقف میں ہیں۔ قادرِ مطلق نے ہمیں ایک ایسی شمع سے نوازا ہے جس سے ہمارے آباو اجداد محروم تھے۔ اور ہمیں اس بات کا موقع عطا فرمایا ہے کہ ہم تاریخ عالم کے بنیادی اسباب و علل کی تمیز و مشاہدہ کر سکیں، جسے ماضی نے ان کی نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا۔ امریکہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر ہم امریکہ کی سماجی اور سیاسی حالت کا مطالعہ کریں۔ تو یہ یقین ہو جائے گا کہ امریکہ میں کوئی رسم، روایت، رائے قانون اور یہاں تک کہ کوئی ایسا واقعہ نہیں ملے گا جس کی وضاحت امریکی قوم کی آغاز کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔

مختلف زمانوں میں امریکہ کی سرزمین پر آباد ہونے کے لیے جو تارکانِ وطن امریکہ پہنچے وہ ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ان کے مقاصد الگ تھے۔ اور وہ مختلف اصولوں کے تحت اپنے آپ پر حکمرانی کرتے تھے۔ لیکن ان لوگوں میں بعض باتیں مشترک بھی تھیں اور یہ سب لوگ یکساں صورتِ حال سے دوچار تھے۔ انسانوں کو متحد کرنے کے لیے زبان کا بندھن غالباً سب سے زیادہ مضبوط اور پائیدار ہوتا ہے تمام تارکانِ وطن ایک ہی زبان بولتے اور ان سب کا تعلق ایک قوم سے تھا۔ وہ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جہاں صدیوں سے مختلف دھڑوں میں کشمکش جاری تھی۔ اور جہاں تمام جماعتیں اس بات پر مجبور تھیں کہ اپنے آپ کو قانون کی حفاظت میں دے دیں۔ ان کی سیاسی تعلیم اس ہنگامہ پرور مکتب میں ہوئی تھی اور انہیں اپنے یورپی ہمعصروں کے مقابلہ میں تصوراتِ حقوق اور حقیقی آزادی کے اصولوں سے زیادہ واقفیت تھی۔ جس زمانے میں امریکہ میں تارکانِ وطن کی آمد شروع ہوئی اس وقت انگلستان میں شہری

نظم و نسق کا نظام، جو آزاد اداروں کا اولیں جزو ہے انگریزوں کی عادت ثانیہ بن چکا تھا، اور اس کے ساتھ ہی عوام کے اقتدار اعلیٰ کا نظریہ ٹیوڈر خاندان کے حکمرانی کے دور میں نشوونما پا چکا تھا۔

ایک اور بات جس کا تعلق نہ صرف انگریزوں سے بلکہ تمام یورپ نژاد باشندوں سے ہے جو بتدریج "نئی دنیا" میں جاکر آباد ہوتے۔ تمام یورپی نوآبادیوں میں مکمل جمہوریت کا مشترک عنصر تھی۔ اگرچہ وہ زیادہ ترقی یافتہ شکل میں موجود نہ تھی۔ غالباً اس کی دو وجوہ تھیں۔ اپنی مادرِ وطن کو خیرباد کہنے کے بعد تارکانِ وطن نے اس تصوّر کو بھی ترک کر دیا تھا کہ کسی ایک شخص کو دوسرے پر برتری حاصل ہے۔ خوشحال اور با اثر لوگوں نے ترکِ وطن نہیں کیا تھا اور لوگوں میں مساوات کے لئے غربت اور بدقسمتی سے زیادہ کوئی اور یقینی ضمانت نہیں تھی۔ امریکہ کی دریافت کے بعد بارہا ایسا ہوا ہے کہ مذہبی یا سیاسی جھگڑوں نے عالی مرتبت لوگوں کو ترکِ وطن کرکے امریکہ جانے پر مجبور کر دیا۔ امریکہ میں درجہ بندی قایم کرنے کے لیے قانون بنائے گئے لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ امریکہ کی سرزمین مراتب بندی کے پودے کے نشوونما کے لیے غیر موزوں ہے۔ وسیع و عریض زمینوں میں کاشت کرنے کے لیے، خود مالک کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنا خون پسینہ ایک کر دے۔ پیداوار اس قدر کافی نہ ہوتی کہ مالک اور کاشتکار دونوں خوشحال بن سکیں۔ چنانچہ زمین کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا اور مالک خود کاشت کرتا۔ جاگیرداری کی اساس زمین پر ہوتی ہے۔ جاگیرداری زمین سے وابستہ رہتی ہے اور اپنے کسی حق یا پیدائش ہی کی بنا پر نہیں بلکہ زمین کی ملکیت کی اساس پر نسلوں تک جاری رہتی ہے ایک ملک میں بے پناہ دولت اور بے پناہ غربت پائی جا سکتی ہے، لیکن جب تک یہ دولت مندی کسی علاقہ سے وابستہ نہیں ہے وہاں حقیقی جاگیرداری نہیں ہوگی۔

بلکہ محض امیروں اور غریبوں کے طبقات ہو گئے۔

آبادکاری کے زمانے میں تمام برطانوی نوآبادیوں میں خاندانوں کی سی مماثلت موجود تھی۔ ابتدا ہی سے ان نوآبادیوں میں ان کے مادر وطن کی سی آزادی نشوونما نہیں پا رہی تھی۔ بلکہ متوسط اور نچلے طبقات کی آزادی نشوونما نہیں پا رہی تھی بلکہ متوسط اور نچلے طبقات کی آزادی نشوونما پا رہی تھی جس کی مکمل مثال اس وقت تک تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی تھی۔ لیکن اس عام یکسانیت میں بھی متعدد اختلافات نمایاں نظر آتے تھے جن کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اس عظیم انیگلو امریکی خاندان کی واضح طور پر دو شاخیں تھیں جن میں سے ایک جنوب میں اور دوسری شمال میں تھی - اور یہ ایک دوسرے سے اختلاط کے بغیر نشوونما پا رہی تھیں۔

ورجینیا میں پہلی انگریزی نوآبادی قائم ہوئی، آبادکاروں نے ۱۶۰۷ء میں اس پر قبضہ کیا۔ اس زمانے میں یورپ میں یہی نظریہ عام تھا کہ سونے اور چاندی کی کانیں ہی قومی دولت کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔ یہ ایسا تباہ کن فریب تھا کہ اس نے یورپی اقوام کو بے حد نقصان پہنچایا۔ اور امریکہ میں اس کی وجہ سے اس قدر جانیں ضائع ہوئیں کہ جنگوں اور برے قوانین کی وجہ سے بھی اتنا اتلافِ جان نہیں ہوا۔ جو لوگ ورجینیا بھیجے گئے تھے وہ سونے کے متلاشی تھے۔ مگر ان کے پاس وسائل تھے اور نہ کردار۔ اور ان کی ہنگامہ آفرینی اور نچلی طبیعت نے اس نوزائیدہ نوآبادی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ اور اس کی ترقی کو غیر یقینی بنا دیا۔ ہنرکار، معمار اور کاشتکار بعد میں آئے اگرچہ وہ نسبتاً زیادہ صاحب کردار اور منظم لوگ تھے لیکن وہ بھی انگلستان کے پست طبقوں کے لوگوں سے کوئی زیادہ بہتر نہ تھے۔ ان نئی آبادیوں کی بنیاد نہ تو علیٰ نظریات پر قائم تھی، نہ روحانی تصورات پر، ابھی نوآبادی قائم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ غلامی کو رائج کر دیا گیا - اور یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے جنوب کے

کردار قوانین اور اس کے مستقبل پر بے پناہ اثر ڈالا۔ غلامی محنت کی وقعت گھٹاتی ہے اور معاشرہ میں سستی اور کام چوری کو رواج دیتی ہے۔ اور سستی اور کام چوری کے جلو میں جہالت، تفخر، تعیش اور مصائب آتے ہیں۔ یہ انسان کی ذہنی صلاحیتوں کو کمزور کر دیتی ہے اور انسان کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے۔ غلامی نے انگریزوں کے کردار سے مل کر جو اثرات مرتب کیے، اس کی وضاحت امریکہ کی جنوبی ریاستوں کے عادات اور سماجی حالات سے ہوتی ہے۔

شمال میں بھی انگریزی کردار، اس سے بالکل مختلف رنگ میں رنگا گیا۔ شمال ہی میں دو یا تین اہم نظریات کو، جو اب امریکہ کے نظریہ معاشرت کی اساس ہیں پہلی مرتبہ ملایا گیا۔ اور اب ساری امریکی دنیا پر ان نظریات کی حکمرانی ہے "نیو انگلینڈ" کی تہذیب روشنی کے ایک ایسے مینار کے مانند ہے جس نے اپنے گرد و پیش کے علاقہ میں نور و حرارت پھیلانے کے بعد، دور دور افق تک کو منور کر دیا۔

"نیو انگلینڈ" کے ساحلوں پر جن آباد کاروں نے قدم رکھا تھا وہ اپنے ملک کے نسبتاً زیادہ آزادی پسند طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ امریکہ کی سرزمین میں ان کے اتحاد نے فوری طور پر ایک ایسے حیرت انگیز معاشرے کو جنم دیا جو نہ امراء پر مشتمل تھا اور نہ عوام پر، یعنے یہ کہ یہ نہ دولت مندوں کا معاشرہ تھا اور نہ غریبوں کا۔ ان کی بڑی اکثریت ذہین لوگوں پر مشتمل تھی۔ اور بلا استثناء سب کے سب کافی تعلیم یافتہ تھے اور ان میں سے اکثر برِاعظم یورپ میں اپنی صلاحیتوں اور کارناموں کی وجہ سے نام پیدا کر چکے تھے۔ دوسرے علاقوں میں نو آبادیاں ایسے طالع آزماؤں نے قائم کی تھیں جن کے بیوی بچے اور دیگر خاندان نہ تھے۔ اس کے برعکس "نیو انگلینڈ" کے نو آبادکار اپنے ساتھ اخلاق اور نظم و ضبط کے بہترین عناصر لائے تھے۔ امریکی ساحلوں پر وہ اپنے بیویوں اور بچوں کے ساتھ لنگر انداز ہوئے تھے لیکن ان لوگوں کو جو بات اور دل

سے ممیز کرتی تھی ۔ وہ یہ تھی کہ انہوں نے ترکِ وطن ایک خاص مقصد کے تحت کیا تھا۔ یہ لوگ اپنی کسی ضرورت کے تحت ترکِ وطن کرنے پر مجبور نہیں ہوئے تھے۔ اپنے ملکوں میں انہیں ایک قابلِ رشک سماجی حیثیت حاصل تھی اور ان کے ذرائع آمدنی کافی اور یقینی تھے۔ ترکِ وطن کے مصائب برداشت کرنے سے ان کا مقصد ایک خاص تصور کو فتح یاب دیکھنا تھا۔

یہ تارکانِ وطن جنہوں نے اپنے آپ کو بجا طور پر زائرین (پلگرام) کے نام سے موسوم کیا، انگلستان کے ایک ایسے فرقہ سے تعلق رکھتے تھے جن کے اصولوں کی سادگی نے انہیں پیوریٹن کا نام دیا تھا۔ پیوریٹن ازم محض مذہبی عقیدہ نہیں تھا بلکہ متعدد امور میں مطلق طور پر جمہوری اور عمومی نظریات کے ہم آہنگ تھا۔ یہ ایک ایسا رجحان تھا جس نے اس نظریہ کے انتہائی خطرناک مخالف پیدا کر دیئے تھے۔ اپنی حکومت کے ستم و ظلم سے تنگ آکر اور اس معاشرہ کی عادات سے عاجز آکر جو ان کے عقیدہ کے سخت اصولوں کے تحت قابلِ مذمت تھے۔ پیوریٹن نے دنیا کا ایک ایسا غیر آباد اور تہذیب سے عاری علاقہ تلاش کیا جہاں وہ اپنے عقیدہ کے تحت زندگی بسر کر سکتے تھے۔ اور آزادی کے ماحول میں خدا کی عبادت بھی کر سکتے تھے۔ پیوریٹن ازم یکساں طور پر سیاسی اور مذہبی عقیدہ تھا۔ امریکی ساحلوں پر اترنے کے فوراً بعد انہوں نے معاشرہ کی تربیت کی طرف توجہ دی جس کا جیتا جاگتا ثبوت "معاہدہ مے فلاور" ہے

اس معاہدہ میں ان نو آبادکاروں نے یہ مقدس عہد کیا تھا کہ وہ اپنے مذہب، عقیدہ اور اصولوں کے مطابق اپنے معاشرہ کی تشکیل کریں گے۔ اور حسب ضرورت آئین و قوانین بنائیں گے اور نو آبادی کی عام بہبود کے لئے عہدیداروں کا انتخاب کریں گے اور ان کی اطاعت کریں گے۔

یہ تاریخی واقعہ ۱۶۲۰ء میں ہوا۔ اور اس کے بعد ترکِ وطن کا سلسلہ جاری رہا۔

چارلس اوّل کے دور میں برطانوی سلطنت کے طول و عرض میں جو مذہبی اور سیاسی جذبات بھڑک اٹھے، اس کی وجہ سے تارکانِ وطن کے قافلے پر قافلے امریکہ کے ساحلوں پر اترنے لگے۔ انگلستان میں متوسط طبقہ ہی "پیوریٹن ازم" کا پیرو تھا اور اسی وجہ سے تارکانِ وطن کی اکثریت بھی متوسط طبقہ سے تعلق رکھتی تھی نیو انگلینڈ کی آبادی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ نو آبادکاروں کے پرانے وطن میں ملک کے باشندے مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ لیکن نو آبادی کے تمام حصوں میں آبادی کم و بیش غیر طبقاتی تھی۔ یہاں ایک ایسی جمہوریت تھی جس کا خواب میں بھی تصور کرنا ممکن نہ تھا۔

انگلستان کی حکومت اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کے ترک وطن کرنے سے غیر مطمئن نہ تھی۔ کیونکہ اس سے ایسے عناصر ملک سے خود بخود خارج ہوتے جا رہے تھے جن سے نئے جھگڑے اور انقلابات کا امکان تھا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ حکومت نے ترکِ وطن کی ہمت افزائی کے لیئے ہر ممکن قدم اٹھایا۔ اور ان لوگوں کی قسمت اور مستقبل کے بارے میں ذرہ برابر تشویش ظاہر نہ کی۔ جو اُن قوانین کی سختی سے تنگ آکر امریکہ کی سرزمین پر پناہ لے رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تارکانِ وطن کے لیئے یہ خوابوں کی سرزمین ہے جہاں وہ کشاں کشاں چلے جا رہے تھے۔ اور طالع آزماؤں کے لیئے یہ ایک تجربہ گاہ تھی۔ جہاں ان کے لامحدود تجسّس کی تسکین ہو سکتی تھی۔ انگریزوں کی نو آبادیوں کو دوسری قوموں کی نوآبادیوں کے مقابلہ میں ہمیشہ زیادہ اندرونی آزادی اور سیاسی خود مختاری حاصل رہی۔ ان کی خوشحالی کی سب سے بڑی وجہ یہی بات تھی۔ اور آزادی کے ان اصولوں پر نیو انگلینڈ کے علاقہ سے زیادہ کسی اور جگہ عمل نہیں کیا گیا۔

حکومت انگلستان نے اپنے نئے مقبوضات کو آباد کرانے کے لیے مختلف طریقے

اختیار کئے۔ بعض وقت بادشاہ اپنی پسند کا گورنر مقرر کرتا جو اس نئی دنیا کے بعض علاقوں پر تاج کے نام پر اور تاج کے احکام کے تحت انتظام چلاتا۔ نو آبادیات پر حکومت کے لئے دوسری یورپی قوموں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ بعض وقت حکومت کی جانب سے افراد یا کمپنیوں کو زمینوں کے عطیئے دیئے جاتے۔ ایسی صورت میں سارے سیاسی اور شہری اختیارات ایک سے زیادہ افراد کو حاصل ہوتے جو حکومت کی نگرانی میں لوگوں کو زمین فروخت کرتے۔ اور باشندوں پر حکومت کرتے۔ تیسرا طریقہ کار یہ تھا کہ آباد کاروں کو ایک سیاسی معاشرہ کے طور پر منظم ہونے کی اجازت دیجاتی جو اپنی مادرِ وطن کی حکومت کے سایہ عاطفت میں اپنے آپ پر حکومت کرتے۔ نیو انگلینڈ میں اسی تیسرے طریقہ کار کو اختیار کیا گیا۔

سنہ ۱۶۲۸ء میں چارلس اوّل نے میسوچوسٹس جانے والے تارکانِ وطن کو اسی قسم کا منشور عطا کیا تھا۔ مگر عام طور پر اس قسم کے منشور نیو انگلینڈ کی نو آبادیوں کو اس وقت تک عطا نہیں کیئے گئے جب تک کہ ان کا قیام ایک حقیقت نہیں بن گیا۔ پلایی متھ، پراوی ڈنس، نیوہیونس، کنکٹی کٹ اور رہوڈ آئیلینڈ کی نو آبادیاں آبادکاروں کے وطن کی حکومت کی امداد اور علم کے بغیر ہی قایم ہوئیں۔ نئے آبادکاروں نے اپنے اختیارات شاہ سے حاصل نہیں کیئے۔ اگرچہ انہوں نے شاہ کی برتری سے انکار بھی نہیں کیا۔ انہوں نے سیاسی معاشرہ کی حیثیت سے اپنی تنظیم کر لی۔ تیس چالیس سال بعد چارلس دوم کے زمانے میں ان کے وجود کو ایک شاہی فرمان کے ذریعہ قانونی طور پر تسلیم کیا گیا۔

نیو انگلینڈ کے اوّلین تاریخی اور قانون سازی کی دستاویزات کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کڑیوں کا پتہ چلانا مشکل نظر آتا ہے جن کے ذریعہ تارکانِ وطن اپنی آبائی سرزمین سے وابستہ تھے۔ انہوں نے مسلسل خود مختارانہ طور پر اپنے

اختیارات استعمال کئے۔ اپنے مجسٹریٹوں کا تقرر کیا۔ صلحنامے کئے اور اعلانِ جنگ کیا۔ پولیس کے قواعد بنائے اور قانون سازی کی۔ اس طرح کہ وہ صرف خدا کی ذات ہی کے وفادار ہیں۔ اس زمانے کی قانون سازی سے زیادہ کوئی بات تعجب خیز اور ساتھ ہی سبق آموز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس عہد کے وضع کردہ قوانین میں ایک اہم سماجی مسئلہ کا حل موجود ہے جسے آج امریکہ ساری دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

قانون سازوں کے پیش نظر معاشرہ میں بہتر اخلاقی حالت کا قیام اہم ترین مسئلہ تھا چنانچہ انہوں نے ایسے سخت قوانین بنائے جن کا مقصد ہر قسم اخلاقی جرائم کی روک تھام تھا۔ زنا، اغوا اور دیگر جنسی جرائم کے لئے سخت ترین سزائیں دی جاتیں۔ ججوں کو اختیار تھا کہ وہ چاہے تو جرمانے کی سزا دیں یا کوڑے لگوائیں یا بد فعلی کے مجرموں کی آپس میں شادی کرا دیں۔ نیو انگلینڈ کی پرانی عدالتوں کی مثلیں شاہد ہیں کہ اس قسم کی سزائیں عام تھیں۔ یکم مئی ۱۶۶۰ء کو ایک نوجوان خاتون کو غیر مہذب اور ناشائستہ الفاظ استعمال کرنے اور بوسہ دینے پر جرمانہ کیا گیا تھا۔ اور سخت تنبیہ کی گئی تھی۔ ۱۶۵۰ء کے قانون میں بے شمار انسدادی تدابیر شامل ہیں۔ اس کے تحت کم چوری اور مدہوشی کے لئے سخت سزا دی جاتی۔ شراب خانوں کے مالکوں کو ہدایت تھی کہ وہ کسی گاہک کو مقررہ مقدار سے زیادہ شراب نہ دیں۔ دروغ گوئی کو بھی مستوجب سزا تصور کیا جاتا اور جھوٹے کو کوڑے لگائے جاتے یا جرمانہ کیا جاتا۔ بعض جگہوں پر تو قانون سازوں نے مذہبی رواداری کے اصولوں کو فراموش کرتے ہوئے جن کا خود انہوں نے یورپ میں مطالبہ کیا تھا، ایسے قوانین بنائے جن کے تحت کلیسا میں عبادت کرنا لازمی قرار دیا گیا۔ بعض نے تو اس میں اس قدر غلو سے کام لیا کہ ایسے عیسائیوں کے لیے موت کی انتہائی سزا تک تجویز کی۔ جو خدا کی عبادت، ان کے مقررہ طریقوں سے مختلف طور پر انجام دیتے ہوں۔ حد یہ کہ بعض قوانین میں تمباکو نوشی کو بھی قابلِ

تعزیر قرار دیا گیا۔ مگر یہ بات ذہن نشین رہے کہ اس قسم کے ناقابل قیاس اور تکلیف دہ قوانین، کسی برتر ہستی نے ان پر مسلط نہیں کئے تھے بلکہ خود لوگوں نے اپنی آزادانہ رائے سے یہ قوانین بنائے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ آبادکاروں کا طرز معاشرت اس سے زیادہ سادہ و سخت تھا جس کا اظہار ان کے قوانین میں ہوتا ہے۔

وہ عام اصول جو عہد حاضر کے دساتیر کی اساس ہیں سترھویں صدی کا یورپ ان سے پوری طرح آشنا نہ تھا اور خود انگلستان میں بھی انہیں مکمل فتح حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مگر نیوانگلینڈ کے قوانین میں انہیں تسلیم اور رائج کیا گیا تھا۔ سرکاری امور میں عوام کی مداخلت، آزادانہ رائے کے ذریعہ محاصل کی منظوری، شخصی آزادی، جیوری کے ذریعہ مقدمات ان تمام چیزوں کو کسی اختلاف کے بغیر رائج کیا گیا تھا۔

نیوانگلینڈ کے قوانین میں بلدی خود مختاری کے جراثیم اور ان کا بتدریج ارتقاء ملتا ہے۔ جو موجودہ عہد میں امریکی حریت کی روح اور سرچشمہ ہے۔ یورپ کے اکثر ملکوں میں سیاسی وحدت کے طور پر ان کے وجود کا آغاز معاشرہ کے اونچے طبقوں سے شروع ہوا اور یہ شعور بتدریج اور نامکمل طور پر نچلے طبقوں تک پہنچا۔ اس کے برعکس امریکہ میں بلدیات کو ضلعوں (کاونٹیوں) سے پہلے منظم کیا گیا۔ کاونٹیوں کی تنظیم ریاستوں سے پہلے عمل میں آئی ہے اور ریاستیں یونین سے پہلے منظم ہوئیں۔

نیوانگلینڈ میں ۱۶۵۰ء ہی میں قطعی اور مکمل طور پر بلدیات کی تنظیم عمل میں آچکی تھی۔ بلدی خود مختاری ایک ایسا مرکز تھا جس کے گرد مقامی مفادات، جذبات حقوق اور فرائض جمع ہوگئے اور اس سے وابستہ ہوگئے تھے۔ جس نے حقیقی معنوں میں جمہوری اور عمومی سیاسی سرگرمیوں کے لئے گنجائش مہیا کی۔ نوآبادیات

اس وقت تک بھی اپنے مادرِ وطن کی حکومت کی برتری کو تسلیم کیا کرتی تھیں۔ شاہی ابھی تک وقت کا قانون تھی۔ لیکن ہر بلدیہ میں جمہوریت قائم ہو چکی تھی۔ شہر اپنے مجسٹریٹوں کا آپ تقرر کرتے، ان کی درجہ بندی کرتے اور اپنے محصول آپ مقرر کرتے۔ نیو انگلینڈ کے شہروں میں اگرچہ ابھی تک نمائندگی کے قانون نہیں بنائے گئے تھے۔ لیکن آبادی کے مسائل پر تمام شہری کسی عام جگہ مثلاً بازار وغیرہ میں اکٹھے ہو کر غور و بحث کر لیا کرتے تھے۔

امریکی جمہوریتوں کے اولیں دور کے قوانین کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو یہ بات حیرت میں ڈالے بغیر نہیں رہ سکتی کہ یہ لوگ فنِ حکومت اور قانون سازی کے نظریات سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ انہوں نے معاشرہ کے ارکان کے فرائض اور ذمہ داریوں کے بارے میں جو نظریات تشکیل دیئے تھے۔ وہ اسی دور کے یورپی قانون سازوں کے نظریات و تصوّرات سے کہیں زیادہ جامع اور اعلےٰ وارفع تھے۔ نیو انگلینڈ کی ریاستوں میں ابتداء ہی سے قانونی طور پر غریبوں کی حالت کو بہتر بنانے کی طرف توجہ دی گئی۔ اور ان کی سدھار کے لئے سخت اقدامات اختیار کئے گئے۔ ہر شہر میں ایسے ریکارڈ ہوتے جن میں عام مباحث، حیات و ممات اور شادیوں کا اندراج کیا جاتا۔ کلرکوں کو ہدایت دی جاتی کہ وہ باقاعدگی سے ان باتوں کا ریکارڈ رکھیں۔ افسروں کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ وارثوں کی چھوڑی ہوئی جائیدادوں کا انتظام کریں۔ جائیدادوں کے تنازعوں اور حد بندی کے جھگڑوں میں ثالثی کا کام کریں۔ اور اس نوعیت کے متعدد افسروں کا تقرر کیا گیا جن کا سب سے بڑا فرض معاشرہ میں امن اور نظم قائم کرنا تھا۔ غرض یہ کہ قانون میں ایسی بے شمار تفاصیل کی پیش بندی کی گئی۔ اور ایسی متعدد سماجی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا گیا جن کی فراموشی جیسے ملک میں اب بھی کمی محسوس کی جاتی ہے۔

لیکن جو بات امریکی تہذیب کے اصلی کردار کو نمایاں کرتی ہے وہ عام تعلیم کے بارے میں احکام وہدایات ہیں۔ ایک قانون میں کہا گیا ہے کہ شیطان کی (جو بنی نوع انسان کو بہکانے والا اور صراط مستقیم سے ہٹانے والا ہے) یہ کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کو کتاب مقدس کے علم سے بے خبر رکھے"۔ چنانچہ ہر بلدی تنظیم میں قانون کے تحت مدرسوں کا قیام ضروری قرار دیا گیا۔ اور شہریوں کے لیئے یہ لازمی قرار پایا کہ وہ ان سکولوں کو چلائیں ورنہ ان پر سخت جرمانے بھی عائد کئے جا سکتے تھے زیادہ آباد علاقوں میں اعلیٰ تر سکول قائم کئے گئے۔ بلدیاتی افسروں پر لازم تھا کہ وہ آبادی کے تمام بچوں کو سکولوں کو بھجوانے کا اہتمام کرائیں۔ انہیں اختیار تھا کہ خلاف ورزی کرنے والے والدین پر جرمانے عائد کریں مسلسل خلاف ورزی کی صورت میں معاشرہ بچہ کو اپنی سرپرستی میں لے لیتا اور والدین کو ان کے حقوق سرپرستی سے محروم کر کے بچہ کو اپنے قبضہ میں لے لیتا۔ امریکہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے ان قوانین کی تمہید پر توجہ دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ امریکہ میں مذہب علم کی منزل کی طرف پہنچانے والی شاہراہ ہے۔ اور ربّانی قوانین کی پابندی انسان کو شہری آزادیوں کی طرف لے جاتی ہے۔

۱۶۵۰ء کے امریکی معاشرہ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد اگر ہم اسی زمانے کے یورپ کے حالات کا مطالعہ کریں تو ہمیں اچنبھا ہوتا ہے سترھویں صدی کے برّاعظم یورپ میں قرون وسطےٰ کے جاگیردارانہ نظام کے کھنڈروں پر مطلق العنان بادشاہت قائم ہوئی تھی۔ اور ہر طرف شاہوں کی حکومت تھی۔ شان وشوکت اور ادب کی ترویج کے اس عہد میں انفرادی حقوق کے تصور کو جس بری طرح نظرانداز کیا گیا تھا اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔

اسی طرح عوام میں سیاسی سرگرمی کا فقدان تھا۔ حقیقی آزادی کے اصولوں کو بری طرح پامال کیا جا رہا تھا۔ عین اسی وقت ان ہی اصولوں کا جن سے یورپی اقوام نا آشنا تھیں یا لائق استہزا تصور کرتی تھیں، نئی دنیا کے ریگزاروں میں اعلان کیا جا رہا تھا۔ اور ایک عظیم قوم کے آئندہ لائحۂ حیات کے طور پر تسلیم کیا جا رہا تھا۔ انسانی ذہن کے آفریدہ، دلیرانہ نظریات کو ایک ایسی حقیر جماعت جامۂ عمل پہنا رہی تھی جسے کسی مدبر اور مفکر تک نے بھی درخور اعتنا تصور نہ کیا تھا۔ قانون سازی کے ایک ایسے مقام کو انسانوں کی فطری قوت تخیل نے فوری طور پر جنم دیا جس کی نظیر ماضی میں نہیں ملتی۔ اینگلو امریکی تہذیب کے کردار کو اس کے صحیح خدو خال میں پیش کرنے کے لئے میرا خیال ہے یہ تفصیل کافی ہے۔ یہ دو واضح عناصر کی پیداوار ہے جو دوسری جگہوں پر عام طور پر ایک دوسرے سے متصادم رہے ہیں لیکن جنہیں امریکہ میں انتہائی خوبی کے ساتھ ایک دوسرے میں مدغم کر دیا گیا اس سے میری مراد مذہب کی روح اور آزادی کی روح سے ہے۔

نیو انگلینڈ کے نوآبادکار مذہب پرست ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے جرأت آزما اختراع پسند بھی تھے۔ اگرچہ ان کے مذہبی عقائد کی حدود بے حد تنگ تھیں لیکن تمام سیاسی تعصبات سے پاک تھے۔ اور اسی وجہ سے دو رجحانات پیدا ہوئے۔ جو ایک دوسرے سے الگ تو تھے مگر متصادم نہ تھے اور یہ رجحانات ملک میں ہر جگہ طرزِ معاشرت اور قوانین میں جھلکتے ہیں۔

یہ بات عین فطری تھی کہ یہ لوگ جنہوں نے ایک مذہبی عقیدے کی خاطر اپنے احباب، اعزہ، اقربا اور اپنے ملک کو قربان کیا اس متاع کے حصول کے لئے تن من دھن وقف کر دیں گے جس کے لئے انہوں نے ایسی گراں قیمت ادا کی۔ مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مساوی جوش اور انہماک کے ساتھ مادی

دولت اور اخلاقی بھلائی کے لئے سرگرداں ہیں۔ اس دنیا میں آزادی اور عام بہبود اور زندگی کے بعد اُس دنیا میں نجات کے لئے کوشاں ہیں۔ انہوں نے اپنی مرضی اور خوشی کے مطابق تمام سیاسی اصولوں اور انسانی قوانین اور اداروں کو حسب ضرورت بدل دیا اور انہیں نیا رنگ دیا۔ انہوں نے ان سماجی بندشوں اور پابندیوں کو توڑ دیا جن میں انہوں نے آنکھ کھولی تھی۔ انہوں نے ان قدیم اصولوں کو ترک کر دیا جو صدیوں سے دنیا پر حکمراں تھے۔ زندگی میں ترقی کے لئے بے پناہ امکانات ان کے سامنے موجود تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس میں سمو دیا۔

اخلاقی دنیا کی ہر شے میں درجہ بندی ہے پیش بینی ہے اور نظام ہے اور ہر شے کے بارے میں پہلے ہی سے فیصلے کر لئے گئے ہیں۔ لیکن سیاسی دنیا میں ہر چیز میں ہیجان اور ہنگامہ ہوتا ہے ہر چیز نزاعی اور غیر یقینی ہوتی ہے۔ اخلاقی دنیا میں رضا کارانہ لیکن خاموش اطاعت کی ضرورت ہوتی ہے اور سیاسی ایسی ہوتی ہے جو ہر تجربہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے اور ہر اقتدار سے بدگمان ہو۔ یہ دو رجحانات جو بظاہر ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں حقیقت میں متضاد نہیں ہیں۔ وہ ایک ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور بالآخر ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔ مذہب کے نقطۂ نظر سے شہری آزادی آدمی کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کیلئے مشق کا موقع مہیا کرتی ہے۔ اور سیاسی دنیا ایک ایسا میدان ہے جسے خدا نے انسانی ذہن کو جلا بخشنے کیلئے پیدا کیا ہے۔ مذہب جو اپنے دائرہ میں آزاد اور طاقتور ہے اور اس مقام سے مطمئن ہے جو اسکے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ سب سے زیادہ حکمرانی انسان کے دل پر کرتا ہے۔ اور اسے کسی شے کی مدد و حمایت کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی ——

حریت مذہب کو تمام محاربوں، تمام فتوحات اور تمام معرکوں میں اپنا رفیق تصور کرتی ہے۔ اسے اپنے عہد طفولیت کا گہوارہ اور اسکے دعووں کا ربانی سرچشمہ گردانتی ہے۔ وہ مذہب کو اخلاق کا محافظ اور اخلاق کو قانون اور آزادی کی بقا کا یقینی اور بہترین ضامن تصور کرتی ہے۔

۲- اینگلو امریکنوں کی جمہوری اور سماجی حالت

سماجی حالت عام طور پر حالات کی پیداوار ہوتی ہے۔ بعض وقت یہ قوانین کا نتیجہ ہوتی ہے اور بسا اوقات یہ دونوں اسباب متحد ہو جاتے ہیں، لیکن جب یہ حالت قائم ہو جاتی ہے تو وہ بجائے خود ان قوانین، رسم و رواج اور تصورات کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ جو اقوام کی کردار اور زندگی پر حاوی ہوتے ہیں۔ جو چیزیں وہ خود پیدا نہیں کر سکتی وہ اس میں خود ترمیم کر لیتی ہے۔ اگر ہمیں کسی قوم کے قوانین اور طرزِ معاشرت سے واقفیت حاصل کرنا ہو تو ہمیں اس کے سماجی حالات کے مطالعہ سے آغاز کرنا چاہیئے۔

امریکیوں کی سماجی حالت نمایاں طور پر جمہوری ہے اور نوآبادیوں کے قیام کے وقت بھی اسکی یہی نمایاں خصوصیت تھی اور آج بھی یہی اسکی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ نیو انگلینڈ کے ساحلوں پر جو تارکان وطن آباد ہوئے ان میں زبردست مساوات موجود تھی۔ ارباب ثروت کی بلادستی کا بیج امریکی یونین کے اس علاقہ میں بویا تک نہیں گیا تھا۔ اگر کسی کا کوئی اثر تھا تو صرف ارباب علم و دانش کا تھا۔ عوام صرف ان لوگوں کا نام عزت اور احترام سے لیتے تھے جنکی ذات علم اور تقوی کی علامت تصور کی جاتی تھی۔ یہ صورت حال دریائے ہڈسن کے مشرق میں تھی لیکن اسی دریا کے جنوب مغرب میں فلوریڈا کے علاقوں تک معاملہ اسکے برعکس تھا۔ دریائے ہڈسن کی جنوب مغربی بستیوں میں انگلستان کے چند بڑے بڑے جاگیردار آباد ہو گئے تھے۔ اور اپنے ساتھ حاکمانہ اصول اور انگلستان کا قانون وراثت لائے تھے۔ میں نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ امریکہ میں طاقت ور ارباب ثروت کا قیام کس لئے ممکن نہ ہو سکا۔

لیکن دریائے ہڈسن کے جنوب مغرب میں ایسے عناصر نسبتاً کمزور تھے۔ جنوب میں ایک شخص اپنے غلاموں کی مدد سے ایک بڑے علاقہ میں کاشتکاری کر سکتا تھا۔ اور اسی وجہ سے وہاں بڑے بڑے متمول زمینداروں کی کثرت تھی۔ لیکن ان کے اثرات کو ان معنوں میں مکمل طور پر ارباب ثروت کے اثرات نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ یورپ میں اس اصطلاح کا مفہوم لیا جاتا تھا۔ انہیں کوئی امتیازی مراعات حقوق حاصل نہ تھے۔ ان کی زمینوں پر کاشت غلام کرتے تھے اور اسطرح کوئی مزارعہ طبقہ ان پر انحصار نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا مربی پرستی اور بالا دستی کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مگر اس کے باوجود ہڈسن کے جنوب میں بڑے بڑے مالکان زمین نے اپنے آپ کو ایک برتر طبقہ بنا لیا۔ جنکے اپنے تصورات اور مذاق تھے اور وہ تمام سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ ارباب ثروت کا یہ طبقہ عوام سے ہمدردی کا اظہار کرتا اور عوام کے جذبات، احساسات اور مفادات کو اپناتا۔ لیکن یہ اس قدر کمزور اور مختصر الحیات تھا کہ نہ تو وہ عوام میں اپنے لئے محبت پیدا کر سکا اور نہ نفرت۔ یہ وہی طبقہ تھا جس نے جنوب میں بغاوت کی رہنمائی کی اور امریکی انقلاب کے بہترین رہنما پیدا کیئے۔

اس زمانے میں، معاشرہ اپنے مرکز سے ہل چکا تھا۔ عوام کے دلوں میں جنکے نام پر یہ کشمکش کی گئی تھی وہ اختیارات استعمال کرنیکی خواہش پیدا ہوئی جسے انہوں نے حاصل کر لیا تھا۔ اُسکے جمہوری رجحانات بیدار ہوتے اور اپنے اصلی وطن کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے بعد، اس طبقہ کے دل میں ہر قسم کی آزادی حاصل کرنیکی امنگ پیدا ہوئی۔ افراد کا اثر دُرسوخ بتدریج کم ہونے لگا۔ اور قانون اور رسم ورواج ایک ہی مقصد کے لئے متحد ہو گئے۔

لیکن قانون وراثت مساوات کی جانب آخری قدم تھا۔ مجھے حیرت ہے، کہ قدیم اور جدید ماہرین قانون نے اس بات کو محسوس نہیں کیا کہ قانون وراثت

انسانی امور پر کس حد تک اثر انداز ہوا۔

یہ سچ ہے کہ یہ قوانین شہری امور سے متعلق ہیں لیکن انہیں تمام سیاسی اداروں سے بلند مقام دینا چاہیئے کیونکہ وہ ملک کے عوام کی سماجی حالت پر ناقابل یقین حد تک اثر ڈالتے ہیں۔ اسکے برعکس سیاسی قوانین یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس ملک کی موجودہ حالت کیا ہے۔ علاوہ ازیں قوانین وراثت سوسائٹی پر یکساں اور یقینی طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ نہ صرف موجودہ نسل بلکہ آینوالی نسلیں بھی اس سے متاثر ہوتی ہیں انکی وساطت سے انسان اپنی آئندہ نسلوں پر ایک قسم کا مافوق الفطرت اختیار حاصل کرتا ہے۔ قانون ساز تو ایک ہی مرتبہ وراثت سے متعلق قواعد بنا کر آرام کی نیند سو جاتا ہے۔ لیکن اس طرح وہ جس مشین کو حرکت دیتا ہے صدیوں تک چلتی رہتی ہے۔ اور خود کار آلہ کی طرح اس منزل کی طرف بڑھتی ہی رہتی ہے جو اس کیلئے پہلے ہی متعین کی جا چکی ہے۔ اگر اس قانون کو ایک خاص انداز میں وضع کیا جائے تو وہ جائداد اور کو یکجا کرتا ہے اور چند ہاتھوں میں ملکیت اور اختیار کو منتقل کر دیتا ہے۔ اس سے ارباب ثروت پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر اسی قانون کو اس سے مختلف اصولوں کے تحت بنایا جائے تو اس کا عمل تیز تر ہوتا ہے۔ یہ قانون جائیداد اور اختیار دونوں کو تقسیم اور منتشر کر دے گا۔ قانون کے اس عمل کی تیزی سے گھبرا کر بعض لوگ اس کی حرکت کو روکنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی راہ میں مختلف رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ اس بات کی لاحاصل کوشش کرتے ہیں کہ مخالفانہ مساعی کے ذریعہ سے اس قانون کے اثر کو روکا جائے۔ لیکن وہ ہر رکاوٹ اور راہ کی ہر بڑی سے بڑی چٹان کو پیس کر رکھ دیتا ہے۔ اور ریزہ ریزہ کر کے فضا میں بکھیر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم صرف گرد و غبار کے ایک غیر محسوس بادل کے سوا کچھ اور نہیں دیکھ

سکتے۔ اور یہ علامت ہے جمہوریت کی آمد کی۔

تقسیم پذیر وراثت کے تحت ہر مالک جائداد کی موت جائیداد کی ملکیت میں ایک انقلاب برپا کرتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ مالک بدل جاتے ہیں بلکہ جائیداد کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ کیونکہ جائیداد مختلف حصوں میں بانٹ دی جاتی ہے۔ جو ہر تقسیم کے بعد چھوٹے سے چھوٹے حصوں میں بٹتی چلی جاتی ہے۔ یہ قانون کا راست اور طبعی اثر ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایسے ملکوں میں جہاں مساوی تقسیم وراثت کا قانون رائج ہے جائیداد اور خاص طور پر جائیداد غیر منقولہ مسلسل چھوٹے سے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہوتی رہے گی۔ مساوی تقسیم وراثت کا قانون نہ صرف جائیداد پر اثر انداز ہوتا ہے بلکہ وارثوں کے اذہان کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اور ان کے جذبات کو حرکت میں لاتا ہے۔ یہ بالواسطہ اثرات بالآخر بڑی بڑی جائیدادوں اور امارتوں کی تباہی پر منتج ہوتے ہیں۔

ان اقوام میں جن کا قانون وراثت حق بزرگی پر استوار کیا گیا ہے، بڑی بڑی غیر منقولہ جائدادیں اور اراضی تقسیم ہوئے بغیر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جائیداد سے خاندانوں کو ایک خاص وابستگی پیدا ہو جاتی ہے۔ خاندان جائیداد کی نمائندگی کرتے ہیں اور جائیداد خاندان کی، اور اس جائیداد سے خاندان کی عظمت، قوت و اختیار، محاسن و معائب ماضی کی ایک غیر فانی یادگار کے طور پر دوام حاصل ہو جاتا ہے اور یہی امر اسکے مستقبل کا ضامن ہوتا ہے۔ جب مساوی تقسیم وراثت کا قانون رائج کیا جاتا ہے تو اس سے آبائی جائیداد کے تحفظ کے لیے خاندانوں کو جو گہرا تعلق خاطر ہوتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔ جائیداد خاندان کی نمائندہ نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ ایک یا دو نسل میں لازمی طور پر تقسیم ہو جاتی ہے۔ اور اس میں ہمیشہ کم سے کم تر

ہونے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر کلی طور پر منتشر ہو جاتی ہے۔ بے شک بڑے بڑے زمینداروں کی اولاد اگر وہ تعداد میں کم ہوں یا قسمت ان کی یاوری کرے تو اپنے باپ کی طرح متمول رہنے کی امید رکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ایسی جائیداد کے مالک ہوں گے۔ جو ان کے باپ کی ملکیت میں تھی۔ اب اگر آپ کسی صاحب جائیداد کو اس تعلق سے محروم کر دیں جو اسے روایات، وابستگی اور خاندانی تفخر کی بناء پر جائیداد کی حفاظت سے ہے تو یقین جانیئے کہ وہ جلد یا بدیر اس جائیداد کو فروخت کر دے گا۔ کیونکہ جائیداد کو فروخت کرنے میں اس سے زیادہ مالی منفعت ہوتی ہے۔ جو سرمایہ گردش میں رہتا ہے اس سے زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے۔

بڑی بڑی زمینداریاں اور جاگیرداریاں ایک مرتبہ تقسیم ہونے کے بعد دوبارہ کبھی یکجا نہ ہو سکیں، کیونکہ چھوٹی زمینوں کا مالک بڑے زمینداروں کے مقابلہ میں اپنی اراضی سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرتا ہے۔ اور وہ اسے زیادہ قیمت پر فروخت کر سکتا ہے۔

نفع کے احساس ہی کی بناء پر صاحب زمین اپنی جائیداد کو فروخت کرتا ہے اور اسی وجہ سے وہ چھوٹی جائیدادوں کو خرید کر اپنی جائیداد کو وسعت نہیں دیتا۔ اس لئے کہ زمین کے چھوٹے قطعات کی قیمت نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔

خاندانی آن بان جس چیز سے عبارت ہے عام طور پر اس کی اساس محبت ذات پر ہوتی ہے۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو دائمی اور غیر فانی بنا لے اور اس کی آئندہ نسلیں اسے یاد رکھیں۔ جہاں خاندانی فخر و مباہات ختم ہو جاتے ہیں۔ وہاں انفرادی خود غرضی کام کرنا شروع کرتی ہے

جب خاندان کا تصور مبہم غیر متعین اور غیر یقینی ہو جاتا ہے تو پھر لوگ موجودہ آسائشوں اور سہولتوں کی طرف توجہ دینا شروع کرتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ صرف ایک نسل کے ہی مستقبل کا خیال کیا جاتا ہے۔ اور اس سے زیادہ آگے کی بات نہیں سوچی جاتی۔ یا تو انسان اپنے خاندان کو دائمی بنانے کا خیال ہی ترک کر دیتا ہے یا اگر وہ ایسا دوام چاہتا بھی ہے تو جاگیر اور زمینداری کے سوا کسی اور ذریعہ سے وہ اپنے مقصد کی تکمیل کی کوشش کرے گا۔

اس طرح تقسیم وراثت کا قانون، خاندانوں کے لئے نہ صرف اپنی آبائی جائیداد کی حفاظت کو مشکل بنا دیتا ہے۔ بلکہ انہیں اس قسم کی کوشش کرنے کی خواہش ہی سے محروم کر دیتا ہے۔ اور انہیں مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے ہی خاتمہ کے لئے قانون کے ساتھ تعاون کریں۔ ان دونوں ذرائع سے قانون زمینداری کی جڑوں کو کاٹنے اور خاندانوں اور جائیدادوں کو منتشر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

امریکہ میں تقسیم وراثت کے قانون نے زمینداریوں اور بڑی بڑی جائیدادوں کو تقسیم کرنے کے کام کو تقریباً پایہ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ اور یہاں ہم اس کے نتائج کا بخوبی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ انتقال جائیداد سے متعلق انگریزی قانون امریکہ کی تقریباً تمام ریاستوں میں انقلاب کے دوران ہی ختم کر دیا گیا۔ جائیداد کے قانون میں اس طرح ترمیم کی گئی کہ جائیداد کی آزادانہ گردش میں کوئی رکاوٹ نہ ہونے پائے۔ پہلی نسل کے رخصت ہونے کے بعد جائیداد مختلف حصوں میں بٹ گئی، اور وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ اس تبدیلی میں بھی تیزی پیدا ہوتی گئی۔

اور اب جبکہ تقریباً ۶۰ سال کا عرصہ گذر چکا ہے، معاشرہ کی ہیئت ترکیبی بدل چکی ہے، بڑے بڑے زمینداروں کے خاندان اب عوام میں مدغم ہو چکے ہیں، دولت

اور فراوانی میں پرورش پانے والے شہریوں کے بچے اب تاجر، وکیل اور طبیب بن گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر گوشہ گمنامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ موروثی مرتبہ اور جاہ وحشم کے آخری آثار بھی مٹ چکے ہیں۔ قانون تقسیم وراثت نے سب کو ایک سطح پر لا کھڑا کیا ہے۔

میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ امریکہ میں متمول افراد باقی ہی نہیں رہے، بلاشک امریکہ سے زیادہ شاید ہی کسی ملک کے لوگ دولت سے اس قدر محبت کرتے ہیں اور جہاں مستقل طور پر مساوات ملکیت کے نظریہ کو اس قدر حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔ مگر دولت ناقابل یقین رفتار سے گردش میں رہتی ہے اور ایسی مثالیں مشکل ہی سے ملیں گی کہ ایک خاندان میں دو نسل تک بھی تموّل باقی رہا ہو۔

اس تصویر سے جو ممکن ہے مبالغہ آرائی پر محمول کی جائے، ان واقعات کا مکمل اندازہ نہیں ہو سکتا ہے جو مغرب اور جنوب مغرب کی نئی ریاستوں میں رونما ہو رہے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں چند جرأت آزما مہم جو فرانسیسیوں نے مسی سپی کی وادی کی گہرائیوں میں پہنچنا شروع کیا۔ اور ان کے پیچھے لوگوں کے قافلے حرکت کرنے لگے۔ جنگلوں اور صحراؤں میں جہاں آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا قصبے اور شہر ابھرنے لگے۔ ریاستیں جن کا نام بھی چند سال پہلے معرض وجود میں نہ آیا تھا، امریکی یونین میں اپنے لئے مقام کی تلاش کرنے لگیں۔ اور مغربی نو آبادیوں میں انتہائی حد تک جمہوریت کارفرما ہو گئی۔ یہ ریاستیں دیکھتے دیکھتے ایک حادثہ کے طور پر قائم ہو گئی تھیں، ان کے باشندوں کا کوئی ماضی نہ تھا۔ کسی شخص کو اپنے قریبی پڑوسی سے بھی واقفیت نہ ہوتی۔ چنانچہ امریکی برّ اعظم کے اس حصّہ میں آبادی نہ صرف نامور لوں اور دولت مندوں کے اثر ونفوذ سے محفوظ رہی بلکہ علم اور تقوے کی فطری سرداری کا اثر بھی ان پر نہ پڑ سکا۔ وہاں کوئی شخص بھی اس قابل نہ تھا کہ اسے وہ

قابلِ احترام اختیارات حاصل ہوں جو لوگ اپنی رضا اور خوشی سے کسی ایسے شخص کے سپرد کرتے ہیں جس نے ان کی آنکھوں کے سامنے عام بھلائی اور بہبود کے لئے کام کیا ہو۔ مغرب کی نئی ریاستیں آباد ہو چکی تھیں لیکن وہاں حقیقی معنوں میں معاشرہ وجود میں نہ آیا تھا

امریکہ میں نہ صرف معاشی اور مالی طور پر مساوات ہے بلکہ لوگوں کی ذہنی استعداد میں بھی بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں آبادی کے تناسب سے ان پڑھ لوگوں کی تعداد اس قدر کم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اعلیٰ التعلیم یافتہ افراد بھی بے حد کم ہیں۔ ہر شخص ابتدائی تعلیم حاصل کر سکتا ہے لیکن اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اور یہ بات باعث تعجب بھی نہیں ہے۔ درحقیقت یہ ان حالات کا لازمی نتیجہ ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ہر امریکی اس قدر آسودہ حال ہوتا ہے کہ وہ ابتدائی تعلیم آسانی حاصل کر لیتا ہے

امریکہ میں دولت مندوں کی تعداد کم ہے۔ ہر امریکی کو کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اور کسی پیشہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ چند دن اس کی تربیت حاصل کی جائے۔ پس امریکی شہری اپنی زندگی کے ابتدائی چند سال تو عام تعلیم کے لئے وقف کر سکتا ہے۔ لیکن پندرہ برس کی عمر میں اسے اپنے مخصوص پیشہ کی تربیت کا آغاز کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک امریکی شہری کی عام تعلیم عمر کی اس منزل میں ختم ہو جاتی ہے جہاں عام طور پر یورپ میں شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ تعلیم و تربیت حاصل کی جاتی ہے اس سے کوئی خاص اور منافع بخش مقصد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ سائنس کا مطالعہ اگر کیا جاتا ہے تو کاروباری نقطۂ نظر سے اور اس میں بھی سائنس کے اسی شعبہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس کی فوری عملی ضرورت ہو۔

امریکہ کے اکثر دولت مند پہلے غریب اور قلاش رہ چکے ہیں اکثر لوگ جو اب

تموّل اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں جوانی میں محنت شاقہ سے کاروبار میں منہمک تھے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ جب تحصیل علم کا زمانہ اور ذوق ہو سکتا ہے اس زمانے میں ان کے پاس وقت نہیں ہوتا اور جب وقت ہوتا ہے تو مطالعہ اور علم کی خواہش باقی نہیں رہتی۔ امریکہ میں کوئی ایسا طبقہ نہیں ہے جس میں علم و دانش کا ذوق، مال و متاع کے ساتھ ورثہ میں دوسری نسل کو منتقل ہوا ہو۔ اور جن کی بنا پر ذہنی کاوشوں کو عزّت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جا سکے۔ علم کا ایک درمیانی معیار مقرر کیا گیا ہے۔ اور سب کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس معیار کے جس قدر ممکن ہو سکے قریب پہنچیں۔ بعض اس معیار سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور بعض اس کے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ لاکھوں اشخاص ایسے ملیں گے جن کے مذہب، تاریخ، سائنس، سیاست، معاشیات، قانون سازی اور حکومت کے بارے میں ایک ہی قسم کے خیالات ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ ذہانت ایک عطیہ خداوندی ہے اور انسان اس کی غیر مساویانہ تقسیم کو روکنے پر قادر نہیں۔ اگرچہ انسانوں کی صلاحیتوں میں یکسانیت نہیں ہوتی جیسا کہ خالقِ ازل کا منشاء ہے۔ لیکن امریکہ کے ان مخصوص حالات کے نتیجہ میں امریکیوں نے ان صلاحیتوں کے استعمال کے جو ذرائع اختیار کئے ہیں وہ یکساں نوعیت کے ہیں۔

امریکہ میں اہل ثروت ابتداء ہی سے اس قدر کمزور رہا ہے کہ عہد حاضر میں اگر وہ بالکلیہ تباہ نہیں ہو گیا ہے تو اس قدر مفلوج و معذور ہے کہ وہ حالات کی رفتار پر مطلقاً اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس، وقت کی رفتار، واقعات اور قانون سازی نے جمہوری اصولوں کو اس قدر مستحکم کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف امریکی زندگی پر غالب ہیں بلکہ مطلق طور پر طاقت ور ہیں۔ امریکہ میں کوئی خاندان یا گروہ حاکم نہیں ہے یہاں تک کسی انفرادی کردار کا اثر بھی

پائیدار نہیں ہوتا۔ اس طرح امریکہ کی سماجی حالت غیر معمولی نوعیت کی حامل ہے وہاں لوگوں میں بہ اعتبار تموّل اور استعداد ذہنی غیر معمولی مساوات موجود ہے۔ دوسرے لفظوں میں امریکہ کے لوگ بہ اعتبار طاقت اور قوّت بھی مساوی ہیں اور اس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں یا معلومہ تاریخ کے کسی دور میں بھی نہیں مل سکتی۔

سماجی جمہوریت کے سیاسی اثرات

اس نوعیت کی سماجی صورت حال کے سیاسی اثرات بآسانی اخذ کیئے جا سکتے ہیں۔ یہ ناممکن تھا کہ زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست کے میدان میں مساوات نہ پہنچے۔ یہ تصوّر کرنا کہ ایک معاملہ میں تو انسان عدم مساوات کو قبول کریں، دوسری تمام باتوں میں برابر ہیں۔ تقریباً امر ناممکن ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں بالآخر سب کا ایک ہی سطح پر آنا ضروری تھا۔

سیاسی میدان میں مساوات قائم کرنے کے صرف دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ یا تو ہر شخص کو اس کے حقوق دیئے جائیں یا کسی شخص کو بھی کوئی حق نہ دیا جائے۔ ایسی قوموں کے لئے جو انیگلو امریکن قوم کی سماجی ترقی کی منزل پر پہنچ چکی ہوں، عوام کے اقتدار اعلےٰ اور ایک شخص کی مطلق العنانی کے درمیان کوئی واسطہ دریافت کرنا بے حد مشکل کام ہے۔ اور اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ امریکہ کے سماجی حالات سے وہی نتائج پیدا ہو سکتے تھے جن کا میں نے ذکر کیا۔ مساوات کے جذبات فطری ہیں، جو انسانوں کے دل میں یہ خواہش پیدا کرتے ہیں کہ وہ طاقتور ہوں اور ان کا احترام کیا جائے۔ یہ جذبہ معمولی آدمی کو بڑا بننے کی کوشش کرنے پر ابھارتا ہے لیکن انسانوں میں اُلٹی قسم کی مساوات کی خواہش بھی ہوتی ہے۔ جو کمزوروں کو اکساتی ہے کہ وہ اپنے سے طاقتوروں کو گرا کر اپنی ہی

سطح پر لے آئے۔ اور انسانی فکر کو اس قدر پست کر دیتی ہے کہ وہ غلامی میں مساوات کو آزادی میں عدم مساوات پر ترجیح دیتا ہے۔ یہ بات نہیں کہ وہ قومیں جن کے سماجی حالات جمہوری ہیں فطری طور پر آزادی سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ان کو جبلی طور پر آزادی سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن خواہشوں کا اعلیٰ اور اولین مطمح نظر آزادی نہیں ہوتا۔ مساوات ان کا معبود ہے وہ آزادی کے حصول کے لیئے فوری اور تیزی سے کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر حصولِ مقصد میں ناکام رہے تو وہ اپنی نامیدی پر قناعت بھی کر لیتے ہیں لیکن مساوات کے بغیر انہیں کوئی چیز مطمئن نہیں کر سکتی۔ اور وہ مساوات سے محروم ہونے کی بجائے تباہ ہونا پسند کریں گے۔

اس کے برعکس ایسے ملک کے شہریوں کے لیئے جو مساوات کے حامل ہوں طاقتور عناصر کے جارحانہ حملوں کے خلاف اپنی آزادی کی حفاظت کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ چونکہ کوئی شخص انفرادی طور پر اس قدر طاقتور نہیں ہوتا کہ وہ اکیلے جدوجہد کر سکے۔ اس لیئے ایسی صورت میں ان کی آزادی کی حفاظت کے لئے اشتراک ضروری ہوتا ہے۔ لیکن لبا اوقات اس قسم کا اشتراک ممکن نہیں رہتا۔ اس قسم کے سماجی حالات کسی ملک میں ہوں تو ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک وقوع پذیر ہو سکتی ہے۔ انیگلو امریکی پہلی قوم ہے جو اس مہیب صورتِ حال سے دوچار ہونے کے باوجود خوش قسمتی سے مطلق العنانی سے بچ نکلی۔ ان کے مخصوص حالات ان کی ہیئت ترکیبی، ان کی ذہنی استعداد اور خاص طور پر ان کے اخلاقی اصولوں نے عوام کا اقتدار اعلیٰ قائم کرنے اور برقرار رکھنے میں مدد دی۔

۳- امریکہ میں عوام کا اقتدار اعلیٰ

امریکہ کے سیاسی قوانین کا جس وقت بھی مطالعہ کیا جائے تو ہمیں سب سے پہلے عوام کے اقتدار اعلیٰ کے نظریہ سے آغاز کرنا ہوگا۔

عوامی اقتدار اعلیٰ کے اصول، جو کسی نہ کسی شکل میں تمام انسانی اداروں کی تہ میں کارفرما ہوتے ہیں۔ عام طور پر نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اس کو تسلیم کیے بغیر بھی اطاعت کی جاتی ہے اور اگر کسی لمحے کے لئے اسے منظر عام پر لایا بھی گیا تو اسے فوراً پس منظر میں دھکیل دیا جاتا ہے۔

"عوام کی مرضی" وہ اصطلاح ہے جسے ہر دور میں اور ہر ملک کے عیار سیاستدانوں اور مستبد حکمرانوں نے ہمیشہ اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا ہے۔

امریکہ میں عوامی اقتدار اعلیٰ کا اصول، بعض دوسرے ملکوں کی طرح بے معنی اور پراسرار نہیں ہے۔ روایات اور رسوم نے اس پر مہر توثیق ثبت کی ہے اور قانون نے اس کا اعلان کیا ہے۔ یہ آزادی سے پھیلتا ہے۔ اور کسی رکاوٹ کے بغیر اپنے انتہائی حدود تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی ایسا ملک ہے جہاں عوام کی خود مختاری کے اصول کو اچھی طرح سمجھا جاتا ہے۔ جہاں سماج کے امور پر اس اصول کے اطلاق کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اور جہاں اس کے خطرات، نقصانات اور فوائد کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تو یقیناً یہ ملک امریکہ ہی ہے۔

اس بات کی وضاحت کی جاچکی ہے کہ ابتدا ہی سے امریکہ کی برطانوی نوآبادیوں میں عوام کی خودمختاری بنیادی اصول کے طور پر کارفرما رہی ہے

البتہ معاشرہِ کی حکومت پر یہ اصول اب جس قدر اثر انداز ہے، اُس وقت نہ تھا۔ اس کی ترقی کی راہ میں دو رکاوٹیں تھیں، ایک خارجی اور دوسری داخلی۔

اس اصول کا اظہار واضح طور پر نوآبادیوں کے قوانین میں نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ نوآبادیات اس وقت تک انگلستان کی اطاعت پر مجبور تھیں۔ لیکن عوامی خود مختاری کے یہ اصول خفیہ طور پر صوبائی اسمبلیوں اور خاص طور پہ بلدی مجالس میں مروّج تھے۔

اس وقت تک کا امریکی معاشرہ ان اصولوں کو ان کے پورے اثرات و نتائج کے ساتھ اپنانے کو تیار نہ تھا۔ نیو انگلینڈ میں اربابِ علم و دانش اور جنوب میں دولت مند طویل عرصہ تک حالات پر اثر انداز ہوتے رہے جس کی وجہ سے سماجی طاقت چند ہاتھوں میں مرتکز رہی ۔ تمام سرکاری عہدیدار عام انتخاب کے ذریعہ مقرر نہیں کئے جاتے تھے۔ اور نہ ہی تمام شہریوں کو رائے دینے کا حق تھا۔ حق رائے دہندگی پر کچھ پابندیاں تھیں اور خاص شرائط لگائی گئی تھیں۔ شمال میں یہ شرطیں کم تھیں اور جنوب میں زیادہ۔ پھر امریکی انقلاب برپا ہو گیا۔ اور عوامی خود مختاری بلدیاتی ایوانوں سے باہر نکل آئی۔ اور ایوانِ مملکت پر قبضہ کر لیا۔ انقلاب میں امریکہ کے ہر طبقہ نے عوامی خود مختاری کی جدوجہد حصّہ لیا۔ اِسی کے لئے جنگیں لڑی گئیں۔ اور فتوحات حاصل کی گئیں۔ اور یہ نظریہ قوانین کا اصل اصول بن گیا۔

اندرونی طور پر معاشرہ میں اسی تیزی سے ایک تغیّر برپا ہوا جہاں قانونِ وراثت نے مقامی اثرات کا خاتمہ کر دیا۔

انقلاب اور قانون کے اثرات جوں ہی نمایاں ہو گئے جمہوریت کے مقصد کی فتح کا ناقابل تنسیخ اعلان کر دیا گیا۔ تمام اختیارات عوامی اقتدار اعلےٰ کے ہاتھ میں تھے اور اس کی مزاحمت ناممکن تھی۔ اعلےٰ طبقوں نے اس کے آگے بلا چون وچرا سرِ اطاعت

ختم کرلیا اور کسی کشمکش کے بغیر اس ناگزیر برائی کو قبول کرلیا۔ اقتدار سے محرومی ان کا مقدر بن چکی تھی۔ اس طبقہ کے ہر رکن نے صرف اپنے مفاد کی دیکھ بھال کی، ان کیلئے یہ ناممکن تھا کہ وہ عوام سے اقتدار چھین لیں۔ انہوں نے عوام سے اس قدر نفرت بھی نہیں کی تھی کہ اپنی حفاظت کیلئے انکے مقابلہ میں ڈٹ جانا ضروری ہوتا۔ ان کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہر قیمت پر عوام کی خیرسگالی حاصل کی جائے۔ چنانچہ انتہائی جمہوری قوانین کے حق میں ایسے لوگوں نے بھی رائے دی جن سے خود ان کے مفادات پر ضرب پڑتی اگرچہ انہوں نے عوامی جذبات کو اپنے خلاف نہیں بھڑکایا تھا لیکن اعلیٰ طبقات نے عوامی خودمختاری کی کامیابی کے عمل کو تیز تر کردیا۔ اور صرف اسی تبدیلی کی وجہ سے ان ریاستوں میں جو ارباب ثروت کی مضبوط گرفت میں تھے۔ جمہوریت ہی جمہوریت کا دور دورہ ہوگیا۔ میری لینڈ جس کو ذی مرتبت لوگوں نے قائم کیا تھا۔ پہلی ریاست تھی جس نے عام حق رائے دہی کو رائج کیا۔ اور انتہائی جمہوری طرز حکومت کو ترویج دیا۔

جب کوئی قوم رائے دہی کے حق سے متعلق شرائط میں ترمیم وتبدیلی کرتی ہے تو یقین کرلینا چاہیئے کہ جلد یا بدیر ہر قسم کی شرائط ختم کردی جائیں گی۔ معاشرہ میں اس سے زیادہ اور کوئی اٹل قانون نہیں ہے کہ رائے دہندگی کے حق میں جس قدر بھی توسیع کی جاتی اس میں اس سے زیادہ توسیع کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہر نئی رعایت کے بعد جمہوریت کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے اور طاقت میں اضافہ کے ساتھ اس کے مطالبات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو حق رائے دہندگی حاصل نہیں رہتا ان کے دلوں میں اسی نسبت سے خلش اور بے چینی بڑھتی ہے۔

استثنائی صورتیں قاعدہ کلیہ بن جاتی ہیں، مراعات پر مراعات دینے کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ اور عام حق رائے دہندگی کی منزل تک پہنچنے سے پہلے یہ ترقی نہیں رک سکتی۔

آج کے امریکہ میں عوامی خود مختاری کے جلو میں وہ تمام عملی ترقیاں آتی ہیں جو ذہن انسانی میں آ سکتی ہیں۔ اس کی ترقی کی راہ میں کوئی ایسی رکاوٹ نہیں آئی جس کی مثال دوسرے ملکوں میں ملتی ہے۔ اور یہ ممکن شکل میں جلوہ گر ہے۔ بعض اوقات عوام ہی بالراست قوانین بناتے ہیں اور بعض اوقات ان کے نمائندے جو بالغ حق رائے دہی کی اساس پر منتخب کئے جاتے ہیں۔ عوامی خود مختاری کے نام پر اور اس کی راست نگرانی میں کاروبار چلاتے ہیں۔

بعض ملکوں میں ایک مخصوص طاقت ہوتی ہے جو اگرچہ اس سماج کیلئے ایک طرح اجنبی ہوتی ہے لیکن عوامی خود مختاری پر حکم چلاتی ہے۔ اور اسے ایک خاص راہ پر چلنے پر مجبور کرتی ہے۔ دوسرے ملکوں میں حکمران طاقت منقسم ہوتی ہے۔ جزوی طور پر یہ عوام کے اندر اور جزواً عوام کے باہر لیکن ان میں سے کوئی صورت امریکہ میں نظر نہیں آتی۔ یہاں معاشرہ اپنے ہی لئے اپنے آپ پر حکومت کرتا ہے تمام اختیارات خود اس کے اندر پنہاں ہوتے ہیں۔ اور شاید ہی کوئی ایسا شخص ملے جو یہ سوچنے کی بھی جرائت کرے یا اس تصور کا بھی اظہار کرے کہ ان اختیارات کا منبع کسی اور جگہ بھی ہو سکتا ہے۔ ساری قوم اپنے نمائندوں کے انتخاب کے ذریعہ قانون سازی میں شرکت کرتی اور ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حکومت کے کارندوں کا انتخاب کرتی ہے۔ یہ بات تقریباً قطعیت کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ قوم خود اپنے آپ پر حکومت کرتی ہے۔ حکومت یا انتظامیہ کے فرائض بیحد محدود ہیں، اور حکام اس بات کو بھول ہی نہیں سکتے کہ ان کے اختیارات کا سرچشمہ کہاں ہے۔ امریکہ کی سیاسی دنیا میں عوام کی اسی طرح حکومت ہے۔ جس طرح خداوند مطلق کی کائنات پر حکمرانی۔

عوام ہی علت ہیں اور عوام ہی معلول۔ ہر چیز کا منبع وہ ہیں اور ہر چیز ان میں سموئی جاتی ہے۔

۴۔ حکومتِ مقامی

امریکی قوم کے سارے سیاسی نظام میں عوامی خود مختاری کا اصول کام کرتا ہے۔ اس کتاب کے ہر صفحہ پر اس نظریہ کے نئے نئے اطلاق کا ذکر ملے گا۔ ایسے ملکوں میں جہاں عوامی خود مختاری کے اصول کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اقتدار میں ہر فرد کا مساویانہ حصّہ ہوتا ہے۔ اور وہ مساویانہ طور پر امورِ مملکت میں حصّہ لیتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ حکومت کی اطاعت کیوں کرتا ہے۔ اور اس اطاعت کی حدود کیا ہیں؟ ہر فرد کے بارے میں یہ مفروضہ ہے کہ وہ دوسرے شہریوں ہی کی مانند، باخبر، نیک، راستباز اور طاقتور رہے، وہ حکومت کی اطاعت اس لئے نہیں کرتا ہے کہ وہ ان لوگوں سے پست تر ہے جو کاروبارِ حکومت چلاتے ہیں یا یہ کہ وہ اپنے آپ حکومت کرنے کے لئے اور ان کے بہ نسبت کم تر قابلیت کا حامل ہے، اس کے برعکس وہ اسلئے اطاعت کرتا ہے کہ وہ اپنے ہم جلیس شہریوں سے اشتراکِ عمل کی افادیت کو تسلیم کرتا ہے اور وہ اس بات کو جانتا ہے کہ اشتراک وجود میں نہیں آسکتا جب تک کہ ایک تنظیمی قوّت نہ ہو۔ شہریوں کے ایک دوسرے سے متعلق فرائض اور ذمہ داریوں کا جہاں تک تعلق ہے وہ اپنے آپ کو پابند کرتا ہے۔ اور جہاں تک اس کی اپنی ذات سے متعلق باتوں کا تعلق ہے وہ آزاد ہے اور صرف خدا کے آگے جواب دہ ہے مقولہ ہے کہ ہر شخص اپنے بُرے بھلے کی تمیز کر سکتا ہے۔ اور معاشرہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی کے فعل و عمل پر پابندی عائد کرے۔ سوائے اس صورت کے کہ اس سے عام مفاد کو نقصان پہنچتا ہو۔ یا بہبودیِ عامہ اس کی مقتضی ہو۔ امریکہ میں

اس نظریہ کو قبول عام حاصل ہے۔

بحیثیت مجموعی بلدیہ مرکزی حکومت سے اپنے تعلق کے لحاظ سے ایک فرد ہی کے مانند ہے اور بلدیوں پر بھی فرد ہی کے مانند اس نظریہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ امریکہ میں عوامی حاکمیت کے نظریہ کا لازمی نتیجہ بلدی خودمختاری ہے امریکہ کی تمام ریاستوں میں بلدی خودمختاری کسی نہ کسی طرح رائج ہے لیکن نیوانگلینڈ کے حالات اس کے نشوونما کے لئے خاص طور پر سازگار تھے۔

امریکی یونین کے اس حصہ میں سیاسی زندگی کی ابتدا ہی بلدی مجالس سے ہوتی اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر بلدیہ ابتدائً ایک خودمختار قوم ہی کی مانند تھا۔ بعدازاں جب انگلستان کے فرماں رواؤں نے ان پر اپنی برتری مسلط کی تو انہوں نے صرف مرکزی اختیارات پر قناعت کر لی۔ بلدیوں کو نہیں چھیڑا۔ اگرچہ وہ مرکزی اقتدار کے تابع ہو گئے تھے۔ لیکن ابتداء میں ان کی یہ حیثیت نہ تھی انہوں نے مرکز سے اپنے اختیارات حاصل نہیں کئے تھے۔ اس کے برعکس انہوں نے اپنی خودمختاری کا ایک جزو مرکز کے سپرد کیا تھا۔ یہ ایک بین فرق ہے جسے پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بلدیات صرف ان ہی امور میں مرکز کے تابع تھے جنہیں سماجی امور کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اور جو تمام بلدیوں میں مشترک تھے۔ نیوانگلینڈ میں کوئی شخص اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ مرکز کو بلدیات کے امور میں مداخلت کا حق بھی ہے۔ نیو انگلینڈ کے بلدیات خرید و فروخت کرتے، مقدمہ چلاتے، اپنی شرحوں میں اضافہ یا کمی کرتے تھے۔ اور کوئی حاکم ان حقوق کی مخالفت کرنیکا خیال تک دل میں نہ لا سکتا تھا

مگر ان بلدیات کیلئے بعض سماجی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا بھی ضروری تھا۔ اگر ریاست کو روپیہ کی ضرورت ہوتی تو بلدیہ روپیہ فراہم کرنے سے انکار نہیں کر سکتی تھیں۔ اگر ریاست سڑک تعمیر کرنا چاہتی تو بلدی حکومت کو اس بات کا اختیار نہیں تھا

کہ اپنے علاقہ میں اس سڑک کی تعمیر کی اجازت دے۔ اسی طرح شہروں پر لازمی تھا کہ وہ ریاست کے بنائے ہوئے پولیس کے قانون اپنے ہاں نافذ کر دیں۔ اور ریاست کی خواہش کے مطابق سرکاری سکولوں میں یکساں طرزِ تعلیم رائج کریں۔ اس طرح بعض امور میں ریاست اور بلدیات کے درمیان ذمہ داریاں منقسم تھیں۔ محاصل ریاست تجویز کرتی لیکن ان کا نفاذ اور وصولی بلدیہ کا کام تھا۔

امریکہ میں بلدیات نہ صرف قائم تھے بلکہ شہریوں کی ان سے وابستگی زندہ رکھنے کیلئے ریاست ہر طرح مدد دیتی تھی۔ نیوانگلینڈ کے بلدیات کو دو زبردست فائدے حاصل تھے۔ وہ یہ کہ انہیں خودمختاری اور حکومت حاصل تھی۔ اگرچہ ان کا دائرہ کار محدود تھا لیکن اسی دائرہ کار کے اندر انہیں عمل کی آزادی غیر محدود تھی۔ اور اس آزادی نے انہیں حقیقی طور پر اہمیت عطا کر رکھی تھی۔

یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ لوگ قوت اور اختیار کو عزیز رکھتے ہیں۔ مفتوح ملک میں جذبات حب وطن پائیدار نہیں ہوتے۔ نیوانگلینڈ کے باشندوں کی اپنے شہروں سے وابستگی اس لئے نہیں تھی کہ وہ وہاں پیدا ہوئے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ آزاد اور طاقت ور بستیاں تھیں۔ علاوہ ازیں ایک اور اہم بات یہ تھی کہ نیوانگلینڈ کے بلدیوں کی تشکیل کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ ان سے عوام گرمجوشی سے محبت کرتے تھے۔ اضلاع کے حکام منتخبہ نہیں ہوتے۔ اور ان کے اختیارات محدود ہوتے ہیں۔ اور ریاست کی حیثیت ایک دوسرے درجہ کی بستی کے مانند تھی، جس کی غیر معروف اور پرسکون کارگذاریوں میں اس قدر کشش نہیں ہوتی کہ عوام اس کے جھنجھٹوں میں گرفتار ہونا پسند کریں۔ وفاقی حکومت میں چند لوگوں کو اختیارات اور اعزازات حاصل ہوتے ہیں، لیکن ایسے افراد کی تعداد زیادہ نہیں ہو سکتی۔ صدارت کا مرتبہ معدودے چند لوگوں

کو زندگی کے آخری زمانے میں حاصل ہوتا ہے اور وفاقی حکومت کے دیگر عہدوں پر صرف وہی لوگ منتخب ہو سکتے ہیں جن کی قسمت نے یاوری کی ہو۔ یا کسی خاص میدان میں نام پیدا کیا ہو۔ اس لئے ان عہدوں کے حصول کو کوئی شخص اپنا مستقل مقصد حیات نہیں بنا سکتا۔ اس کے برعکس بلدیات، جو عام زندگی کی سرگرمیوں کا مرکز ہوتے ہیں، ایک ایسے میدان کا کام دیتے ہیں جو عوام کی عزت و احترام کو حاصل کرنے، اختیارات اور مقبولیت کے حصول کے ذوق کی تسکین کرنے اور ایسے جذبات کا اظہار کرنے کا موقع مہیا کرتے ہیں جو معاشرہ میں ہیجان پیدا کر کے بالآخر کردار میں تبدیلی لاتے ہیں۔

امریکی بلدیات میں اختیارات کو ایسی خوبی کے ساتھ تقسیم کر دیا گیا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ بہبودی عامہ کے مسائل میں دلچسپی لے سکیں۔ رائے دہندوں کے قطع نظر جنہیں وقتاً فوقتاً اپنی پسند یا ناپسند کے اظہار کا موقع دیا جاتا ہے، اختیارات متعدد عہدیداروں اور افراد میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں جو اپنے اپنے دائرہ کار میں ایک طاقت ور معاشرہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس طرح مقامی حکومت متعدد لوگوں کو حصول منفعت اور عوامی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے کا موقع مہیا کرتی ہے

امریکی نظام جو مقامی عہدوں کو مختلف لوگوں میں تقسیم کرتا ہے، ایک ہی قسم کے اختیارات کو متعدد شہری حکام کو عطا کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ اس لئے کہ امریکہ میں یہ تصور کیا جاتا ہے، جو صداقت پر مبنی ہے کہ وطن پرستی ایک ایسی وابستگی ہے جو رسوم کی پابندی سے مستحکم تر ہوتی ہے۔ غرض اسطرح بلدی سرگرمیوں کا مسلسل اظہار ہوتا رہتا ہے۔ اس کا اظہار روزمرہ کے فرائض کے سرانجام دینے یا اختیارات کے استعمال میں ہوتا ہے۔ اور اس طرح معاشرہ میں مسلسل حرکت قائم رہتی ہے۔ امریکی شہری اپنی بستی سے بالکل اسی طرح وابستہ رہتا ہے جس طرح پہاڑوں پر چڑھنے کا شوقین پہاڑ سل سے دلبستگی محسوس کرتا ہے۔

نیوانگلینڈ میں بلدیات کا وجود ایک خوشگوار حقیقت ہے۔ ان کی حکومتیں، نیوانگلینڈ کے باشندوں کے مذاق کے عین مطابق ہیں۔ اور یہ خود انہوں نے منتخب کی ہیں۔ امریکہ میں پُرامن اور آسائشوں سے معمور زندگی کی وجہ سے بلدیاتی زندگی میں بھی ہیجان اور انتشار کم ہے۔ مقامی حکومت کا کاروبار انتہائی آسان ہے لوگوں کی سیاسی تعلیم و تربیت مکمل ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ سیاسی شعور سے اس وقت بھی بہرہ ور تھے جب انہوں نے نیوانگلینڈ کے ساحلوں پر قدم رکھا تھا۔ نیوانگلینڈ میں کوئی سماجی یا سیاسی درجہ بندی کی روایات ہی نہیں ہیں۔ اور معاشرہ کا کوئی حصّہ دوسرے لوگوں کا استحصال نہیں کرنا چاہتا۔ اگر حکومت میں کوئی خامیاں ہیں بھی تو وہ عام توجہ میں نہیں آتیں۔ کیونکہ حکومت کے اختیارات کا سرچشمہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن پر حکومت حکمراں ہوتی ہے۔ ایک اور بات ہے کہ موازنہ اور مقابلہ کے لئے ان کے سامنے کسی اور حکومت کی مثال بھی نہیں ہوتی۔ انگلستان نے اکثر نوآبادیوں پر حکومت کی۔ لیکن عوام بلدیات میں ہمیشہ خودمختار رہے۔

نیوانگلینڈ کے باشندے اپنے شہروں سے اسلئے بھی وابستہ ہیں کہ وہ آزاد اور خودمختار ہیں۔ بلدی معاملات میں ان کا تعاون ان کے مفادات سے دلچسپی پیدا کرتا ہے۔ چونکہ بلدیات شہریوں کی بھلائی کیلئے کام کرتے ہیں اسلئے انکے دل میں بلدیہ سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے اور بلدیہ کی بھلائی اور ترقی اس کا مقصد اور آئندہ سرگرمیوں کا مرکز بن جاتی ہے۔ وہ اپنی جائے سکونت کے ہر واقعہ میں حصّہ لیتا ہے وہ اپنے چھوٹے دائرہ کار میں حکومت کرنے کے فن میں مہارت حاصل کرتا ہے وہ ان باتوں کا اپنے آپکو عادی بناتا ہے جنکے بغیر خودمختاری محض انقلابات کے ذریعہ ترقی کر سکتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بلدیات کی روح سے ہم آہنگ کر لیتا ہے اسمیں امن اور نظم کا ذوق پیدا ہوتا ہے، توازن اختیارات کے معنی و مفہوم سمجھتا ہے اور اپنے فرائض اور حقوق کے بارے میں صحیح صحیح اندازے قایم کرتا ہے۔

۵- امریکہ میں عدم مرکزیت
اور
اُس کے اثرات

امریکہ میں کسی سیاح کو سب سے زیادہ جو چیز حیرت میں ڈالتی ہے وہ حکومت یا انتظامیہ کی عدم موجودگی ہے۔ تحریری قانون موجود ہیں اور روزمرہ زندگی میں ان پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ہر شے باقاعدگی سے حرکت کرتی دکھائی دیتی ہے لیکن محرک کہیں نظر نہیں آتا۔ سماجی معاشرہ کی مشین کو جو ہاتھ حرکت میں لاتے ہیں، وہ نظروں سے غائب ہی رہتے ہیں۔ لیکن جس طرح انسانوں کو اپنے خیالات کے اظہار کے لئے قواعد زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے اسی طرح تمام معاشروں کو اپنے وجود کی حفاظت کے لئے کسی اقتدار کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے جس کے بغیر وہ نراج کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ اقتدار خواہ کسی بھی انداز میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن اس کا کہیں نہ کہیں موجود رہنا ضروری ہے۔

کسی ملک میں اقتدار کی قوت کو کم کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ معاشرہ کو چند خاص شرائط کے تحت حفاظت خود اختیاری کے لئے عمل کرنے پر پابندی یا امتناع عائد کر کے برتر طاقت کو اصولی طور پر کمزور کر دیا جائے۔ اقتدار کو کمزور کرنے کا یہ طریقہ یورپی ہے۔

اقتدار کی قوت کو کمزور کرنے کے دوسرے طریقہ کے تحت معاشرہ کو اس کے بعض حقوق سے محروم نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اس کے محافظوں کو مفلوج کیا جاتا ہے۔ بلکہ اختیارات کے استعمال کو مختلف لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اور ہر ایک

کو اس قدر اختیارات عطا کئے جاتے ہیں جو اس کے فرائض کی تکمیل کے لئے ضروری ہوں۔ ممکن ہے بعض ملکوں میں سماجی اختیارات کی تقسیم کا یہ طریقہ کا انراج کی طرف لیجائے۔ لیکن یہ بذات خود نراجی طریقہ نہیں ہے! بے شک اختیارات کی اس طرح تقسیم سے اقتدار کم قابل مزاحمت اور کم خطرناک ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ تباہ نہیں ہوتا۔

امریکہ کے باشندوں نے کامل غوروفکر کے بعد آزادی کو ترجیح دی تھی اور اس کا نتیجہ امریکہ کا انقلاب تھا۔ یہ خودمختاری کی مبہم اور ناقابل تشریح خواہش کی پیداوار تھا۔ انقلاب نے نراج کے ہنگامہ خیز جذبات سے کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس لوگوں کی قانون پسندی اور امن و نظم سے وابستگی نے انقلاب کی راہ کو معین کیا تھا۔

امریکہ میں کبھی بھی یہ فرض نہیں کیا گیا کہ آزاد ملک کا شہری جو چاہے کر سکتا ہے۔ اس کے برخلاف امریکی شہری پر جتنی سماجی ذمہ داریاں اور فرائض عائد کئے گئے ہیں اس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔ کبھی بھی معاشرہ کے اصولوں اور حقوق کی خلاف ورزی کرنے کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں لایا گیا۔ لیکن اس کے اختیارات کے استعمال کو تقسیم کر دیا گیا۔ تاکہ عہدہ تو طاقتور رہے لیکن عہدے دار کو اہمیت حاصل نہ ہو۔ اور معاشرہ بہ یک وقت منظم بھی ہو اور آزاد بھی۔ دنیا کے کسی اور ملک میں امریکہ کی طرح قانون کی مطلق حکمرانی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ایسا ملک ہے جہاں امریکہ کی طرح اختیارات کی اس قدر وسیع تقسیم ہے۔ امریکی آئین کے تحت انتظامی اختیارات میں نہ مرکزیت ہے اور نہ درجہ بندی۔ اور اسی لئے ان اختیارات کی ایک شخص سے دوسرے شخص کو منتقلی کسی کو محسوس تک نہیں ہوتی۔ طاقت موجود ہے لیکن اس کا نمائندہ کہیں نظر نہیں آتا۔

یہ تصوّر درست نہیں ہے کہ امریکہ کے لوگ لفظ مرکزیت ہی سے آشنا نہیں ۔ لفظ مرکزیت روزمرّہ زندگی میں مستعمل ہے لیکن اس کے ساتھ کوئی خاص مفہوم وابستہ نہیں ہے۔ بہر حال یہ کہ یہاں مرکزیت کی دو واضح قسمیں ہیں جن میں واضح امتیاز کرنا ضروری ہے۔

بعض امور میں سارے ملک کے مفادات مشترک ہیں، مثلاً عام قوانین کی توضیع اور تعلقات خارجہ کا اہتمام۔ بعض امور کا تعلق ملک کے صرف بعض حصّوں سے ہوتا ہے مثلاً مختلف ریاستوں یا آبادیوں میں تجارت۔ ایسے اختیارات جن کا تعلق مشترک امور یعنی اوّل الذکر سے ہو کسی ایک جگہ یا فرد یا گروہ میں مرتکز کر دیئے جائیں تو وہ مرکزی حکومت کہلائے گی۔ اور اگر اسی طرح مقامی دلچسپی کے امور یعنی ثانی الذکر، کسی ایک جگہ اکٹھا کر دیئے جائیں تو اسے اصطلاحاً "مرکزی انتظام" کہیں گے۔

دونوں قسم کی یہ مرکزیتیں بعض نقطوں پر متحد بھی ہو جاتی ہیں، لیکن دونوں کے مختلف دائرہ ہائے کار کی درجہ بندی کے ذریعہ ان میں آسانی سے امتیاز کیا جا سکتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر مرکزی انتظام کو مرکزی حکومت کے ساتھ ملا دیا جائے تو حکومت کو بے پناہ اختیارات حاصل ہو جائیں گے۔ اور اس قسم کی صورتِ حال انسانوں کو اس بات کا عادی بنا دیتی ہے کہ وہ اپنی مرضی اور منشا کو فراموش کر دیں اور انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ نہ صرف ایک نقطہ پر بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں اور ہر وقت اطاعت قبول کر لے۔ مرکزیتوں کا اس نوع کا اتحاد نہ صرف لوگوں کو جبری اطاعت کرواتا ہے بلکہ روزمرہ کے عام عادات پر اثر انداز ہوتا ہے۔ لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتا ہے اور بعد ازاں ہر ایک پر انفرادی طور پر اثر ڈالتا ہے۔

یہ دونوں قسم کی مرکزیتیں ایک دوسرے سے تعاون کرتی ہیں۔ اور ہمیشہ ان کا رجحان اشتراک ہی کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن یہ فرض نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ ایک دوسری سے علٰحدہ نہیں ہو سکتیں۔ مثال کے طور پر لوئی چہاردہم کے زمانے میں فرانس کی حکومت میں مکمل طور

پر مرکزیت تھی لیکن انتظامیہ میں مرکزیت نہیں تھی۔ اسی طرح انگلستان میں حکومت کی مرکزیت کو ہمیشہ کمال تک پہنچایا گیا لیکن انتظامِ مملکت کو کبھی بھی مرکزی نہیں بنایا گیا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی قوم ایک طاقتور مرکزی حکومت کے بغیر زندہ اور خوشحال نہیں رہ سکتی لیکن انتظام میں مرکزیت، قوم کے فعالی جذبات کو کم سے کم تر کر کے بالآخر مضمحل کر دیتی ہے۔ اگرچہ خاص حالات کے تحت انتظامی مرکزیت قوم کے تمام وسائل کو مجتمع کر دیتی ہے لیکن ان وسائل کے احیاء کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔

ہم اس بات پر روشنی ڈال چکے ہیں امریکہ میں انتظامی مرکزیت نہیں ہے۔ اور سرکاری عہدوں میں خاص نوعیت کی مراتب بندی نہیں ہے۔ مقامی حکومت کے تصور کو اس حد تک ترقی دے دی گئی ہے کہ اس کے بعض مضر نتائج بھی پیدا ہوئے ہیں۔ مگر امریکہ میں حکومت میں مکمل مرکزیت ہے۔ اور یہ امر آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ میں قومی اقتدار میں اس قدر مرکزیت ہے کہ یورپ کی قدیم اقوام بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتیں۔ نہ صرف یہ کہ ہر ریاست میں ایک مجلس قانون ساز ہے اور نہ صرف یہ کہ سیاسی حاکمیت کا ایک ہی سرچشمہ ہے بلکہ ضلعوں اور کاؤنٹیوں کی بے شمار اسمبلیوں کے اختیارات کو بالکلیہ انتظامی نوعیت دی گئی ہے تاکہ انہیں اپنے انتظامی فرائض کو چھوڑ کر حکومت کے امور میں مداخلت کرنے کی ترغیب ہی نہ ہونے پائے۔ امریکہ میں ریاست کی قانون ساز مجلس ایک اعلیٰ ادارہ ہے، کوئی امر مثلاً حقوق و مراعات مقامی مستثنیات اور شخصی اثر و رسوخ۔ اس کی حاکمیت میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتے اور نہ ہی عقل و دلیل اس پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مجلس قانون ساز اس اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے جو اپنے آپ کو عقل و دلیل کا واحد ترجمان ہونے کا ادعا کرتی ہے۔ اپنے دائرہ عمل پر صرف وہ خود ہی پابندی عائد کر سکتی ہے مجلس

قانون ساز کے پہلو بہ پہلو عاملانہ اختیارات کا نمائندہ ہوتا ہے جو اس کے راست اور فوری کنٹرول میں ہوتا ہے۔ اور اس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ انحراف کرنے والوں کو قوت کے ذریعہ اطاعت پر مجبور کرے۔ اگر کوئی نقص ہے تو وہ حکومت کے دائرہ عمل کی بعض تفصیلات میں ہے۔ امریکی ریاستوں کے پاس کوئی باقاعدہ فوج نہیں ہوتی کہ اقلیتوں کو مرعوب کیا جائے۔ چونکہ ایسی صورت حال پیدا ہی نہیں ہوئی کہ کسی اقلیت کو اعلان جنگ پر مجبور ہونا پڑے۔ اس لئے فوج کے قیام کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ ریاست عام طور پر بلدیہ یا ضلع کے حکام ہی کو شہریوں سے نپٹنے کے فرائض سونپتی ہے۔ مثال کے طور پر نیو انگلینڈ میں بلدیہ کے محاصل مشخص کرنے والا عہدیدار (اسیسر) مختلف ٹیکس متعین کرتا ہے۔ اور بلدیہ کا کلکٹر انہیں وصول کرتا ہے۔ بلدیہ کا خزانچی اس رقم کو سرکاری خزانے میں داخل کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں جو بھی تنازعات پیدا ہوتے ہیں وہ عام عدالتوں میں تصفیہ کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ محاصل جمع کرنے کا طریقہ انتہائی سست ہے۔ اور ایسی حکومت کے لئے جس کے اخراجات بہت زیادہ ہوں یہ طریقہ کار مستقل دردسر ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لئے حکومت یہ پسند کرے گی کہ ایسے تمام امور کے بارے میں جو اس کے وجود پر اثر انداز ہوتے ہیں اپنے ہی افسر مقرر کرے جو اس کی خواہش کے مطابق کام کریں اور جنہیں حسب مرضی علیحدہ کیا جا سکے۔ اور جو بہتر طریقہ ہائے کار کے عادی ہوں۔ لیکن امریکہ میں حکومت جس طرح تشکیل دی گئی ہے، مرکزی حکومت کے لئے یہ بات بے حد آسان ہے کہ اپنی خواہش اور ضروریات کے مطابق موثر طریقہ ہائے کار رائج کرے۔

عدم مرکزیت کا حامل انتظامی نظام امریکہ میں مختلف اثرات و نتائج پیدا کرتا ہے۔ میری رائے میں اس سلسلے میں امریکہ نے کچھ غلوہی سے کام لیا ہے اور حکومت کے انتظام کو علیحدہ کرنے میں دانشمندانہ حدود سے تجاوز ہی کر گئے ہیں۔ کیونکہ

وہاں ثانوی اہمیت کے امور میں بھی نظم ونسق کو قومی اہمیت دے دی گئی ہے۔ ریاست کے اپنے انتظامی عہدیدار نہیں ہوتے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکومت شاید ہی کبھی پولیس کے قوانین جاری کرتی ہے۔ اس قسم کے قوانین کی کمی کو بیرونی سیاح خاص طور پر محسوس کرتے ہیں۔ اور بظاہر انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ نراج کا شکار ہے۔ لیکن انہیں اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب وہ صورتِ حال کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔

بعض فرائض ایسے ہوا کرتے ہیں جو بحیثیت مجموعی پوری ریاست کے لئے اہم ہوتے ہیں لیکن ان کی تکمیل اسلئے نہیں ہو سکتی کہ اس کے لئے ریاست کے پاس کوئی آلہ کار نہیں ہے۔ انہیں بلدیات اور ضلعی مجالس کے سپرد کر دینا پڑتا ہے جس پر منتخبہ اور عارضی کارندے حکمران ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس طریقہ عمل سے مفید مطلب اور پائیدار نتیجہ برتب نہیں ہوتا۔

یورپ میں مرکزیت کے حامی اس بات کا ادعا کرتے ہیں کہ حکومت ہر علاقہ کے معاملات کو وہاں کے باشندوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر حل کر سکتی ہے۔ ممکن ہے یہ بات ان ملکوں میں درست ہو جہاں مرکزی طاقت زیادہ ہوشمند ہو اور مقامی حکام جاہل ہوں، جہاں مرکزی حکومت چوکس اور تیز گام ہو اور مقامی حکام سست رو ہوں اور جہاں حکومت عمل کی عادی - مقامی حکام اطاعت پر قانع - لیکن جہاں لوگ خود چوکس اور تعلیم یافتہ ہوں اور اپنے مفادات کی دیکھ بھال کر سکتے ہوں وہاں یہ اصول صادق نہیں آتا - اور یہی صورتِ حال امریکہ میں ہے۔ عوام کی اجتماعی طاقت، عوامی بہبود کی منزل کی جانب حکومت سے زیادہ موثر طریقہ پر رہنمائی کر سکتی ہے۔

بے شک مرکزیت لوگوں کے خارجی عمل و فعل میں یکسانیت پیدا کرنے

میں کامیاب ہوتی ہے۔ مرکزیت روزمرہ کے کاروبار میں کسی دقت کے بغیر قابلِ رشک باقاعدگی پیدا کرتی ہے۔ امن عامہ قائم رکھنے کی مکمل ضروریات پر نظر رکھتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی بدامنیوں اور معمولی تنازعات کو دبا دیتی ہے۔ اور عام معاملات میں مکمل باقاعدگی قائم رکھتی ہے، جسے انتظامی محکموں کے صدر شاید بہتر نظم و نسق اور امن عامہ سے تعبیر کریں۔ مختصر یہ کہ مرکزیت انسدادی تدابیر میں تو سبقت لے جاتی ہے لیکن عمل میں نہیں۔ اس کی قوتیں اس وقت جواب دینے لگتی ہیں جب معاشرہ کو حرکت میں لانا یا اس کی رفتار کو تیز تر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور جب اس کے مقاصد اور تدابیر کی تکمیل کے لئے شہریوں کے تعاون کی ضرورت پیش آتی ہے تو اس کی کمزوری عیاں ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مرکزیت فطرتاً اطاعت چاہتی ہے وہ عوام کا تعاون حاصل کرنے میں بھی زیادہ اطاعت کی طلب گار ہوگی۔ ان شرائط کے تحت تو عوام کا تعاون اور اتحاد نہیں حاصل کیا جاسکتا۔ ایک "عام آدمی" ایسی سکیموں کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں جس سے وہ قطعی طور پر ناآشنا ہے تابع اداکار بننے کی بجائے خاموش تماشائی کی حیثیت قبول کرنا پسند کرے گا۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ امریکہ میں یکساں قواعد کی کمی کبھی کبھی ضرور محسوس کی جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ امریکہ میں ایسی مختلف باتیں نظر انداز کر دی جاتی ہیں جن سے زندگی آسان اور پر آسائش بن سکتی ہے، لیکن معاشرہ میں انسان کیلئے جو لازمی ضمانتیں ہیں وہ اور ملکوں ہی کی مانند طاقت ور ہیں۔ یہ درست ہے کہ امریکہ میں جو طاقت انتظام چلاتی ہے وہ نسبتاً کم باقاعدہ، کم تعلیمیافتہ اور کم مہارت یافتہ ہے۔ لیکن وہ یورپی ملکوں کے مقابلہ میں سینکڑوں گنا بڑی ہے دنیا کے کسی ملک میں شہری بہبود عامہ کے معاملات میں اتنے زیادہ

اثر انداز نہیں ہوتے جس کی مثال امریکہ میں ملتی ہے۔

میں کسی ایسی قوم سے واقف نہیں ہوں جس نے امریکہ کی طرح بے شمار بہتر سکول قائم کئے۔ باشندوں کی ضروریات اور خواہشوں کے مطابق عبادت گاہیں بنائیں اور نہریں اور سڑکیں تعمیر کی ہوں۔ جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے ہمیں وہاں یکسانیت، خاکوں اور منصوبوں میں پائیداری، معمولی انتظامی تفصیلات اور نظم و نسق کی اکملیت تلاش نہیں کرنا چاہیئے۔ وہاں جو چیز نہیں ملتی ہے وہ ایک عظیم طاقت کا وجود ہے۔ جو ممکن ہے بے لگام ہو لیکن بے پناہ توانائی کی حامل ہے۔

بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ ایک مرکزی طاقت امریکہ کے دیہاتوں اور کاؤنٹیوں پر بہتر طریقہ سے حکومت کر سکتی تھی اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ مرکزی طاقت کی وجہ سے امریکہ کو نسبتاً زیادہ سلامتی حاصل ہوتی اور ملک کے وسائل کا بہتر طور پر استفادہ کیا جا سکتا تھا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ امریکہ کے لوگ اپنے عدم مرکزیت کے حامل نظام سے جو سیاسی فائدے حاصل کرتے ہیں وہ مجھے اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ اس نظام کو ترجیح دوں۔ مرکزیت ایک شخص کو فائدہ پہنچاتی ہے لیکن کم۔ یہ سچ ہے کہ ایک چوکس حاکم بروقت اس کے امن، مسرتوں اور آسائشوں کا محافظ ہوتا ہے اور اس کی راہ سے خطرات کو ہٹاتا ہے۔ لیکن اگر اس حاکم کو فرد کی زندگی اور آزادی پر اس قدر اختیار حاصل ہے تو اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر وہ ناتواں ہو جائے تو اس کے گرد ہر چیز کمزور ہو جائے، وہ سو جائے تو ہر چیز سو جائے اور اگر مر جائے تو ریاست بھی تباہ ہو جائے۔

یورپ میں اکثر ممالک ایسے ہیں جہاں کے لوگ اپنے آپ کو صرف آبادکار تصور کرتے ہیں انہیں اس علاقہ کے مستقبل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جس میں وہ رہتے ہیں، انکی مرضی یا علم کے بغیر بڑی تبدیلیاں کر دی جاتی ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش

سے بے خبر اور بے تعلق رہتے ہیں اور اپنے گاؤں، ملک غرض ہر شے کو اس طاقتور اجنبی کی ملکیت تصور کرتے ہیں جنہیں وہ حکومت کہتے ہیں، انہیں اپنی مملوکہ چیزوں سے صرف زندگی تک ہی تعلق رہتا ہے۔ ملکیت کا جذبہ کبھی وابستہ نہیں ہوتا۔ اپنے معاملات سے عدم دلچسپی کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ کسی وقت ان کی یا ان کے بچوں کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے تو خطرے سے بچنے کی کوشش کرنے کی بجائے وہ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ قوم ان کی امداد کو پہنچے۔

جب کوئی قوم اس حالت پر پہنچ جاتی ہے تو اسے یا تو اپنے رسوم اور قوانین کو بدلنا پڑتا ہے یا وہ تباہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس قوم میں عوامی نیکی کا سرچشمہ خشک ہو چکا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس میں رعایا ہوتی ہے لیکن شہری نہیں، اس قسم کی بستیاں بیرونی حملہ آوروں کا شکار بن جاتی ہیں۔ اور اگر وہ صفحہ ہستی سے نیست و نابود نہیں ہو جاتیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کی ہمسایہ قومیں ان سے زیادہ پست ہوتی ہیں،

بعض قوموں نے ایسے ملکوں کی مدافعت کے لیے جہاں وہ اجنبیوں کے طور پر آباد تھے حیرت انگیز مساعی کیں ہیں۔ لیکن ان کے کارنامے بھی مرکزیت کے حق میں نتیجہ اخذ کرنے میں معاون نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ تحقیق سے یہ اندازہ ہو جائے گا، کہ ایسی صورتوں میں سب سے بڑی وجہ تحریک مذہب تھی۔

مذہب کی بجھی ہوئی شمع کو قوانین دوبارہ روشن نہیں کر سکتے۔ لیکن قوانین کے ذریعہ انسانوں میں اپنے ملک سے دلچسپی پیدا کرائی جا سکتی ہے۔ قوانین پر اس بات کا انحصار ہے کہ وہ عوام کی وطن پرستی کے خوابیدہ اور مبہم جذبات کو بیدار کریں، جو انسانی روح کے ساتھ ہمیشہ وابستہ رہتے ہیں۔ اور اگر حب وطنی کے ان جذبات میں اور انسان کے تخیلات، خواہشات اور روزمرہ عادات زندگی میں ایک رشتہ جوڑ دیا جائے تو اس سے عقلی اور جذباتی پختگی پیدا ہو سکتی ہے۔

امریکہ کی جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ نظم و نسق نہیں بلکہ عام مرکزیت کے سیاسی اثرات ہیں۔ امریکہ میں ملک کے مفادات کو ہر جگہ پیش نظر رکھا جاتا ہے یونین کے تمام باشندے ان مفادات سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ امریکہ کا شہری اپنے ملک کی عظمت پر فخر کرتا ہے۔ اس کی کامیابیوں پر ناز کرتا ہے۔ جن کے بارے میں وہ یہ تصور کرتا ہے کہ اس میں اس نے خود حصہ لیا ہے۔ اور عام خوشحالی پر وہ خوش ہوتا ہے۔ قوم اور ریاست کے بارے میں اس کے وہی احساسات ہیں جو اس کے اپنے خاندان سے ہو سکتے ہیں۔ اور وہ ایک خودغرضی ہی کے جذبہ کے تحت اپنے ملک کی بہبود میں دلچسپی لیتا ہے۔

ایک یورپی کے لئے سرکاری افسر ایک برتر طاقت کا نمائندہ ہوتا ہے۔ مگر امریکی کے لئے ایک افسر ایک حق کا نمائندہ ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر امریکہ میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا تابع نہیں ہوتا ہے بلکہ قانون و انصاف کی اطاعت کرتا ہے۔ اگر ایک امریکی شہری کی اپنے بارے میں رائے مبالغہ آرائی پر محمول ہوتی بھی ہے تو وہ اس کے لئے فائدہ رساں ہی ہوتی ہے۔ وہ بلا تامل اپنے ہی اختیارات پر بھروسہ کرتا ہے۔ جسے وہ ہر طرح کافی تصور کرتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی خاص کام کا بیڑہ اٹھانے کا ارادہ رکھتا ہے تو خواہ اس کا راست تعلق معاشرہ کی عام بہبود کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، وہ حکومت کا تعاون حاصل کرنے کا خیال تک اپنے ذہن میں نہیں لاتا۔ مگر وہ اپنے منصوبہ کی تشہیر کرتا ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے اپنی خدمات پیش کرتا ہے۔ دیگر شہریوں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور تمام رکاوٹوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسے اپنے کام کی تکمیل میں اتنی زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوتی جتنی کہ حکومت کو ہو سکتی تھی۔ لیکن بالآخر اس نوعیت کی انفرادی کوششیں اپنے نتائج کے اعتبار سے حکومت کی مساعی سے زیادہ مؤثر ثابت

ہوتی ہیں۔

چونکہ انتظامی حاکم تک ہر شہری کو رسائی حاصل رہتی ہے جس کا وہ کسی نہ کسی حد تک نمائندہ ہوتا ہے۔ اس لئے نہ تو وہ حسد کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ اور نہ نفرت کے اور چونکہ اس کے وسائل محدود ہوتے ہیں اس لئے ہر شہری یہ محسوس کر لیتا ہے کہ اس کی امداد پر بھروسہ کرنا درست نہیں ہے۔ پس جب انتظامیہ اپنے اختیارات کے حدود کے اندر کوئی کام کرنا چاہتی ہے تو اسے لوگ اس کے اپنے حال پر نہیں چھوڑ دیتے۔ عام شہریوں کے فرائض اس لئے ختم نہیں ہو جاتے کہ ریاست مصروف عمل ہے۔ اس کے برعکس ہر شخص انتظامیہ کی راہنمائی اور حمایت کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ سرکاری حکام اور افراد کا اشتراک عام طور پر ایسے کارنامے انجام دیتا ہے کہ انتہائی چاق و چوبند مرکزیت کے حامل انتظامیہ بھی ایسا نہیں کر سکتا۔

میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت میں بے شمار مثالیں بطور ثبوت پیش کر سکتا ہوں لیکن صرف ایک ہی مثال پر اکتفا کروں گا۔ امریکہ میں جرائم کا پتہ چلانے اور مجرموں کو گرفتار کرنے کے ذرائع بے حد کم ہیں۔ ریاست کی پولیس نہیں ہوتی اور پاسپورٹ کے نام تک سے کوئی آشنا نہیں۔ مجسٹریٹوں اور سرکاری کارندوں کی تعداد بھی کم ہے اور وہ مجرموں کی گرفتاری کے لئے ہمیشہ تدابیر بھی اختیار نہیں کرتے۔ اور قیدیوں سے پوچھ گچھ بعجلت اور زبانی ہوتی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ امریکہ میں بہت کم مجرم سزا سے بچ سکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شہری اپنا فرض تصور کرتا ہے کہ جرم کے سلسلے میں ثبوت مہیا کرے۔ اور خاطی کو گرفتار کرائے۔

قیام امریکہ کے دوران میں میں نے ایک جگہ دیکھا کہ لوگوں نے ایک ایسے شخص کی گرفتاری اور مقدمہ چلانے کے لئے جس نے ایک بڑے جرم کا ارتکاب کیا تھا فوری طور پر ایک کمیٹی بنائی۔ یورپ اور دوسرے ملکوں میں تو مجرم کے ساتھ

لوگوں کو کچھ ہمدردی بھی ہوتی ہے اور لوگ یہ تصور کرتے ہیں وہ ایک بدنصیب آدمی ہے جو سرکاری کارندوں کے خلاف اپنی زندگی کی بقاء کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اور لوگ اس کشمکش کے خاموش تماشائی ہوتے ہیں۔ مگر امریکہ میں مجرم کو ہر شخص نسل انسانی کا دشمن تصور کرتا ہے۔ اور ساری انسانیت اس کی دشمن ہو جاتی ہے۔

میری رائے میں صوبائی ادارے تمام قوموں کیلئے ضروری ہیں لیکن جمہوری ملکوں میں ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ارباب ثروت کی حکومت میں نظم و نسق ہر قیمت پر قرار رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ نظم و نسق کے فقدان کی وجہ سے حکمرانوں ہی کو نقصان پہنچتا ہے اسلیئے وہ نظم و نسق کے قیام کے معاملہ کو فوقیت دیتے ہیں۔ اسی طرح ارباب ثروت کی حکومت لوگوں کو مستبد فرماں رواؤں کی زیادتیوں سے بھی بچاتی ہے۔ کیونکہ ان کے پاس استبداد کی مزاحمت کرنے کے لئے منظم طاقت ہوتی ہے۔ لیکن صوبائی اداروں کے بغیر جمہوریت کے پاس ان برائیوں کی مدافعت کے لئے کوئی طاقت نہیں ہوتی۔

میری یہ بھی رائے ہے کہ جمہوری قوموں کو اندیشہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے۔ کہ کہیں وہ مرکزیت کے حامل انتظامیہ کی غلامی کے بوجھ تلے دب کر تباہ نہ ہو جائیں۔ اس کی متعدد وجوہ ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں۔

ایسی قوموں کا مسلسل یہ رجحان رہتا ہے کہ حکومت کی تمام قوت صرف ایسی طاقت کے ہاتھ میں مرتکز کر دی جائے جو بالراست عوام کی نمائندگی کرتی ہو۔ عوام کے ماسواء کسی اور چیز کا تصور ہی نہ کیا جائے اور خود عوام مساوی المرتبہ افراد کا مجموعہ تصور کئے جاتے ہیں لیکن جب بھی طاقت ان تمام خصوصیات کی حامل ہو جو حکومت کی ہوتی ہیں۔ تو وہ بمشکل ہی انتظامی امور کی تفصیل میں دخل دینے سے احتراز کر سکتی ہے۔ اور ایک طویل عرصہ میں اس قسم کا موقع کبھی نہ کبھی آنا ضروری ہے جیسا کہ فرانس میں ہوا۔ انقلاب فرانس کے وقت دو متضاد محرکات کام کر رہے تھے جنہیں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ ایک محرک آزادی

کا حامی تھا تو دوسرا مطلق العنانی کا حامی تھا۔ قدیم شاہی کے تحت شاہ کی ذات قوانین کا سرچشمہ تھی اور فرماں رواں کے اختیارات کے تحت صوبائی اداروں کے چیدہ آثار تھے۔ جو اگرچہ نیم تباہ شدہ تھے لیکن کسی نہ کسی حد تک قابل شناخت تھے۔ صوبائی اداروں میں بے ہنگمی تھی۔ غیر منظم تھے۔ اور لب الوقات۔ بیہودہ اور بے معنی تھے۔ یہ ادارے ارباب ثروت کے ہاتھوں میں تھے۔ انہوں نے کبھی کبھی یہ ظلم و استبداد کے آلہ کار کے طور پر استعمال کئے۔ انقلاب نے بہ یک وقت شاہی اور صوبائی اداروں دونوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ فرانسیسی انقلاب کا یہ دوہرا کردار ایک ایسی حقیقت ہے جسے مطلق اختیارات کے نظریہ کے حامیوں نے انتہائی مہارت کے ساتھ اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں نے ایسے دو ملکوں کی سیاحت کی ہے جہاں صوبائی آزادی کے نظام کو مکمل طور پر قائم کیا جا چکا تھا۔ اور میں نے دونوں ملکوں میں مختلف جماعتوں کے نظریات سنے ہیں۔ امریکہ میں مجھے ایسے بھی لوگ ملے جو یونین کے جمہوری اداروں کو تباہ کرنے کے دل ہی دل میں آرزومند تھے ایسے لوگ بھی ملے جو ارباب ثروت کو ختم کرنے کے پرزور حامی تھے۔ لیکن کوئی ایسا شخص نہ ملا جسے صوبائی آزادی کی افادیت سے انکار ہو۔ دونوں ملکوں میں ریاست کی خرابیوں کی متعدد وجوہ بیان کی گئیں۔ لیکن کسی نے مقامی نظام کی کمزوریوں کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے شہریوں کو اپنے ملک کی خوشحالی اور طاقت کے متعدد اسباب بیان کرتے سنا۔ لیکن سب نے اس سلسلے میں مقامی اداروں کے فوائد کو اوّلین اہمیت دے کر پیش کیا۔

ظاہر ہے کہ جب تمام لوگ مذہبی عقائد اور سیاسی نظریات میں اختلافات رکھنے کے باوجود، ایک ہی نقطہ پر متحد ہیں (جس کے بارے میں وہ خود بہتر طور پر فیصلہ کر سکتے ہیں کیونکہ اس سے ان کی روزمرہ زندگی کا تعلق ہے) تو یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ وہ غلطی پر ہیں۔ صرف وہی اقوام صوبائی آزادی کی افادیت سے انکار کر سکتی ہیں جہاں یہ آزادیاں کم ہیں۔ بالفاظ دیگر وہی لوگ ان کی مذمت کرتے ہیں جو ان آزادیوں سے واقفیت نہیں ہیں؛

۶۔ امریکہ میں عدالتی اختیارات اور اُن کا اثر

میں نے امریکہ کے عدالتی نظام کے بارے میں ایک علیحدہ باب میں بحث کرنا اس لیے ضروری تصور کیا کہ کہیں امریکی عدالتی نظام کے سیاسی اثرات قاری کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ امریکہ کے علاوہ دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی وفاق تشکیل دیئے گئے ہیں۔ یورپ کی مختلف ریاستوں میں نمائندہ حکومت کا نظام اپنایا گیا ہے۔ لیکن میں کرہ ارض پر کسی ایسے ملک سے واقف نہیں ہوں جہاں امریکہ کی مانند عدالتی اختیارات کو منظم کیا گیا ہے اجنبیوں کے لیے امریکہ کے عدالتی نظم کو سمجھنا بے حد مشکل معلوم ہوتا ہے روزمرہ کے سیاسی امور میں وہ جب جج کو اختیارات استعمال کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو لازمی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ جج بھی اہم سیاسی عہدیدار ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ عدالتوں کی ہیئت ترکیبی کا مطالعہ کرتا ہے تو اس میں اُدھر عدالتوں سے کوئی مختلف بات نظر نہیں آتی۔ اور وہ اندازہ کر لیتا ہے کہ سیاسی امور میں جج کی مداخلت محض ایک اتفاق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایسے اتفاقات روزمرہ پیش آتے ہیں۔

دنیا کے ہر ملک میں عدالت کا اولین کام ثالثی کے فرائض انجام دینا ہوتا ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ کسی عدالت کی مداخلت کے لیے فریق یا فریقین اپنے حقوق کا دعا کریں اور جج کے سامنے فیصلے کے لیے اپنا مقدمہ پیش کریں۔ جب تک کہ کسی قانون کے بارے میں کوئی تنازعہ نہ ہو۔ عدالت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ جب کوئی جج کسی خاص مقدمہ میں اس مقدمہ سے متعلق قانون کی تنقید کرتا ہے تو وہ اپنے عام روزمرہ کے فرائض کے حدود میں ان سے تجاوز

کیے بغیر تو سلیم کر لیتا ہے کیوں کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لیے قانون کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرے لیکن اگر وہ کسی مقدمہ کی کارروائی کے بغیر قانون کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرے تو پھر وہ اپنے حدود سے آگے بڑھتا ہے اور قانون ساز کے فرائض میں مداخلت کا مرتکب ہوتا ہے۔

عدالت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک خاص مقدمہ میں اپنا فیصلہ صادر کرتی ہے کہ عام اصولوں کے بارے میں اگر ایک جج، کسی مقدمے کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے، ایک ایسا فیصلہ صادر کر کے ایک عام اصول کو پاش پاش کر دیتا ہے جس سے اس اصول سے اخذ کردہ نتائج مسترد ہوتے ہیں۔ تو وہ اپنے عام فرائض کے حدود ہی کے اندر رہتا ہے لیکن اگر وہ کسی خاص مقدمہ کے بغیر ہی کسی عام اصول پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ اپنے اختیارات سے تجاوز کرتا۔

عدالت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف اسی صورت میں عمل کر سکتی ہے جب اس سے اس کی درخواست کی جائے اور یا قانونی اصطلاح میں عدالت اس وقت عمل کر سکتی ہے جب اسے کسی امر کا اختیار سماعت حاصل ہو جائے۔ اور یہ خصوصیت انتہائی اہم ہے۔ جب عدالت سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ جرم کی سزا دے تو وہ مجرم کو سزا دیتی ہے۔ کسی غلطی کی اصلاح کرانا مقصود ہو تو عدالت اس کے لئے آمادہ رہتی ہے۔ جب کسی قانون کی تعبیر و تاویل کرانا مقصود ہو تو وہ اس کے لیے تیار رہتی ہے لیکن وہ خود مجرموں کا تعاقب نہیں کرتی، غلطیوں کی تلاش نہیں کرتی اور شہادتوں کا اپنے طور پر تجزیہ نہیں کرتی۔ ایسا حاکم عدالت، جو خود پہل کرے اور قانون کی تنقید اور مذمت کا حق خود غصب کر لے، اپنے اختیارات سے تجاوز کرتا ہے اور ایک زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے

اہل امریکہ نے عدالتوں کی ان تینوں نمایاں خصوصیات کو برقرار رکھا ہے۔ ایک امریکی جج اسی صورت میں فیصلہ دے سکتا ہے جب کہ کوئی متنازعہ فیہ مسئلہ پیدا ہوا ہو۔ وہ صرف خاص مقدمات میں دخل دیتا اور اس وقت تک عمل نہیں کرتا ہے جب تک وہ مقدمہ قانونی طور پر اس کی عدالت میں پیش نہ کیا جائے۔ غرض امریکی جج اپنے اختیارات اور موقف کے اعتبار سے دوسرے ملکوں کے مجسٹریٹ اور منصف ہی کی مانند ہے لیکن اس کے باوجود اسے غیر معمولی سیاسی اختیارات حاصل ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ صورتِ حال کیسے پیدا ہوئی؟ جب اس کے اختیارات اور فرائض دوسرے ملکوں کے ججوں کے مشابہ ہیں تو امریکی جج نے وہ خاص اختیارات کس طرح حاصل کئے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہیں؟ اس کا جواب ایک سادہ حقیقت میں مضمر ہے اور وہ یہ کہ امریکیوں نے اپنے ججوں کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کی اساس امریکی آئین پر رکھیں نہ کہ قوانین پر۔ بالفاظ دیگر انہوں نے اپنے ججوں کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ ایسے قوانین کا اطلاق کریں جو ان کے نزدیک غیر آئینی ہوں۔

اس قسم کے حقوق کا لاحاصل ادعا، دنیا کے دوسرے ملکوں کی عدالتوں نے بھی کیا ہے لیکن امریکہ میں اس حق کو تمام ہر کس و ناکس تسلیم کرتا ہے۔ نہ تو کوئی جماعت اور نہ ہی کوئی فرد اس سے انکار کرتا ہے۔ اس حقیقت کی مزید وضاحت امریکی آئین کے اصولوں سے ہوتی ہے۔ فرانس میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ آئین ناقابل ترمیم اور تنسیخ ہے اور یہ نظریہ عام ہے کہ کوئی طاقت آئین کے کسی حصہ کو تبدیل کرنے کی مجاز نہیں۔ انگلستان میں آئین بتدریج تبدیل ہوتا رہتا ہے اور درحقیقت اس کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ پارلیمان بیک وقت آئین ساز اور قانون ساز ادارہ ہے۔ امریکہ کے سیاسی نظریات نسبتاً زیادہ سادہ اور زیادہ معقولیت پر مبنی ہیں،

امریکہ والے اپنے آئین کو نہ تو فرانس کی طرح کلّی طور پر ناقابل تغیّر تصور کرتے ہیں اور نہ ہی انگلستان کی طرح ہر لمحہ تغیر پذیر سمجھتے ہیں چونکہ آئین بحیثیت مجموعی عوامی مرضی کی نمائندگی کرتا ہے اس لیے شہریوں کے مانند قانون ساز بھی اس کے پابند ہیں، لیکن معینہ اصولوں اور قواعد کے ماتحت، عوام کی خواہش اور مرضی کے مطابق ان میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ امریکہ میں آئین میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن جب تک آئین موجود ہے وہ تمام اختیارات اور اقتدار کا سرچشمہ ہے اور غالب قوت کا واحد آلہ کار۔

امریکہ میں آئین کی حکمرانی، قانون سازوں اور عام شہریوں پر یکساں نوعیت کی ہوتی ہے چونکہ یہ قانونِ اوّل ہوتا ہے لہٰذا عام قانون کے ذریعہ اس میں تبدیلی نہیں کی جا سکتی اور اسی لئے عدالتوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ قانون کے مقابلہ میں آئین کو ترجیح دیں۔

فرانس میں بھی آئین قانون اوّل ہی تصور کیا جاتا ہے اور ججوں کو اسے اپنے فیصلوں کی بنیاد بنانے کے لیے وہی اختیارات حاصل ہیں لیکن اگر انہوں نے اس حق کو استعمال کیا تو وہ ایسے حقوق میں مداخلت کے مرتکب ہوں گے جو ان کے حقوق سے زیادہ مقدس ہیں۔ یعنی وہ معاشرہ کے حق میں مداخلت کریں گے۔ ایسی صورت میں ریاست کی مصلحتیں عام محرکات پر غالب آتی ہیں۔ امریکہ میں جہاں قوم آئین میں تبدیلی لا کر ججوں کو اطاعت پر مجبور کر دیتی ہے اس قسم کا خطرہ درپیش نہیں رہتا۔ اس نقطہ پر سیاسی اور منطقی مصلحتیں متفق رہتی ہیں اور عوام اور جج دونوں اپنے اپنے حقوق کی حفاظت کرتے ہیں۔

جب کبھی کسی امریکی عدالت میں کسی ایسے قانون کی اساس پر عدالتی استمداد طلب کی جاتی ہے جسے جج نے غیر آئینی قرار دیا ہو تو اسے قاعدہ کے طور پر تسلیم

کرنے سے انکار کر سکتا ہے۔ امریکی مجسٹریٹ کو ایک خاص نوعیت کا اختیار حاصل ہے لیکن اسے اس بناء پر بے پناہ سیاسی اثر حاصل ہوتا ہے سچ تو یہ ہے کہ ایک طویل عرصہ میں چند ہی قوانین عدالتی تجزیہ سے بچ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ چند ہی قوانین ایسے ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی شخص کے مفادات پر اثر انداز نہ ہوتے ہوں اور کوئی قانون ایسا نہیں ہوتا جو فریقین مقدمہ کی مرضی یا مقدمہ کی ضروریات کے تحت عدالت میں زیر بحث نہ آئے لیکن جونہی کوئی جج کسی خاص قانون کے اطلاق سے انکار کر دیتا ہے تو وہ قانون اپنی اخلاقی طاقت کھو دیتا ہے۔ ان لوگوں کو بھی جن کے مفادات پر یہ قانون مضر اثر ڈالتا ہے یہ علم ہو جاتا ہے کہ اس قانون کے اثر سے بچنے کے ذرائع موجود ہیں۔ چنانچہ اس قسم کے مقدمات دھڑا دھڑ پیش ہونے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ قانون بالکل بے اثر ہو جاتا ہے۔ متبادل صورت یہ رہ جاتی ہے کہ لوگ یا تو آئین تبدیل کر دیں یا مجلس قانون ساز اس قانون کی تنسیخ کر دے۔ امریکیوں نے اپنی عدالتوں کو جو سیاسی اختیارات عطا کئے ہیں وہ بے پناہ ہیں لیکن ان سیاسی اختیارات کے برے پہلوؤں کا بڑی حد تک ازالہ اس طرح کر لیا گیا ہے کہ ان عدالتوں کے لیے عدالت کے حدود سے باہر قوانین پر حملہ کرنا ممکن نہیں ہوتا اور کوئی جج صرف کسی مقدمہ زیر بحث ہی میں کسی قانون کے غیر آئینی اور ناقص ہونے کا فیصلہ دے سکتا ہے۔ علاوہ ازیں قانون کی محض عدالتی مذمت سے قانون ختم نہیں ہو جاتا ہے اس کی اخلاقی طاقت کمزور ہو جاتی ہے لیکن اس کا اختیار و اثر یک دم ختم نہیں ہوتا اس کی تباہی عدالتی حکام کے مسلسل اور متواتر حملوں کے بعد ہی مکمل ہوتی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ نجی مفادات کو کسی قانون کی مذمت کرنے کا موقع دے کر اور کسی فرد کے مقدمہ کو قانون کی آزمائش سے گہری طور پر وابستہ کر کے قانون سازوں کو بے رحمانہ

حملوں سے بچالیا گیا ہے۔ قانون سازوں کی غلطیاں صرف اسی وقت بے نقاب ہوتی ہیں جب کسی خاص ضرورت کی تکمیل کرنا ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ امریکی عدالتوں کا یہ طریقۂ عمل آزادی اور عام نظم و نسق دونوں کے لیے مفید ہے اگر جج کو قانون ساز پر بالراست اور علی الاعلان حملہ کرنے کی اجازت ہوتی تو وہ بعض دفعہ اس کی مخالفت کرتے ہوئے ڈر محسوس کرتا اور بعض اوقات جماعتی جذبات کے تحت وہ اس کی ہر جگہ اور ہر مرحلہ پر مخالفت کرنے پر کمربستہ رہتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ قوانین پر حملہ صرف اس صورت میں کیا جاتا جبکہ قانون کی سرچشمہ طاقت کمزور ہو اور ان کی اطاعت اس وقت کی جاتی ہے جبکہ وہ طاقت ور ہو، بالفاظ دیگر جب قانون پر عمل کرنا مفید ہوتا انہیں متنازعہ فیہ امر بنا دیا جاتا اور جب انہیں جبر و تعدی کے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کرنا آسان ہوتا تو ان کا احترام کیا جاتا۔ مگر امریکی جج سیاسی میدان میں آزادانہ طور پر اپنی مرضی ہی سے آتا ہے۔ وہ قانون کی جانچ پڑتال اس لیے کرتا ہے کہ اسے ایک مقدمہ پر غور کرنا پڑتا ہے جن سیاسی سوالوں پر وہ فیصلہ دینے پر مجبور ہوتا ہے وہ فریقین کے مفادات سے وابستہ ہوتے ہیں اور انصاف کے اصولوں سے انحراف کئے بغیر وہ سیاسی سوالوں پر فیصلہ دینے سے انکار نہیں کر سکتا۔ وہ بحیثیت جج اپنے معینہ فرائض کی تکمیل کرنے پر مجبور ہے، درحقیقت ایک شہری کی حیثیت سے اپنا فرض انجام دیتا ہے یہ درست ہے کہ اس نظام کے تحت عدالت ہائے انصاف کی جانب سے قانون ساز اداروں کے احتساب کا دائرہ بلا امتیاز تمام قوانین پر محیط نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ بعض ایسے مخصوص معاملات جنہیں اصطلاحاً، قانونی مقدمات کہا جاتا ہے زیر بحث ہی نہیں آتے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اگر ایسا مقدمہ ممکن بھی ہو تو کوئی شخص اسے عدالت کے سامنے

پیش کرنے کی پروا بھی نہ کرے۔ امریکیوں نے بسا اوقات اس کمزوری کو محسوس بھی کیا ہے لیکن انہوں نے اس کا علاج ادھورا چھوڑ دیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں اس کے نتائج خطرناک نہ ہوں۔ غرض یہ کہ ان حدود کے اندر قوانین کو غیر آئینی قرار دینے سے متعلق امریکی عدالتوں کا اختیار اسمبلیوں کے خلاف ایک زبردست رکاوٹ کا کام دیتا ہے کہ اس کی مثال کسی اور جگہ نہیں ملتی

یہ کہنے کی شاید ضرورت نہیں کہ امریکہ جیسے آزاد ملک میں شہریوں کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ سرکاری عہدیداروں کے خلاف عام عدالتوں میں مقدمات دائر کریں اور تمام ججوں کو سرکاری عہدیداروں کو سزا دینے کا اختیار حاصل ہے۔ انتظامی عہدیداروں کو سزا دینے کا یہ حق اس قدر فطری ہے کہ اسے غیر معمولی حق نہیں کہا جا سکتا۔ اور نہ ہی سرکاری عہدیداروں کو عدالتوں کے آگے جوابدہ بنانے سے امریکہ میں حکومت کے نظام میں کسی قسم کی کمزوری پیدا ہوئی ہے۔ امریکیوں نے اس طریقہ کار کے ذریعہ سرکاری عہدیداروں کی عزت و رفعت میں اضافہ کر دیا ہے اور دوسری طرف عہدیدار محتاط رہنے پر مجبور ہیں امریکہ میں جس قدر کم تعداد میں سیاسی مقدمات ہوتے ہیں اس نے مجھے بے حد متاثر کیا لیکن اس کی وجہ بھی ہیں۔ مقدمہ بازی، خواہ کسی نوعیت کی ہو مشکل اور اخراجات طلب ہوتی ہے۔ سرکاری ملازم پر ایک اخبار میں حملہ کرنا آسان ہے۔ لیکن اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ لیجانے کے محرکات سنجیدہ نوعیت کے ہونے چاہئیں۔ کسی سرکاری عہدیدار کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا خیال ذہن میں لانے سے پہلے شکایت کی کوئی ٹھوس وجہ ہونی چاہیئے اور ایسی ٹھوس وجہ عام طور پر اس لیے نہیں مل سکتی کہ خود سرکاری عہدیدار اس ڈر سے بے حد محتاط ہوتے ہیں کہ ان کے خلاف

کوئی مقدمہ نہ چلایا جائے۔

یہ بات صرف امریکہ کی جمہوری حکومت ہی کی کوئی نمایاں صفت نہیں ہے انگلستان میں بھی یہی ہوتا ہے۔ یہ دونوں قومیں مملکت کے اہم افسروں کو قابل مواخذہ بنانے کو اپنی خود مختاری کی ضمانت تصور نہیں کرتے، لیکن وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ ملک کے شہریوں کو اس قسم کے چھوٹے مقدمات ہر وقت داخل کرنے کا حق دے کر آزادی کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔

قرون وسطیٰ میں، جب کہ خاطیوں کو پکڑنا مشکل ہوا کرتا تھا جج ان چند مجرموں کو سخت سزا دیتے۔ جو گرفتار ہو جاتے۔ لیکن اس سے جرائم میں کمی واقع نہ ہوتی۔ چنانچہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ جب انصاف رسانی زیادہ یقینی ہو اور انصاف نرم تر ہو تو وہ زیادہ موثر ہوتا ہے۔ انگریز اور امریکی دونوں سرکاری عہدیداروں کی طرف سے عوام پر جبر و تندی اور ظلم و ستم ہو تو اسے دیگر جرائم ہی کی مانند سمجھتے ہیں اور ان کی تعزیر کے سلسلے میں عام جرائم کی تعزیر کے اصول کام کرتے ہیں۔

۷- وفاقی آئین کے چند پہلو

امریکہ کی تیرہ نوآبادیاں، جنہوں نے متحد ہو کر پچھلی صدی کے اواخر میں انگلستان کی غلامی کا جوا اتار پھینکا، ایک ہی مذہب، ایک زبان اور یکساں روایات و رسوم اور تقریباً ایک سے قوانین کی حامل تھیں۔ وہ ایک مشترکہ دشمن کے خلاف نبرد آزما تھیں اور یہ وجوہات انہیں ایک دوسرے سے متحد کرنے اور ایک قوم بنانے کے لئے کافی تھیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک نوآبادی کا ایک علیحدہ وجود بھی تھا۔ ہر ایک کی اپنی الگ حکومت تھی۔ مختلف مفادات اور مخصوص رسوم ابھر آئے تھے، جو ان نوآبادیوں کے مکمل اتحاد کے مقصد سے متصادم تھے۔ کیونکہ اس سے ہر ایک کی انفرادی اہمیت، تمام نوآبادیوں کی مجموعی اہمیت میں گم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ دو متضاد رجحانات پیدا ہوئے۔ ایک رجحان نے اینگلو امریکیوں میں اتحاد کی تحریک پیدا کی اور دوسرے نے ان کی طاقت کو تقسیم کرنے پر ابھارا۔

جب تک انگلستان سے جنگ اور کشمکش جاری رہی ضرورت نے اتحاد کے اصول کو برقرار رکھا۔ اگرچہ وہ قوانین جو اس اتحاد کے بعد آئے تھے ناقص تھے لیکن ان نقائص کے باوجود مشترکہ بندھن باقی رہے۔ جیسے ہی امن قائم ہوا، ان قوانین کے نقائص واضح ہونے لگے۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ریاست تحلیل ہو کر رہ گئی ہے۔ ہر نوآبادی آزاد جمہوریہ بن گئی اور مطلق خودمختار ہو گئی۔ وفاقی حکومت، جو اپنے ناقص آئین کی وجہ سے بے اثر ہو کر رہ گئی تھی اور مشترکہ خطرہ کے احساس کی غیر موجودگی کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی یورپ کی دوسری قوموں کو امریکی پرچم کی بے حرمتی کرتے ہوئے دیکھ کر بھی کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اور خود سرخ ہندی قبائل کا مقابلہ کرنے سے عاجز سی تھی۔ اور ان

قرضوں کی ادائیگی کی اپنے آپ میں سکت نہ پاتی جو جنگ آزادی کے دوران لئے گئے تھے۔ امریکی حکومت اس وقت درحقیقت تباہی کے دہانہ پر پہنچ چکی تھی۔ اس نے سرکاری طور پر کاروبار مملکت چلانے سے معذوری ظاہر کی اور قانون ساز ادارے سے اپیل کی کہ وہ اس صورت حال کا مقابلہ کرے۔

اگر امریکہ کسی وقت اپنی عظمت کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا ہے تو یقیناً یہی وہ لمحہ تھا جب کہ قومی اقتدار کی مظہر' یعنی قومی حکومت اپنی قوت سے دستبردار ہو گئی تھی۔ ہر زمانے میں مختلف قوموں نے آزادی حاصل کرنے کے لئے عظیم الشان جدوجہد کی ہے۔ اور تاریخ کے صفحات ان کے کارناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ انگریزوں کی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے سلسلے میں امریکیوں کے کارناموں کو بیان کرنے میں کچھ مبالغہ ہی سے کام لیا گیا ہے۔ ۳ ہزار میل لمبے سمندر نے اہل امریکہ کو ان کے دشمنوں سے جدا کر رکھا تھا، علاوہ ازیں انہیں ایک طاقتور حلیف کی حمایت حاصل تھی۔ لہذا اہل امریکہ کی جنگ آزادی میں فتح امریکی سپاہیوں کی شجاعت اور امریکہ کے شہریوں کی قوم پرستی سے زیادہ امریکہ کے جغرافیائی محل وقوع کی رہین منت تھی۔ امریکہ کی جنگ آزادی کا فرانسیسی انقلاب سے مقابلہ کرنا مضحکہ خیز بات ہے۔ کیونکہ فرانس نے' جس پر سارے یورپ نے ہلہ بول دیا تھا۔ دوستوں اور حلیفوں کے علاوہ اپنی آبادی کا بیشتر حصہ جنگ میں جھونک دیا اور انقلاب کی شمع کو اپنی سرحدوں سے پار، دور تک پہنچا دیا۔ لیکن اس کے ساتھ فرانس کو ایک ایسا روگ لگ گیا تھا جو اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ انسانیت کی تاریخ میں ایک تنہا واقعہ ہے کہ مجلس قانون ساز کی جانب سے یہ اطلاع پانے کے بعد کہ ملک کی حکومت کی گاڑی رک گئی ہے' ایک قوم نے خاموشی سے اپنے آپ پر تنقیدی نگاہ ڈالی اس کے عواقب ونتائج کا جائزہ لیا اور دو سال تک اس مرض کا علاج دریافت ہونے

کا انتظار کیا اور جب یہ علاج دریافت ہوا تو اس نے رضا کارانہ طور پر ایک قطرۂ خون بہائے بغیر بلا چوں و چرا قبول کر لیا۔

امریکی آئین کی بے اثری جب معلوم ہوگئی تو اس وقت امریکہ نے سکون اور خاموشی کے اس دور کا، جس نے انقلاب کے جوش اور ہیجان خیز زمانے کی جگہ لی تھی اور ان عظیم المرتبت شخصیتوں کا جو انقلاب کی پیداوار تھیں دہرا فائدہ اٹھایا۔ دوسرا آئین بنانے کی ذمہ داری جس جماعت نے قبول کی تھی وہ چھوٹی سی تھی لیکن جارج واشنگٹن اس کا صدر تھا اور یہ جماعت ایسے بہترین ذہنوں اور شریف ترین کردار کے حامل لوگوں پر مشتمل تھی۔ جن کا ثانی نئی دنیا شاید کبھی نہ پیش کر سکے۔ اس قومی کنونشن نے طویل اور کامل غور و خوض کے بعد لوگوں کی منظوری کے لیے ایک ایسا مجموعۂ قوانین پیش کیا جس کی اب تک امریکی یونین پر حکمرانی ہے۔ تمام ریاستوں نے اسے یکے بعد دیگرے قبول کر لیا۔ دو سال کے التوا کے بعد نئی وفاقی حکومت نے پھر سے ۱۷۸۹ء میں کام کرنا شروع کیا۔ امریکہ کا انقلاب ٹھیک اس وقت ختم ہوا جب کہ فرانس کا انقلاب شروع ہوا تھا۔

اہل امریکہ کے نزدیک سب سے پہلا حل طلب مسئلہ یہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ کو وفاق سے منسلک ریاستوں میں کچھ اس طرح تقسیم کیا جائے کہ وہ جداگانہ طور پر ان امور پر حکومت کرتی رہیں جن کا تعلق ان کی اندرونی خوشحالی سے ہے اور ساتھ ہی ساری قوم کا، جن کی نمائندگی یونین کرتی ہے ایک جامع اتحاد باقی رہے جو تمام ضروریات کی دیکھ بھال کر سکے۔ یہ مسئلہ مشکل اور پیچیدہ تھا۔ پہلے ہی یہ تعین کرنا ناممکن تھا کہ ٹھیک طور پر یونین اور ریاستوں کے اختیارات کس طرح تقسیم کیے جائیں۔

جہاں تک وفاقی حکومت کے فرائض اور مطالبات تھے وہ بہت سادے اور قابل تعین تھے۔ کیونکہ یونین کی تشکیل اس واضح غرض کے تحت عمل میں آئی تھی کہ وہ

عام ضروریات کی تکمیل کرے گی۔ لیکن ہر ریاست کے مطالبات اور فرائض مختلف اور پیچیدہ تھے۔ کیونکہ ان کی حکومتیں شہریوں کی زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں دخیل تھیں۔ چنانچہ وفاقی حکومت کے خصوصی اختیارات کی احتیاط سے وضاحت کر دی گئی۔ وہ تمام معاملات جو وفاقی حکومت کے اختیارات میں شامل نہیں کئے گئے تھے ریاستی حکومتوں کے سپرد کر دئے گئے۔ اس طرح ریاستوں کی حکومت کے اختیارات اگر قاعدہ کلیہ تھے تو وفاقی حکومت کے اختیارات کی نوعیت استثنائی تھی۔

مگر اس کا امکان تھا کہ اس استثنائی اختیار کے بارے میں تنازعات پیدا ہوں۔ چنانچہ اس امر کی پیش بینی کرتے ہوئے یہ تصور کیا گیا کہ اس سوال کے فیصلہ کا انحصار مختلف ریاستوں کی مقرر کردہ عام عدالت ہائے انصاف پر چھوڑنا نہ صرف بعید از مصلحت بلکہ خطرناک ہوگا۔ چنانچہ ایک اعلیٰ وفاقی عدالت قائم کی گئی جس کا ایک اہم کام یہ تھا کہ وہ رقیب ریاستوں میں توازنِ اقتدار قائم رکھے جیسا کہ آئین نے کہا تھا۔

عوام خود فی نفسہٖ افراد کا مجموعہ ہیں اور ان کے ایک حکومت کے تحت متحد کرنے کی ضرورت اس لئے تھی کہ غیر ملکوں سے تعلقات کے سلسلہ میں وہ نقصان میں نہ رہیں۔

جنگ و صلح، تجارتی معاہدات، فوجوں کی تشکیل اور بحری بیڑے تیار کرنے کا خصوصی اختیار یونین کے سپرد کیا گیا۔ معاشرے کے اندرونی امور کا اہتمام کرنے کے سلسلے میں مرکزی حکومت کی ضرورت کم ہی محسوس کی گئی۔ لیکن بعض عام امور ایسے ہوتے ہیں جن کی بہتر طور پر تکمیل ایک مرکزی اختیار کے ذریعہ ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یونین کو مالی نظام پر کنٹرول کرنے۔ ڈاک کا انتظام کرنے اور ملک کے

مختلف حصّوں کو ملانے کے لئے بڑی بڑی شاہراہوں کی تعمیر کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اپنے اپنے دائرہ ہائے کار میں ہر ریاست کی خود مختاری اور آزادی عمل کے حق کو تسلیم کیا گیا۔ لیکن وفاقی حکومت کو بھی اس بات کا اختیار دیا گیا کہ وہ بعض مجلسی امور میں ریاستوں کے ایسے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت کر سکتی ہے، جس میں آزادی کے غیر دانشمندانہ استعمال سے پورے ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہو۔ اس طرح اگرچہ ہر ریاست کو اپنے قوانین اور قواعد میں اپنی پسند و اختیار کے مطابق رد و بدل کرنے کا حق دیا گیا۔ لیکن ان پر یہ پابندی لگائی گئی کہ وہ ایسے قوانین نہیں بنا سکتے جو ان ریاستوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہی نافذ تھے۔ اس طرح انہیں خطابات وغیرہ دینے کا بھی اختیار نہ دیا گیا۔ آخری بات یہ ہے کہ وفاقی حکومت کو محاصل عائد کرنے کے غیر محدود اختیارات دے گئے تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے قابل ہو سکے۔

وفاقی آئین نے اختیارات کی جس طرح تقسیم کی ہے اس کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وفاقی آئین سازوں کے پیش نظر حکومت کی مرکزیت کے بارے میں واضح اور غیر مبہم تصورات تھے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نہ صرف جمہوریہ تھا بلکہ ایک وفاق بھی تھا۔ مگر وہاں قومی اقتدار یورپ کے مطلق العنان فرمانرواؤں سے زیادہ مرکزیت کا حامل ہے۔

امریکہ میں اگر عاملہ (ایگزیکٹو گورنمنٹ) نسبتہً کمزور ہے تو اس کے ذمہ دار ملک کے قوانین سے زیادہ وہاں کے خاص حالات ہیں۔ صرف تعلقات خارجہ ہی کے سلسلہ میں کسی قوم کی عاملہ اپنی مہارت اور طاقت کا مظاہرہ کر سکتی ہے اگر ونین کے وجود اور سلامتی کو مستقل طور پر خطرہ لاحق ہو۔ اگر اس کے اہم مفادات کا تعلق دوسری طاقتور اقوام کے مفادات سے ہو، تو عاملہ کو اسی تناسب سے زیادہ

اہمیت حاصل ہو جاتی ہے ۔ امریکہ کا صدر ۔ امریکی مسلح افواج کا اعلیٰ کمانڈر ہوتا ہے ۔ لیکن فوج صرف ۶ ہزار سپاہیوں پر مشتمل ہے ۔ وہ بحری بیڑوں کا سردار ہے ۔ بحری بیڑہ کا وجود برائے نام ہے ۔ وہ یونین کے تعلقاتِ خارجہ کا اہتمام کرتا ہے ۔ لیکن امریکہ ایک ایسا ملک ہے جس کا کوئی پڑوسی نہیں ۔ سمندروں نے امریکہ کو باقی دنیا سے الگ کر رکھا ہے ۔ اور وہ فی الحال اس قدر کمزور ہے کہ ابھی سمندروں پر حکمرانی کی خواہش بھی دل میں نہیں لا سکتا ۔ اس لئے نہ تو اس کے کوئی دشمن ہیں اور نہ ہی اس کے مفادات دنیا کے کسی اور ملک کے مفادات سے تصادم میں آئے ہیں ۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حکومت کی کارروائیوں کا مطالعہ اس کے آئین کے نظریات کے اساس پر نہیں کرنا چاہیئے ۔ امریکہ کے صدر کو تقریباً شاہوں کے سے اختیارات حاصل ہیں ۔ لیکن ان کے استعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا ۔ قانون اسے طاقتور بننے کی اجازت دیتا ہے لیکن حالات اسے کمزور رکھتے ہیں

چھوٹی ریاستوں میں عوام کی کڑی نگاہیں قومی زندگی کی معمولی جزئیات تک رہتی ہیں اور ترقی کی سپرٹ چھوٹی چھوٹی باتوں تک ہی داخل ہو سکتی ہے ۔ عوام کی غیر ضروری امنگوں کی روک تھام ان کی کمزوریاں کر دیتی ہیں اور قوم کے تمام اندرونی وسائل اور مساعی معاشرہ کی بہبود کے لئے وقف کی جاتی ہیں ۔ چونکہ ہر شخص کے اختیارات عام طور پر محدود ہوتے ہیں ۔ اس کی خواہشات بھی نسبتاً چھوٹی ہوتی ہیں ۔

ایک چھوٹی ریاست میں استبداد اور مطلق العنانی کی بنیاد پڑتی ہے تو وہ عذابِ جان بن جاتی ہے ۔ کیونکہ ایک مختصر سے دائرہ میں ہر چیز استبداد سے متاثر ہوتی ہے ۔ لیکن چھوٹی ریاست میں اس قسم کا استبداد شاید و باید ہی قائم ہوتا ہے اور چھوٹے معاشروں اور ریاستوں کی فطری کیفیت آزادی میں ہے ایک چھوٹی ریاست میں قوت و اختیارات اس قدر کم ہوتے ہیں کہ وہ کسی طالع آزما

کے لئے باعث ترغیب ہی نہیں ہو سکتے اور دوسری بات یہ کہ افراد کے وسائل اس قدر کم ہوتے ہیں کہ وہ ان کے سہارے جبر و اقتدار کا مقام حاصل ہی نہیں کر سکتے ہیں اور اگر کبھی کوئی شخص مطلق العنان حکمران بن بھی جائے تو ریاست کے لوگوں کے لئے یہ بات آسان ہوتی ہے کہ وہ متحد ہو کر استبداد اور مطلق العنانی کا خاتمہ کر دیں۔ اس لئے چھوٹی اقوام ہمیشہ سیاسی آزادی کا گہوارہ رہی ہیں اور یہ حقیقت کہ ان میں سے اکثر اقوام بڑی ہو کر آزادی سے محروم ہو گئیں اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی آزادی ان کے عوام کے کردار سے زیادہ ان کے چھوٹے ہونے کا نتیجہ تھی۔

دنیا کی تاریخ ایسی کوئی مثال نہیں پیش کرتی کہ ایک بڑی قوم نے طویل عرصہ تک جمہوری طرز حکومت کو برقرار رکھا ہو۔ ملک کی وسعت میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان جذبات میں بھی اضافہ ہوتا ہے جو جمہوری طرز حکومت کے لئے مہلک ہوتے ہیں۔ اور ان خوبیوں میں، جو جمہوری طرز حکومت کے لئے ممد و معاون ہوتی ہیں، اسی تناسب سے اضافہ نہیں ہوتا۔ ریاستوں کے اقتدار میں اضافہ کے ساتھ شہریوں کی امنگیں بھی بڑھتی ہیں۔ مقاصد کی اہمیت کے ساتھ ساتھ سیاسی جماعتوں کی قوت بڑھتی ہے اور ملک کی محبت، جو ان تباہ کن رجحانات کی روک تھام کر سکتی ہے۔ بڑے ملکوں میں چھوٹے ملکوں کے بہ نسبت کم ہوتی ہے بڑی بڑی ریاستوں میں اس بات کا امکان زیادہ رہتا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جائے۔ بڑے بڑے شہر آباد ہوں۔ اخلاق کے اقدار کمزور ہوں خود غرضی اور نفس پرستی کا دور دورہ ہو۔ ان ملکوں میں جہاں شاہی ہے اس قسم کی برائیاں ملک کے وجود کو خطرہ میں نہیں ڈالتیں۔ شخصی حکومتوں کے تحت حکومت کو خاص قسم کے اختیارات حاصل رہتے ہیں۔ ایسی حکومت لوگوں کو

استعمال تو کرتی ہے لیکن ان پر انحصار نہیں کرتی اور لوگوں کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی فرمانروا اسی نسبت سے طاقتور ہوگا۔ اس کے برعکس جمہوری حکومتوں میں ان برائیوں کے خلاف حکومت کو جو حمایت حاصل ہے۔ وہ اکثریت کی حمایت ہوتی ہے۔ مگر بڑی جمہوریتوں میں اکثریت کی حمایت بھی چھوٹی جمہوریتوں کی نسبت سے زیادہ نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ برائیوں کے حملہ آور ہونے کے لئے مختلف دروازے کھلے رہتے ہیں۔ لیکن ان کی مزاحمت کے ذرائع کمزور رہتے ہیں۔

یہ بات اصول کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے کہ وسیع مملکتیں عوام کی آزادی اور بہبود کے لئے زیادہ نقصان دہ ہوتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود بڑی ریاستوں کے بعض فوائد بھی ہیں جنہیں تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ چونکہ بڑی ریاستوں میں اختیار و قوت کی خواہش لوگوں میں زیادہ ہوتی ہے۔ اس بنا پر بعض لوگوں میں بڑا بننے کی خواہش زیادہ ہوتی ہے۔ وہ ایک بڑی قوم سے دادِ تحسین حاصل کرنے کے لئے ہر نوع کی تکلیف اور محنت برداشت کرنے پر آمادہ رہتے ہیں اگر ہم یہ تحقیق کریں کہ انسانی علم اور تہذیب کی ترقی میں چھوٹی اقوام کی بہ نسبت بڑی قوموں نے کیوں زیادہ حصّہ لیا تو اندازہ ہو سکے گا کہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بڑے ملکوں میں تصورات تیز رفتار کے ساتھ پھیلتے ہیں اور خاص طور پر ان بڑے شہروں میں جو انسانی ذہانت کا گہوارہ رہے ہیں۔ ایک اور بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ اہم سائنسی دریافتوں نے یہ ضرور بتا دیا کہ بااختیار قومی ادارہ اسے استعمال میں لائے اور یہ بات چھوٹی ریاستوں میں ممکن نہیں۔

امن کے زمانہ میں، چھوٹی قوموں میں عام بہبود زیادہ اور مکمل ہوتی ہے لیکن زمانہ جنگ میں ان کے زیادہ نقصان اٹھانے کا امکان رہتا ہے۔

لیکن اس معاملہ میں بھی، دیگر امور کی طرح، فیصلہ کن اہمیت ضرورت کو حاصل

ہے - اگر دنیا میں صرف چھوٹی قومیں ہی آباد ہوتیں تو یقیناً آج دنیا زیادہ خوش حال اور پُرامن ہوتی - لیکن بڑی اقوام کا وجود ناگزیر ہے -

سیاسی طاقت اس طرح قومی خوش حالی کی ایک شرط بن جاتی ہے اس سے مملکت کو فائدہ ضرور پہنچتا ہے - لیکن یہ فائدہ دوامی اور مستقل نہیں رہتا - چھوٹی قومیں ہمیشہ ایک مصیبت میں مبتلا رہتی ہیں - اس لئے نہیں کہ وہ چھوٹی ہوتی ہیں - بلکہ وہ کمزور بھی ہوتی ہیں - اور بڑی قومیں خوشحال اور متمول ہوتی ہیں اور اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بڑی ہوتی ہیں بلکہ طاقتور - غرض یہ ہے کہ طبعی طاقت خوشحالی کے لئے شرط اولین کی حیثیت رکھتی ہے - خواہ اس کا تعلق فرد سے ہو یا قوم سے ہو - چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی خاص حالات مانع نہ ہوں تو چھوٹی اقوام بالآخر یا تو بذریعہ طاقت یا خود اپنی مرضی سے بڑی قوم سے متحد ہو جاتی ہیں -

وفاقی طرز حکومت کے معرض وجود میں لانے کی غرض و غایت یہ تھی کہ ان تمام فوائد کو یکجا کیا جائے جو کسی قوم کے چھوٹے اور بڑے ہونے سے حاصل ہوتے ہیں اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ پر ایک نظر ڈالنے سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس سے کیا فوائد حاصل کئے -

دنیا کی مرکزیت کی حامل بڑی قوموں میں قانون ساز' قوانین میں ایک یکسانیت پیدا کرنے پر مجبور رہتا ہے - جو عام طور پر مختلف علاقوں کے رسوم اور مفادات کے ہم آہنگ نہیں ہوتے - کیونکہ قانون ساز خاص صورتوں کو پیش نظر نہیں رکھتا وہ صرف عام اصولوں کے تحت آگے بڑھ سکتا ہے اور لوگ اس بات پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ قانون کی ضرورتوں کے آگے سر تسلیم خم کریں - کیونکہ قانون خود اپنے آپ کو عوام اور ان کے رسوم کی ضروریات سے ہم آہنگ نہیں کر سکتا اور یہ بات مختلف برائیوں اور مصائب کی جڑ ہے - یہ صورتِ حال وفاق میں نہیں رہتی - کانگرس تو قومی حکومت

کے عام اصول وضع کرتی ہے اور انتظامی امور کی تمام جزئیات صوبائی یا علاقائی قانون ساز اداروں کے لئے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ اقتدار اعلیٰ کی یہ تقسیم ہر ریاست کے بہبود پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی آبادیوں اور ریاستوں میں جو کبھی بھی طاقت کی حرص و ہوس یا حفاظت خود اختیاری کے فکر میں غلطاں نہیں رہتے، تمام سرکاری اختیارات اور انفرادی کوششیں بہبود عامہ کے لئے وقف کر دی جاتی ہیں۔ ہر ریاست کی مرکزی حکومت شہریوں کی روزمرہ کی ضروریات سے آگاہ اور باخبر رہتی ہے۔ شہریوں کی بھلائی کے لئے ہر سال نئے نئے منصوبے منظور کئے جاتے ہیں۔ جن پر بلدیاتی جلسوں یا ریاستی قانون ساز ادارہ میں بحث ہوتی ہے اور پھر اخبارات اور دیگر وسائل کے ذریعہ عوام تک پہنچائی جاتی ہے تاکہ لوگوں میں اپنے معاملات سے دلچسپی اور حالات کو بہتر بنانے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ امریکی جمہوریوں میں ترقی کا جذبہ ہر وقت کارفرما رہتا ہے اور وہ اس جذبۂ ترقی سے اپنے امن و سکون کو متاثر نہیں ہونے دیتے۔ اقتدار کی خواہش کی جگہ عام ترقی کی خواہش لیتی ہے۔ اس نئی دنیا میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جمہوری طرز حکومت کے وجود اور دوام کا انحصار وفاقی طرز حکومت کے وجود پر ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امریکہ میں نئی جمہوری طرز حکومت کا مذاق اور عادات ابتداً بلدی مجالس اور صوبائی اسمبلیوں کے ذریعہ پیدا ہوئے۔ ہر امریکی اپنی چھوٹی سی ریاست سے وابستگی اور محبت کو بالآخر امریکی یونین کو منتقل کرتا ہے امریکی یونین کی مدافعت کرتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دراصل اپنی نئی ریاست اور ضلع کا دفاع کر رہا ہے۔

کسی قوم کی زندگی میں سب سے بڑا واقعہ جنگ کا رونما ہونا ہے۔ جنگ میں عوام دشمن کے خلاف ایک فرد کے طور پر عمل کرتے ہیں۔ جہاں تک ملک کے اندرونی امن

کی حفاظت کا تعلق ہے۔ اس کے لئے کسی حکومت کی قیادت، معاشرہ کا شعور اور لوگوں کی اپنے ملک سے فطری محبت کافی ہے۔ لیکن اگر کسی قوم کو جنگ لڑنی ہو تو اُسے بے شمار قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ یہ فرض کرنا کہ عوام کی ایک بڑی اکثریت اس قسم کی قربانیاں دینے کے لئے اپنے طور پر آمادہ ہوگی، بھیانک قسم کی غلطی ہے اور انسانی نفسیات سے عدم واقفیت کے مترادف ہے۔ دنیا کی وہ تمام اقوام جنہیں طویل اور خوفناک جنگیں لڑنی پڑی ہیں اپنی حکومت کی طاقت ہی میں اضافہ کرنے پر مجبور ہوئیں اور جو قومیں اس میں کامیاب نہ ہوسکیں وہ غلام بنا لی گئیں۔ طویل جنگ کی بنا پر ایک قوم اس خطرہ سے دوچار رہتی ہے کہ وہ یا تو شکست کھا کر تباہی سے دوچار ہو جائے یا کامیابی کی صورت میں مطلق العنانی کی گرفت میں آ جائے۔ جنگ حکومت کی کمزوری کو بری طرح اور خطرناک طور پر نمایاں کر دیتی ہے۔ اور میں نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وفاقی حکومت کا فطری نقص یہ ہے کہ وہ کمزور ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امریکی یونین، اپنے قوانین کی جامعیت کے باوجود کسی بڑی جنگ کے وجود سے صفحہ ہستی سے غائب کیوں نہیں ہو جاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کو کسی بڑی جنگ کا خطرہ ہی نہیں ہے۔ وہ دنیا سے الگ تھلگ ہے۔ خود ملک بے پناہ وسائل کا حامل ہے جو قوم کو دعوت عمل دیتا ہے۔ غرض یہ کہ امریکہ کے جغرافیائی محل وقوع نے اسے ایک قابل رشک موقف دے رکھا ہے چونکہ اس کا کوئی طاقتور پڑوسی ہی نہیں ہے۔ اس لئے اسے جنگ کا خطرہ بھی نہیں ہے۔

۸۔ سیاسی جماعتیں

امریکہ میں عوام قانون سازوں اور انتظامی عہدیداروں کا انتخاب کرتے ہیں اور جیوری کے ارکان بھی عوام ہی سے منتخب ہوتے ہیں جو ہر قسم کے قانون کی خلاف ورزیوں کی سزا دیتے ہیں۔ یہ ادارے نہ صرف اصولی طور پر بلکہ ہر لحاظ سے جمہوری ہیں۔ لوگ اپنے نمایندے بالراست منتخب کرتے ہیں۔ اور عموماً ہر سال نمایندوں کا انتخاب ہوتا ہے تاکہ یہ نمایندے مسلسل اپنے منتخب کرنے والوں کے محتاج رہیں۔ مختصر یہ کہ عوام ہی تمام اختیارات کا سرچشمہ ہیں، وہی رہنمائی کرتے ہیں۔ عوام کی رائے، تعصبات، مفادات، یہاں تک کہ ان کے جذبات کی راہ میں بھی کوئی ایسی مستقل رکاوٹ نہیں ہوتی جو انہیں روزمرہ کے امور پر اثر انداز ہونے سے روک سکے۔ دوسرے ملکوں ہی کی طرح امریکہ میں اکثریت 'عوام کے نام پر حکومت کرتی ہے۔ اور اکثریت' اساسی طور پر ان شہریوں پر مشتمل ہوتی ہے، جو اپنے رجحانات اور دلچسپیوں کے تحت' پُرخلوص طور پر اپنے ملک اور قوم کی ترقی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے گرد مختلف سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں، جو اپنی مسلسل ہیجان خیز تحریکوں کے ذریعہ' ان کی تائید اور حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔

یہاں مختلف جماعتوں کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے۔ بعض ممالک اس قدر بڑے ہوتے ہیں کہ ان کی مختلف آبادیاں، جو اگرچہ ایک حکومت کے تحت متحد رہتی ہیں، مختلف النوع اور متضاد قسم کے مفادات کی حامل ہوتی ہیں۔

اور نتیجتہً اس کا امکان رہتا ہے کہ وہ مستقل طور پر ایک دوسرے کے مخالف رہیں۔ ایسی صورتوں میں آبادی کے مختلف اجزا کو ایک الگ قوم تصور کرنا مناسب ہے، اگر خانہ جنگی ہو جائے تو یہ کشمکش ایک ریاست کے مختلف دھڑوں میں نہیں بلکہ دو رقیب ریاستوں کے درمیان ہوتی ہے۔ لیکن جب شہریوں میں ایسے امور پر اختلافِ رائے ہو، جن سے بحیثیتِ مجموعی سارا ملک متاثر ہوتا ہو تو ایسی صورت میں جو مختلف الرائے جماعتیں بن جائیں گی انہیں سیاسی جماعتیں کہا جائے گا۔ آزاد حکومتوں میں سیاسی جماعتیں ناگزیر برائی ہوتی ہیں۔ لیکن سیاسی جماعتیں ہمیشہ ایک ہی خصوصیات کی نہیں ہوتیں۔

امریکہ میں عظیم سیاسی جماعتیں تھیں، لیکن اب یہ باقی نہیں رہیں۔ جب جنگِ آزادی ختم ہوئی اور جب نئی حکومت کا سنگِ بنیاد رکھا جا رہا تھا تو قوم دو مکاتبِ فکر میں بٹ گئی۔ یہ دو مکاتیبِ فکر اتنے ہی قدیم تھے، جتنی کہ یہ دنیا — اور جن کا ظہور دنیا میں ہر جگہ مختلف ناموں اور مختلف شکلوں میں ہوتا ہے۔ ایک مکتبِ فکر، عوام کی حاکمیت پر تحدید عاید کرنا چاہتا ہے تو دوسرا اس کا دائرہ کار غیر محدود پیمانہ پر وسیع کرنا چاہتا ہے۔ امریکہ میں ان دونوں مکاتیبِ فکر میں ایسا زبردست تصادم رونما نہیں ہوا۔ جیسا کہ دنیا کے اکثر ملکوں میں ہو چکا ہے۔ امریکہ کی دونوں سیاسی جماعتیں اس اہم نکتہ پر متحد تھیں کہ ان میں سے کوئی ملک کے قدیم آئین کو تباہ نہیں کرے گی اور اپنی کامیابی کے لیے معاشرہ کا تختہ نہ الٹے گی۔ اس طرح دونوں جماعتوں میں، ذاتی مفادات ان کی کامیابی یا ناکامی سے وابستہ نہ تھے اور وابستگی صرف اعلیٰ اخلاقی اصول سے تھی۔ مثلاً مساوات اور آزادی سے محبت۔

جو سیاسی جماعت عوام کے اختیارات کو محدود کرنے کی خواہاں تھی، اس

نے اپنے نظریات کا اطلاق' امریکی آئین پر کرنے کی کوشش کی' اور اس نے اپنے آپ کو فیڈرل (وفاقی) سے موسوم کیا۔ دوسری جماعت جس نے اپنے آپ کو حریت کے مفاد سے وابستہ کر دیا اپنے آپ کو ری پبلکن کہلانا پسند کیا۔ امریکہ' جمہوریت کی سرزمین ہے اور اس لئے وفاقی ہمیشہ اقلیت میں رہے۔ لیکن ان کی صف میں امریکہ کی وہ عظیم المرتبت شخصیتیں شامل رہیں جو امریکہ کی جنگِ آزادی کی پیداوار تھیں اور اس بنا پر اس جماعت کی اخلاقی طاقت ہمیشہ بے حد زیادہ رہی۔ حالات نے بھی ان کے مسلک کی تائید کی۔ پہلی کانفیڈریشن کی تباہی نے لوگوں کو آزادیت سے خوفزدہ کر رکھا تھا اور فیڈرلیشنوں نے عوام کے اس عبوری دور کے خوف و خدشات سے بے حد فائدہ اٹھایا۔ دس یا بارہ سال تک وہ ملک پر حکمران رہے اور اس دوران میں انہوں نے اپنے بعض اصولوں کا اطلاق بھی کیا۔ پورے طور پر وہ اپنے نظریات کو عملی جامہ اس لئے نہ پہنا سکے کہ مخالف رجحانات بتدریج طاقتور ہو رہے تھے۔ اور ان کو روکنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں ری پبلکن حکومت پر قابض ہوئے۔ اور تھامس جیفرسن صدر منتخب ہوا جیفرسن نے اپنے عظیم نام اور شخصیت' اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور مقبولیت سے اپنی جماعت کے اثر و رسوخ میں اضافہ کیا۔

فیڈرلیشنوں نے جن ذرائع سے اپنا اثر قائم کیا تھا وہ مصنوعی تھے۔ اور ان کے وسائل عارضی نوعیت کے تھے۔ وہ اپنے لیڈروں کی قابلیت اور صلاحیتوں اور حالات کے سازگار ہونے کی وجہ سے حکومت کی باگ ڈور پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ لیکن جب ری پبلکنوں نے ان کی جگہ حاصل کی تو ان کے مخالفوں کو زبردست شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

ملک کی ایک بڑی اکثریت نے شکست خوردہ جماعت سے بیزاری کا اظہار کیا اور فیڈرلسٹوں کی اقلیت اس قدر حقیر ہوئی کہ وہ مستقبل میں کسی کامیابی سے مایوس ہو گئے۔ اس کے بعد ری پبلکن یا ڈیموکریٹک پارٹی مسلسل کامیابیوں سے ہمکنار ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے سارے ملک میں برتری حاصل کر لی۔ فیڈرسٹ، یہ تصور کرتے ہوئے کہ وہ وسائل کے بغیر تباہ ہو جائیں گے اور ساری قوم سے الگ تھلگ ہو جائیں گے، دو حصّوں میں بٹ گئے۔ ایک حصہ تو فتح یاب ری پبلکن پارٹی میں ضم ہو گیا اور دوسرے نے اپنی پرانی جماعت ترک کر کے نیا نام اختیار کر لیا۔ ایک علیحدہ جماعت کے طور پر ان کا وجود ختم ہوئے زمانہ بیت چکا ہے۔

میری رائے میں، امریکن یونین کے قیام کے ساتھ ہی فیڈرلسٹوں کا برسراقتدار آنا، امریکہ کے لئے خوش نصیبی کا سبب بنا۔ انہوں نے اپنے ملک کے اس زمانے کے ناگزیر رجحانات کی مزاحمت کی۔ یہ سوال خارج از بحث ہے۔ کہ ان کے نظریات اچھے تھے یا برے۔ لیکن ان میں یہ نقص تھا کہ وہ ناقابل عمل تھے۔ اور جو واقعات جیفرسن کے زمانے میں رونما ہوئے وہ جلد یا بدیر یقینی تھے۔ لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ فیڈرلسٹوں کی حکومت نے نئی جمہوریہ کو استحکام حاصل کرنے کی مہلت دی اور بعد ازاں ان نظریات کے تیز تر فروغ میں مدد دی۔ جن کی انہوں نے اپنے عہد میں مخالفت کی تھی۔ علاوہ ازیں ان کے نظریات کے ایک بڑے حصے کو، خود ان کے سیاسی مخالفوں نے اپنے سیاسی نظریات میں شامل کر لیا۔ وہ وفاقی آئین، جو اس وقت رائج ہے ان کے حب وطن اور دانشمندی کا جیتا جاگتا، دائمی ثبوت ہے۔

عہدِ حاضر میں عظیم سیاسی جماعتیں موجود نہیں ہیں۔ اور ان عظیم پارٹیوں کی عدم موجودگی میں رائے عامہ جزئیات کے بارے میں مختلف مکاتیب فکر میں بٹی ہوئی ہے۔ بڑی پارٹیوں کے قیام کے لئے جو جدوجہد اور محنت کرنی پڑتی ہے۔ وہ ناقابلِ قیاس ہے۔ اور عہدِ حاضر میں آسان کام نہیں ہے۔ امریکہ میں مذہبی منافرت کا فقدان ہے۔ کیونکہ وہاں ہر مذہب کا احترام کیا جاتا ہے۔ اور کسی ایک خاص فرقہ کو غلبہ حاصل نہیں۔ مراتب اور درجہ بندیاں لوگوں میں رشک و رقابت کے جذبات پیدا نہیں کرتے۔ کیونکہ وہاں لوگوں کو تمام اختیارات حاصل ہیں۔ اور کوئی شخص ان کے اختیارات پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ علاوہ ازیں امریکہ میں مفلوک الحالی اور غربت نہیں ہے کہ اسے اشتعال انگیزی کا سبب بنایا جائے۔ ملک کی جغرافیائی اور طبعی صورتِ حال ایسی ہے کہ محنت و صنعت کے لئے وسیع میدان کھلا ہے۔ اور ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ کارہائے نمایاں انجام دے سکے۔ مگر اس کے باوجود حوصلہ مند لوگ سیاسی جماعتیں قائم کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ با اقتدار اشخاص کو ان کے مقام سے محض اس لئے ہٹایا نہیں جاسکتا کہ ان کی جگہ کے لئے دوسرے اشخاص بھی آرزومند ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے قیام کے لئے اداکاروں کے سے جوہر کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ امریکہ میں ایک سیاسی طالع آزما پہلے اپنے مفادات کو متعین کرتا ہے اور اس کے بعد دوسروں کے ایسے مفادات کو ڈھونڈتا ہے جو اپنے مفاد کے گرد اکٹھے کئے جاسکتے ہیں اور جن کو اپنے مفادات میں ضم کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد وہ کسی ایسے اصول یا نظریہ کو وضع کرنے کی کوشش کرتا ہے جو نئی سیاسی جماعت کی ضروریات کے لئے موزوں ہوں

اور وہ ان اصولوں کو اپناتا ہے تاکہ اپنی جماعت کو ترقی دے اور اس کی مقبولیت میں اضافہ کرے۔

ایک اجنبی کے لیے امریکہ کے اندرونی اختلافات اور تنازعے بنظر ظاہر ناقابلِ فہم اور طفلانہ معلوم ہوتے ہیں اور وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ ان لوگوں سے ہمدردی کرے جو معمولی امور کو اس قدر سنجیدگی سے موضوع بحث بناتے ہیں اور یا اس معاشرہ کی خوشحالی پر رشک کرے جس نے انہیں ایسی باتوں پر بحث میں وقت ضائع کرنے کے لئے موقع دیا ہے۔ لیکن جب وہ امریکی زندگی کے ایسے خفیہ رجحانات کا مطالعہ کرتا۔ وہ اس بات کا اندازہ کر لیتا ہے کہ ان میں سے اکثر و بیشتر دو مکاتیب کے آئینہ دار ہیں یا ان سے متعلق ہیں جو آزاد معاشروں میں ازل سے پائے جاتے ہیں۔ ان سیاسی جماعتوں کا جس قدر گہرا مطالعہ کریں یہ بات واضح سے واضح تر ہوتی جائے گی کہ ایک جماعت کا مقصد عوام کے اختیار کو کم کرنا اور دوسرے کا مقصد وسیع تر کرنا ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایسے ملکوں میں جہاں مختلف مکاتب فکر موجود ہوں وہاں جماعتوں میں توازن باقی نہیں رہتا اور ان میں سے ایک جماعت ناقابل مزاحمت غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ تمام رکاوٹوں پر قابو پالیتی ہے اپنے مخالفوں کو ختم کر دیتی ہے اور معاشرہ کے تمام وسائل پر خود قابض ہو جاتی ہے شکست خوردہ جماعتیں مایوسی اور نا امیدی کا شکار ہو کر گوشہ گمنامی میں چلی جاتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوم پر صرف ایک ہی نظریہ کی حکمرانی ہے اور ایک ہمہ گیر خاموشی طاری رہتی ہے۔ غالب جماعت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس نے ملک میں امن، اور ہم آہنگی بحال کی ہے۔ لیکن اس خاموش ہم آہنگی کے پیچھے گہرے اختلافات کا ایک سمندر موجزن رہتا ہے اور حقیقی مخالفت

موجود رہتی ہے۔

اور یہی امریکہ میں ہوا ہے۔ جب ڈیموکریٹک پارٹی برسر اقتدار آئی ہے تو اس نے سارے ملک کے سارے امور کی کامل اجارہ داری حاصل کر لی اور اس کے بعد ملک کے تمام قوانین اور رسوم اس جماعت کی پسند و ناپسند کے مطابق بنتے اور بگڑتے رہے۔ اس وقت ملک کے سیاسی امور میں معاشرہ کے زیادہ ذہین طبقہ کا کوئی اثر نہیں ہے، اور تموّل' عدم مقبولیت کا ایک بڑا سبب ہے۔ مالدار لوگ طوعاً و کرہاً اپنے غریب ہم وطنوں کو اختیارات سپرد کر کے اپنی حالت پر قناعت کرنے پر مجبور ہیں۔ چونکہ نجی زندگی میں انہیں جو مقام حاصل ہے۔ وہ مقام انہیں پبلک زندگی میں حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے وہ پبلک زندگی میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی خواہش ہی ترک کر دیتے ہیں۔ اور معاشرہ میں ایک الگ تھلگ گروہ بن جاتے ہیں جن کی اپنی دلچسپیاں اور اپنا مذاق الگ ہوتا ہے۔ وہ حالات کے آگے مجبوراً سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اس بات کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ اس کے ساتھ ہی اس صورتِ حال سے بیزاری کا اظہار بھی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس بسا اوقات وہ جمہوری حکومت اور جمہوری اداروں کے فوائد کے ثنا خواں نظر آتے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی میں دشمن سے نفرت کے اظہار کا یارا نہ ہو۔ تو وہ دشمن کی خوشامد پر اتر آتا ہے۔

لیکن اس مصنوعی جوش و خروش کی تہ میں متمول طبقہ ہمیشہ جمہوری اداروں سے متنفر رہا ہے۔ عوام ایک ایسی طاقت ہوتے ہیں جس سے متمول طبقہ بہ یک وقت نفرت کرتا ہے اور ڈرتا ہے۔ اگر جمہوری طرزِ حکومت کی بدانتظامی کی وجہ سے امریکہ میں کبھی ایک انقلابی بحران

آیا اور شخصی اداروں کا قیام امریکہ میں کبھی عملی طور پر ممکن ہو سکا تو میرے نظریات کی حقیقت ثابت ہو سکے گی۔

امریکہ کی سیاسی جماعتیں اپنے مقاصد میں کامیابی کے لئے جو دو اہم ہتھیار استعمال کرتی ہیں ایک اخبارات اور دوسرا عوامی انجمنیں۔

۹۔ امریکہ میں آزادیٔ صحافت

امریکہ میں آزادیٔ صحافت کے اثر کا دائرہ نہ صرف سیاسی رائے عامہ پر محیط ہے۔ بلکہ عوام کی ہر قسم کی آرا، رسوم و قوانین کی تشکیل پر اثر انداز ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس آزادیٔ صحافت سے اس قدر گہرے اور مکمل طور پر وابستہ نہیں ہوں جو ایسی چیزوں کے بارے میں جوش و خروش کے اظہار کا باعث ہوتی ہے اور جو بہ اعتبارِ نوعیت اچھی ہوتی ہے۔ میں آزادیٔ صحافت کا مدح خواں اس کے فوائد سے زیادہ، اس کی اس خصوصیت کی بنا پر ہوں کہ یہ مختلف برائیوں کو روکتی ہے۔ اگر کوئی شخص مکمل آزادی اور رائے عامہ کی مکمل غلامی میں سے کوئی درمیانی لیکن قرینِ عقل صورت کی نشاندہی کرے تو شاید میں اسے قبول کر لوں۔ لیکن اس قسم کی درمیانی صورت معلوم کرنا بے حد مشکل کام ہے صحافت کی بے راہ روی، بے لگامی کی اصلاح کے لیے، اور مہذب الفاظ کے استعمال کو بحال کرنے کے لیے، اولاً ملزم کو جیوری کے سامنے مقدمہ کے لیے پیش کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر جیوری ملزم کو بری کر دے تو وہ رائے، جو اس سے پہلے ایک فرد کی ذاتی رائے تھی سارے ملک کی رائے بن جاتی ہے۔ اس مسئلہ کا اور تفصیلی طور پر مطالعہ کیجئے۔ آپ کسی خاطی کو ایک مجسٹریٹ کے سامنے پیش کریں۔ وہاں بھی فیصلہ سے قبل مجسٹریٹ کو ساری روئداد مقدمہ سننا پڑتی ہے اور ایسی باتیں، جن کے ذکر کی کتاب یا رسالہ میں جرأت نہیں کی جاسکتی، مقدمہ کی کارروائی میں زیر بحث آتی ہیں اور ایک ایسی بات جو ایک مضمون

میں صرف اشارتاً پیش کی گئی تھی۔ بے شمار مطبوعات میں بار بار چھپ کر عوام کے سامنے آجاتی ہے۔ زبان تو محض اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے اور خیالات کے لئے وہ ایک جسم کا کام دیتی ہے۔ مگر یہاں محض "خیال" ہی زیر بحث نہیں۔ عدالت، محض جسم یعنی خیالات کی مذمت کر سکتی ہے۔ لیکن ان کا مفہوم اور سپرٹ اس قدر نازک ہوتا ہے کہ وہ عدالت کی رد و قدح کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ آگے بڑھیں۔ اخبارات پر احتساب عائد کر دیجئے تو عام مقرروں سے زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سنے جائیں گے۔ اور آپ کا مقصد حل نہ ہوگا۔ اس ذریعہ تو آپ نے شرارت کی گنجائش میں اضافہ کر دیا ہے۔ طبعی طاقت کے مانند تخیل کو اپنے کارندوں کی تعداد پر انحصار نہیں کرنا پڑتا۔ اور نہ ہی ادیبوں، مصنفوں کو فوج کے سپاہیوں کی طرح گنا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اصولوں اور نظریات کی حکمرانی میں اضافہ صرف چند لوگ ہی کرتے ہیں۔ جو ان کے اظہار پر قادر ہوتے ہیں۔ ایک باعزم شخص کے الفاظ جو ایک اجتماع کے جذبات سے خطاب کرتے ہوئے ادا کئے جائیں ہزاروں مقرروں سے زیادہ باا‌ثر ہوتے ہیں اور اگر ایسے الفاظ کسی ایک جگہ بھی ادا کئے جائیں تو یہ الفاظ ملک کے ہر گاؤں میں پہنچ جائیں گے۔ اس لئے آزادی صحافت کے ساتھ ساتھ آزادیٔ تقریر کو بھی تباہ کرنا ضروری ہوگا۔ اور دونوں آزادیوں کو سلب کر کے آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ آپ کا اولین مقصد تو آزادی کے ناجائز استعمال کو روکنا تھا۔ لیکن آپ نے یہ تدابیر اختیار کر کے اپنے آپ کو مطلق العنانی کے قدموں پر ڈال دیا۔ آپ انتہائی آزادی سے انتہائی غلامی تک پہنچ گئے۔ اور درمیان میں کوئی ایسی قرین عقل اور عملی صورت

دریافت نہ کر سکے جہاں آپ رُک سکتے ہوں۔

امریکی جرائد کا جو کم اثر ہے اس کی متعدد وجوہات ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:۔

تحریر کی آزادی، دوسری آزادیوں کی طرح، بے حد طاقتور ہوتی ہے۔ بالخصوص ایسے حالات میں کہ نئی نئی ہو۔ ایسے لوگ، جن کے سامنے کبھی بھی مملکت کے مسائل پر بحث نہیں کی گئی۔ اخبار یا جریدہ میں مکمل اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ جو پہلی مرتبہ ان کے سامنے مملکت کے امور پر بحث کرتا ہے۔ امریکیوں نے امریکی نوآبادیوں کے قیام سے ہی یہ آزادی حاصل کی ہے۔ علاوہ ازیں اخبارات انسانی جذبات پیدا نہیں کر سکتے، وہ جذبات کو بھڑکا سکتے ہیں۔ امریکہ میں سیاسی زندگی میں ہمیشہ حرکت رہتی ہے۔ وہ متنوع اور اشتعال پذیر ہے۔ لیکن شاید و باید وہ ان شدید اور گہرے جذبات سے متاثر ہوتے ہیں، جو اسی صورت میں مشتعل ہوتے ہیں۔ جب کہ ان کے مادی جذبات پر ضرب پڑتی ہو۔ امریکہ میں ان مفادات کے حامل انتہائی متمول اور خوشحال ہیں۔ امریکہ اور فرانس کے اخبارات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے وہ فرق واضح ہو سکتا ہے جو دونوں ملکوں میں ہے۔ فرانس میں، تجارتی اشتہارات کے لئے اخبارات میں بہت محدود جگہ ہوتی ہے اور نہ ہی لوگوں میں خبروں کا شعور زیادہ ہے۔ اخبارات کے صفحات میں جو چیز زیادہ جگہ گھیرتی ہے۔ وہ وقت کی سیاست ہے۔ امریکہ میں جہازی سائز کے صفحات کا تین چوتھائی حصّہ اشتہاروں سے بھرا ہوتا ہے۔ اور باقی حصّہ میں سیاسی مسائل اور معمولی معمولی واقعات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اخبارات میں تلخ و ترش سیاسی بحثیں بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔

مشاہدہ نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ جس قدر کسی طاقت میں

مرکزیت ہوگی، اسی قدر وہ با اثر ہوگی۔ فرانس میں صحافت میں دوہری قسم کی مرکزیت ہے۔ سارے اخبارات ایک ہی جگہ سے نکلتے ہیں۔ اور چند ہاتھوں میں مرتکز ہیں۔ اس طرح ان اخبارات کا اثر، قوم پر بے پناہ ہے جو حکومت کے لئے ایک ایسے دشمن کے مترادف ہے۔ جس کے ساتھ وہ عارضی طور پر صلح تو کر سکتی ہے۔ لیکن طویل عرصہ تک مزاحمت نہیں کر سکتی۔

امریکہ میں اس قسم کی مرکزیتوں کا فقدان ہے۔ امریکہ میں کوئی شہر یا علاقہ دانش و عقل کے مرکز ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ دانشور طبقے اور عوام کی طاقت ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور عقل و دانش کی شعاعیں ایک مرکزی مقام سے نکل کر چاروں طرف پھیلنے کی بجائے مختلف جگہوں سے نکل کر ایک دوسرے کو آر پار کرتی ہیں۔ امریکہ میں کسی جگہ رائے عامہ کی رہنمائی اور مرکزیت پیدا کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ مقامی حالات کے تحت اختلاف ضرور ملتا ہے۔ لیکن یہ حالات کی پیداوار ہے۔ نہ کہ کسی انسانی طاقت کی، اور اس کی وجہ یہ کہ یونین کے قوانین کے تحت طابعوں اور ناشروں کو اجازت نامے لینے کی ضرورت نہیں۔ اور نہ ایڈیٹروں کو ضمانت داخل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ امریکہ میں اخبار جاری کرنے سے زیادہ کوئی اور کام آسان نہیں ہے۔ چند لوگ بھی اگر سرپرستی کریں تو اخبار آسانی سے چل سکتا ہے۔

چنانچہ امریکہ میں جرائد اور رسائل کی تعداد ناقابل یقین حد تک زیادہ ہے۔ امریکہ کے ذہین ترین افراد، امریکی عوام پر صحافت کے اثر کے اس فقدان کی وجہ صحافت کی طاقت کے پھیلاؤ کو گردانتے ہیں۔ اور امریکہ میں یہ ایک سیاسی مقولہ ہے عوامی جریدوں کے اثر کو کم کرنے کا واحد ذریعہ یہی ہے کہ ان کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے۔

امریکہ میں شاید ہی کوئی گاؤں یا قریہ ایسا ہوگا جس کا اپنا اخبار نہ ہو۔ امریکہ کے تمام سیاسی جرائد حکومت کی مخالفت یا موافقت میں صف آرا ہیں۔ لیکن وہ حکومت کی حمایت بھی ہزارہا طریقوں سے کرتے ہیں۔ اخبارات کی اس تقسیم کا اثر مختلف نتائج پیدا کرتا ہے۔ اخبارات کے اجرا میں آسانی نے مختلف اخبارات کو جنم دیا ہے۔ مگر چونکہ تجارتی مسابقت کی وجہ سے اخبارات زیادہ نفع نہیں کما سکتے۔ اس لئے زیادہ صلاحیت کے حامل لوگ اخباری کاروبار میں نہیں داخل ہوتے۔ عام جرائد کی اس قدر بہتات ہے کہ اگر وہ منافع بخش بھی ہوتے تو ملک میں اس قدر لکھنے والے نہیں ہیں کہ انہیں چلا سکیں۔ امریکہ میں صحافیوں کی حالت اس لئے زیادہ بہتر نہیں۔ ان کی تعلیم یوں ہی سی ہوتی ہے اور ذہنی صلاحیتیں محدود۔ عوام کی خواہش ہی سب سے بڑا قانون ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے چند عادات اور رسوم قائم ہو گئے ہیں۔ جن کی پابندی سب پر ضروری ہے۔ اور یہی مشترکہ عادات ہر طبقہ کا گروہی جذبہ کہلاتا ہے۔

فرانسیسی صحافیوں کی طبقاتی خصوصیت یہ ہے کہ وہ مملکت کے امور پر پرجوش انداز میں، مگر عالمانہ اور مفید آدرشوں کو پیش نظر رکھ کر بحث کرتے ہیں۔ امریکی صحافیوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قاری کے جذبات سے نہایت بے ڈھنگے اور عامیانہ انداز میں اپیل کرتے ہیں، وہ افراد کے کردار پر حملہ کرنے میں بلند اصولوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں اور ان کی نجی زندگی کے ہر گوشہ کی چھان بین کر کے ان کے نقائص اور کمزوریوں کو اچھالنے سے بھی پرہیز نہیں کرتے۔

اگرچہ امریکہ میں ایسے اخبارات درسائل محدود ہیں لیکن ان کا اثر بے پناہ ہے۔ امریکہ جیسے طویل وعریض ملک میں وہ سیاسی زندگی میں حرکت قائم رکھتے ہیں۔ ان کی آنکھیں خفیہ سیاسی عزائم کا پتہ چلانے کی تاک میں لگی رہتی ہیں اور

وہ سیاسی لیڈروں کو رائے عامہ کی عدالت میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ یہ عوامی مفادات کو چند اصولوں کے گرد اکٹھا کرتے ہیں اور ہر سیاسی جماعت کے مسلک کو واضح کرتے ہیں۔ جب متعدد اخبارات ایک ہی طرز بحث اختیار کرتے ہیں۔ تو بالآخر وہ ناقابل مزاحمت ہو جاتے ہیں۔ اور رائے عامہ، جس پر صرف ایک سمت سے حملہ ہوتا ہے۔ بالآخر ان اخبارات کی رائے کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہے۔ امریکہ میں انفرادی طور پر ہر اخبار کا اثر کم ہوتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر تمام اخبارات کی طاقت، عوام کی طاقت کے بعد دوسرے ہی درجہ پر ہے۔

۱۰۔ امریکہ میں سیاسی انجمنیں

دنیا کے کسی ملک میں انجمن سازی کے اصولوں کو اتنے وسیع پیمانہ پہ اور اتنی ہی کامیابی سے اپنایا نہیں گیا جتنا کہ امریکہ میں۔ قانون کے تحت قائم ہونے والی بے شمار مستقل انجمنوں کے علاوہ ۔ جو بلدیات، فرموں اور شہریوں کے نام پر قائم کی گئی ہیں۔ بے شمار انجمنیں ایسی ہیں جنہیں نجی طور پر افراد قائم کرتے ہیں اور چلاتے ہیں۔

امریکی شہری کو عہد طفولیت سے اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ وہ زندگی کی برائیوں اور مصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے قوتِ بازو پر انحصار کرے۔ وہ کسی با اختیار حاکم کی مدد کا اسی وقت طلبگار ہوتا ہے جب وہ خود اپنے آپ میں کسی کام کو سرانجام دینے کی سکت نہیں پاتا۔ امریکی شہری میں اس عادت کی بنیاد سکول کے زمانے میں ہی پڑ جاتی ہے۔ جہاں وہ کھیل کود میں ان اصولوں کی پابندی کرتا ہے۔ جنہیں وہ خود وضع کرتا ہے۔ سماجی زندگی میں یہی رجحان حاوی رہتا ہے۔ اگر کسی شاہراہ میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے اور گاڑیوں کی آمد و رفت رک جائے تو سارے پڑوسی فوراً ایک جماعت کو تشکیل دے لیں گے اور اس طرح فوری طور پہ معرض وجود میں آنے والی انجمن اپنے اختیارات عملی طور پہ استعمال کرتے ہوئے اس کی اصلاح کر لے گی۔ اگر عام جشن منانا مقصود ہو تو اس کے اہتمام کے لئے ایک انجمن بنائی جاتی ہے۔ اخلاقی برائیوں کی روک تھام کے لئے انجمنیں بنتی ہیں۔

حفاظت عامہ، تجارت، صنعت، مذہب اور اخلاق کو فروغ دینے کے لئے بیشمار انجمنیں بنتی رہتی ہیں۔

کسی انجمن کی تشکیل کے لئے صرف عوامی تائید کی ضرورت ہوتی ہے جس میں چند افراد ایک خاص نظریہ پر اتفاق کرتے ہیں۔ اور اس نظریہ کو فروغ دینے کے لئے بعض طریقوں کے اختیار کرنے کا معاہدہ کرتے ہیں اس قسم کی انجمن سازی کا حق عام ہے اور اخبارات کے اجراء ہی کی طرح ان کے قیام کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن اس طرح جو انجمنیں معرض وجود میں آتی ہیں۔ وہ اخبارات سے زیادہ با اختیار اور موثر ہوتی ہیں۔ جب کوئی انجمن کسی مسئلہ پر ایک رائے ظاہر کرتی ہے تو وہ ایک واضح شکل اختیار کرتی ہے۔ انجمن اس رائے کے حامیوں کی تعداد معلوم کرتی ہے اور اس غرض کے لئے سب میں ایک اتحاد اور مصالحت پیدا کرتی ہے۔ ارکان ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور تعداد میں اضافہ کے ساتھ ان کے جوش وخروش میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ انجمن مختلف لوگوں کی انفرادی مساعی کو مجتمع کرتی ہے۔ اور ایک مقصد کے حصول کے لئے سب کی مساعی کو روبکار لاتی ہے۔

انجمنوں کے حق کے استعمال کے سلسلے میں باعتبار اہمیت دوسرا درجہ عام جلسوں کو حاصل ہے۔ جب کسی انجمن کو ملک کے اہم اور مختلف مقامات میں اپنے مراکزِ عمل قائم کرنے کی اجازت ہوتی ہے تو اس کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس کا دائرہ اثر وسیع ہوتا جاتا ہے۔ مختلف علاقہ کے لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ اجتماعی فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کی مساعی کو متحد کیا جاتا ہے۔ اور انتہائی جوش وخروش

کے ساتھ آرا کا اظہار کیا جاتا ہے جو مطبوعہ الفاظ کے ذریعہ ممکن نہیں اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ ایک رائے کے حامی اپنے آپ کو انتخابی جماعتوں میں تشکیل دیتے ہیں اور مرکزی اسمبلی میں اپنی نمایندگی کے لئے مندوبین کا انتخاب کرتے ہیں اور اس طرح وہ نمایندگی کے نظام کا اطلاق انجمن بندی میں کرتے ہیں۔

اس طرح پہلے مرحلہ پر ایک نقطہ نظر کے حامی افراد انجمن بناتے ہیں۔ اور انجمن ان کے لئے ذہنی نوعیت کے اتحاد کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ دوسری صورت میں، چھوٹی اسمبلیاں بنائی جاتی ہیں، جو کسی پارٹی کا ایک عشر عشیر بھی نہیں ہوتیں۔ اور تیسری صورت میں انجمنوں کی حیثیت، قوم کے اندر ایک الگ قوم اور حکومت کے اندر ایک الگ حکومت کی ہوتی ہے۔ ان کے مندوب، اکثریت کے حقیقی مندوبین ہی کی طرح انجمن کی اجتماعی طاقت کی نمایندگی کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انہیں قانون سازی کا اختیار نہیں، لیکن وہ برسر اقتدار لوگوں کی امداد کر سکتے ہیں اور وہ ایسے قوانین کا مسودہ تیار کر سکتے ہیں جو ان کی نظر میں وضع کئے جانے کے قابل ہیں۔

ایسی اقوام میں جو حقوقِ آزادی کے استعمال کی اچھی طرح عادی نہ ہوں یا جن کے سیاسی جذبات بہت جلد برانگیختہ کئے جا سکتے ہوں انجمن سازی کے یہ حقوق امن عامہ کو خطرہ میں ڈال سکتے ہیں۔

لیکن اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انجمن سازی کی غیر محدود آزادی نے امریکہ میں اب تک کوئی مضر اثرات پیدا نہیں کئے۔ انجمن سازی کا حق امریکہ میں انگلستان سے درآمد کیا گیا اور ابتدا سے ہی امریکہ میں موجود ہے۔ اب یہ عوام کے عادات اور رسوم کا ایک لازمی جزو بن گیا۔ اکثریت کے امکانی استبداد کے خلاف انجمن سازی کی یہ آزادی ایک موثر ضمانت

کا کام دیتی ہے۔ امریکہ میں کوئی جماعت جب غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو سارا اقتدار اس کے ہاتھوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اس کے حامی اہم عہدوں پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اور انتظامیہ کے تمام وسائل ان کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ چونکہ مخالف جماعت کے ممتاز ترین ارکان بھی اس رکاوٹ کو ہٹا نہیں سکتے جو ان کی اور اقتدار کی راہ میں حائل ہے۔ اس لئے انہیں اپنی قابلیت کا سکہ اقتدار سے باہر رہ کر منوانا پڑتا ہے۔ اور اس اقلیت کی پوری مخالفت کرنا پڑتی ہے جو ان پر حکمران ہے۔ اور اس طرح ایک خطرناک تدبیر کو خطرناک تر خطرہ کے مقابلہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

امریکی جمہوریتوں کے لئے اکثریت کی مطلق حاکمیت، میرے نقطہ نظر سے اس قدر خطرناک ہے کہ اس کی روک تھام کے لئے جو خطرناک ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں، وہ نقصان دہ ہونے کے بجائے مفید ہیں اور اس سلسلے میں میں قاری کو ان خیالات کی یاددہانی کرانا چاہتا ہوں جن کا اظہار میں نے بلدیات کی آزادی پر بحث کرتے ہوئے کیا تھا۔

جمہوری ملکوں میں استبداد اور مطلق العنانی کو روکنے کے لئے انجمنوں کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ شخصی حکومتوں یا اشرافیہ کے تحت امرا اور متمول لوگوں کا طبقہ فطری طور پر انجمنوں کا کام کرتا ہے اور اخبارات کے ناجائز استعمال کی روک تھام کرتا ہے۔ ایسے ملکوں میں جہاں اس قسم کی انجمنیں نہ ہوں اگر افراد مصنوعی اور عارضی طور پر اس کا بدل تلاش نہ کریں تو پھر شدید ترین ایذا رساں استبداد سے حفاظت ممکن نہیں اور اس کا امکان رہتا ہے کہ چند طاقتور افراد کے ایک دھڑے کا ایک ہی فرد لوگوں کو اپنے استبداد اور ظلم کا نشانہ بنائے۔

یہ درست ہے کہ سیاسی اغراض کے لئے انجمن سازی ایک ایسا حق ہے جس کا مناسب استعمال ایک قوم طویل تجربے کے بعد ہی سیکھتی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انجمن سازی کا حق ملک کو ایک اور خطرہ سے محفوظ رکھتا ہے جن ملکوں میں انجمن سازی کے حق پر کوئی پابندی نہیں ہے وہاں خفیہ انجمنیں نہیں ہیں۔ امریکہ میں دھڑے اور گروہ تو ہیں لیکن سازشیں نہیں ہیں۔

انسان کی اپنی آزادی عمل کے بعد، جو دوسرا فطری حق ہے وہ اپنے ہم جلیسوں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کا حق ہے۔ اس طرح انجمن سازی کا حق بھی انفرادی آزادی ہی کی طرح ناقابل تنسیخ اور فطری ہے۔ کوئی قانون ساز معاشرہ کی بنیادوں کو نقصان پہنچائے بغیر اس حق کو چھین نہیں سکتا۔ مگر اس کے باوجود یہ حق اگر بعض قوموں کے لئے خوشحالی اور فائدوں کا سرچشمہ ہے تو اس کا یہ بھی امکان ہے کہ دوسری قوموں میں اسی حق کو اس کے انتہا پر پہنچا کر ناجائز استعمال کیا جائے اور یہ سرچشمہ زندگی بننے کی بجائے تباہی کا باعث بن جائے۔

یورپ میں اکثر لوگ انجمن کو ایک ہتھیار کی طرح سمجھتے ہیں۔ جسے وہ جلد سے جلد تیار کر کے کسی تنازعہ میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن امریکہ میں انجمن سازی کا مفہوم اس سے مختلف ہے۔ امریکہ میں جو لوگ اقلیت میں ہوں وہ انجمن بناتے ہیں تاکہ اپنی عددی طاقت کا مظاہرہ کریں اور اس طرح اکثریت کی اخلاقی طاقت کو کمزور کریں۔ دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسابقت کو فروغ دیں اور اس طرح ان دلیلوں اور ذرائع کو دریافت کریں جو اکثریت کے مقابلے میں موثر ہو سکتے ہوں۔ اس لئے کہ انہیں ہمیشہ یہ توقع رہتی ہے کہ وہ اس طریق کار سے اکثریت کو اپنا ہمنوا بنالیں گے۔ غرض اس طرح امریکہ میں سیاسی انجمنیں اپنے عزائم کے اعتبار سے پرامن ہیں اور ہر لحاظ سے قانونی ذرائع استعمال کرتی ہیں۔

اس بارے میں امریکہ اور یورپ کے طرز فکر میں اختلاف کی متعدد وجوہ ہیں۔ یورپ میں سیاسی جماعتوں میں اکثریت سے اس قدر زبردست اختلاف ہوتا ہے کہ وہ کبھی یہ توقع نہیں کر سکتے کہ اکثریت کو اپنا ہم نوا بنا سکیں گے۔ مگر اس کے باوجود بزعم خود اپنے آپ کو اس قدر طاقتور تصور کرتی ہیں کہ وہ سمجھتی ہیں کہ وہ اکثریت کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ جب اس قسم کے طرز فکر کے حامل لوگ انجمن بناتے ہیں تو ان کا مقصد اکثریت کو قائل کرنا نہیں ہوتا بلکہ اس کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ مگر امریکہ میں ایسے افراد جو اکثریت سے سب سے زیادہ اختلاف رکھتے ہیں اکثریت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسری بات یہ کہ امریکہ میں تمام سیاسی جماعتیں یہ توقع رکھتی ہیں کہ وہ اپنے مسلک کے بارے میں اکثریت کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی۔ انجمن سازی کا حق اس صورت میں خطرناک ہو سکتا ہے جب کہ بڑی سیاسی جماعتیں یہ تصور کرنے لگیں کہ وہ اکثریت کی تائید حاصل ہی نہیں کر سکتیں۔ مگر امریکہ میں سیاسی اختلاف رائے معمولی نوعیت کا ہوتا ہے غیر محدود انجمن سازی کا حق شاید کبھی بھی بُرے اثرات کا حامل نہ ہونے پائے۔

امریکہ میں ایک اور اہم عنصر جو سیاسی انجمن سازی کی خطرناکی کو کم کرتا ہے ملکی انتخابات میں ہر بالغ کے رائے دینے کا حق ہے۔ اکثریت ہمیشہ کسی شک شبہ میں مبتلا نہیں رہتی۔ کیونکہ کوئی سیاسی جماعت آبادی کے اس حصہ کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتی جس نے انتخابات میں رائے نہ دی ہو۔

۱۱۔ امریکہ میں جمہوریت کے فوائد

جمہوری حکومتوں کے نقائص اور کمزوریاں آسانی سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔ اور واضح نتائج سے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جمہوریت کے صحت بخش اثرات غیر محسوس اور پوشیدہ رہتے ہیں۔ عیوب نکالنے کے لئے تو صرف ایک سرسری نگاہ کافی ہے۔ لیکن اس کی خوبیاں طویل مشاہدہ کے بعد ہی پہچانی جا سکتی ہیں۔ امریکی جمہوریت کے بعض قوانین نامکمل اور ناقص بھی ہیں۔ بعض وقت تو وہ مخصوص مفادات پر ضرب لگاتے ہیں اور بعض اوقات ایسے قوانین پر مہر توثیق ثبت کرتے ہیں جو معاشرہ کے لئے تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اگر وہ درست بھی ہوتے ہیں تو ان کی کثرت خود ایک بڑی خرابی بن جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود امریکی جمہوریتیں کس طرح خوشحال اور زندہ ہیں؟

بات یہ ہے کہ جمہوری قوانین کا مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کے بہبود کو فروغ دینا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان قوانین کا سرچشمہ شہریوں کی اکثریت ہوتی ہے۔ اور یہ اکثریت غلطی تو کر سکتی ہے لیکن اس کے مفادات ایسے نہیں ہوا کرتے جو خود اس کے لئے نقصان دہ ہوں۔ اس کے برعکس اہل ثروت، دولت اور طاقت کو اقلیت کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کی طرف مائل رہتے ہیں۔ ایک عام اصول کے طور پہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جمہوریت میں قانون سازی اہل ثروت کی بہ نسبت انسانیت کے لئے

زیادہ فائدہ مند ہوتی ہے۔

لیکن اہل ثروت کو جمہور کے مقابلہ میں قانون سازی کے علم میں زیادہ مہارت حاصل ہوتی ہے۔ اہل ثروت کے طبقے میں ضبط نفس زیادہ ہوتا ہے جو انہیں عارضی ہیجان میں کسی غلطی کے ارتکاب سے روکتا ہے۔ وہ دُور رس اور طویل المیعاد منصوبہ بندی کر سکتے ہیں اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ کس موقع پر ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا چاہیئے۔ اہل ثروت کا طبقہ حکومت کا کام چلاتا ہے۔ ایک فن کار کی مہارت اور چابکدستی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور اس بات سے کماحقہٗ واقف ہوتا ہے کہ کسی خاص وقت پر اپنی ساری قوتوں کو کس طرح مجتمع کیا جا سکتا ہے۔ جمہور کے ذرائع اہل ثروت کے مقابلہ میں ناقص اور نامکمل ہوتے ہیں اور جو تدابیر وہ غیر شعوری طور پر اختیار کرتا ہے بسا اوقات خود اس کے مفاد کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔ لیکن جو مقصد اس کے پیش نظر رہتا ہے وہ زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔

سرکاری عہدیداروں کے بارے میں اس نقطہ نظر سے غور کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات آسانی سے تصور کی جا سکتی ہے کہ امریکی جمہوریت ان افراد کے انتخاب میں عام طور پر غلطی کرتی ہے۔ جن کو انتظام ملک کے اختیارات سپرد کئے جاتے ہیں۔ امریکہ میں جو لوگ با اختیار عہدوں کے لئے منتخب ہوتے ہیں وہ بہ اعتبار صلاحیت اور کردار ان لوگوں سے کمتر درجے کے ہوتے ہیں جن کو اہل ثروت منتخب کرتے ہیں۔ لیکن امریکہ میں عہدیداروں کے مفادات' شہریوں کی اکثریت کے مفادات کے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ بسا اوقات بد دیانت ہوں یا غلطی پر ہوں لیکن وہ باقاعدہ طور پر کبھی بھی ایسا طریقہ کار اختیار نہیں کر سکتے جو اکثریت کے خلاف ہو اور نہ ہی وہ حکومت میں علیحدگی کا رجحان پیدا کر سکتے ہیں۔

علاوہ ازیں جمہوری طرز حکومت میں ایک مجسٹریٹ کی بدعنوانی ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ جس کا اثر صرف اس کے عہد اقتدار میں ہوتا ہے۔ بدعنوان اور نااہل عہدیداروں کے مفاد میں اشتراکِ عمل ممکن نہیں ہے۔ یعنی ایک بدقماش اور نااہل مجسٹریٹ کسی دوسرے مجسٹریٹ سے محض اس بنا پر اتحاد نہیں کر سکتا کہ وہ بھی بدعنوان اور نااہل ہے۔ غرض یہ کہ جمہوریت میں کسی مجسٹریٹ کی خرابیاں صرف انفرادی نوعیت کی ہوں گی۔

امریکہ میں سرکاری عہدیداروں کے کوئی طبقاتی مفادات نہیں ہوتے بلکہ حکومت کا عام اور متواتر اثر فائدہ بخش ہی ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ جمہوریت میں غیر محسوس طریقہ پر یہ رجحان ہمیشہ جاری رہتا ہے کہ غلطیوں اور کمزوریوں کے باوجود حکومت عام بہبود کے مقصد کو آگے بڑھاتی جائے۔ اس کے برعکس اشرافیہ میں با اختیار لوگوں کی بہترین صلاحیتوں کے باوجود، بتدریج اور غیر محسوس طور پر شہریوں کے حقوق غصب کرنے کا رجحان رہتا ہے۔ اشرافیہ میں سرکاری عہدیدار بسا اوقات بلا کسی ارادہ کے بعض عوامی مفاد کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور جمہوری طرز حکومت میں غیر ارادی طور پر ایسے نتائج پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ جن سے لوگوں کی عام بھلائی ہوتی ہے۔

وطن پرستی کی ایک خاص نوعیت ایسی ہوتی ہے جو انسان کی جبلت میں ہوتی ہے۔ اس کی تشریح ممکن نہیں۔ یہ انسان کو اس کے مقام پیدائش سے وابستہ کرتی ہے۔ قدیم رسوم سے لگاؤ اور ماضی کی روایات سے الفت قائم کرتی ہے۔ اور جو لوگ انہیں محبوب رکھتے ہیں وہ اپنے ملک سے اسی طرح محبت کرتے ہیں۔ جس طرح وہ اپنے آبا و اجداد کے مسکن سے۔ بعض دفعہ اس قسم کی وطن پرستی ایک مذہب کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جس میں عقل و

دلیل سے زیادہ جذبات اور عقیدہ کی حکمرانی ہوتی ہے۔ بعض ملکوں میں بادشاہ کی ذات کو خود ملک کی تقدیس اور عظمت کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔ اور نتیجتہً حب وطنی کا جوش بادشاہ کے لئے وفاداری اور محبت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور لوگ اس کی فتوحات اور عظمت میں خود فخر محسوس کرتے ہیں۔ مگر دوسرے جبلی جذبات کی طرح اس قسم کا حب وطن عارضی طور پر تو جوش و خروش پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن لوگوں کی مساعی میں تواتر اور تسلسل قائم نہیں رکھ سکتا۔ نازک حالات میں تو یہ مملکت کو بچا سکتا ہے۔ لیکن زمانۂ امن میں یہ عام طور پر ملک کو مائل بہ زوال ہونے سے روک نہیں سکتا۔

ملک سے وابستگی کی ایک اور قسم بھی ہے۔ جو اول الذکر سے زیادہ عقلی ہے۔ اس میں جوش و خروش زیادہ نہیں ہے۔ لیکن یہ زیادہ فائدہ مند اور پائدار ہے۔ اس وابستگی کا سرچشمہ علم ہے۔ اس کی پرورش اور نشو و نما قانون کی گود میں ہوتی ہے۔ یہ شہری حقوق کے استعمال سے پروان چڑھتا ہے اور بالآخر یہ شہریوں کے شخصی مفادات ہی میں مدغم ہو جاتا ہے۔ ایک عام آدمی اس اثر کو محسوس کر سکتا ہے۔ جو اس کے ملک کی خوشحالی اس پر مترتب کرتی ہے اور وہ جانتا ہے کہ قانون اسے اپنے ملک کی خوشحالی میں حصہ لینے اور اضافہ کرنے کی مساعی کی اجازت دیتا ہے اور وہ اس کے فروغ کے لئے محنت کرتا ہے۔

میری یہ حتمی رائے ہے کہ عوام کے دلوں میں اپنے ملک کی بہبود کے لئے دلچسپی پیدا کرنے کا واحد اور طاقتور ذریعہ یہی ہے کہ انہیں امور مملکت میں حصہ دیا جائے۔ آج کی دنیا میں شہری حقوق اور سیاسی حقوق ایسے اجزاء ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ میں جہاں لوگ ابھی کل ہی آکر آباد

ہوئے ہیں کس طرح جوش و خروش سے بلدی اور شہری حکومت میں حصّہ لیتے ہیں یہ لوگ نہ تو اپنے ساتھ اپنی روایات لائے ہیں۔ وہ یہاں آکر اپنے دیگر ہموطنوں سے پہلی مرتبہ ملے۔ انہیں اپنے ملک سے وہ جبلّی محبت بھی نہیں جو کسی جگہ صدہا سال رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود امورِ مملکت میں ان کی سرگرمی اور جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں دکھائی دیتی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ اپنے دائرہ کار میں کام کرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں کہ وہ پورے معاشرہ کی بھلائی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ امریکہ میں ادنیٰ سے ادنیٰ فرد بھی یہ سمجھتا ہے کہ ملک کی خوشحالی خود اس کی خوشحالی میں کس طرح اضافہ کرسکتی ہے۔ علاوہ ازیں وہ ملک کی خوشحالی کو خود اپنی مساعی اور محنت شاقہ کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

امریکہ کی عام روزمرہ زندگی میں ایک اجنبی کے لئے سب سے زیادہ حیران کن بات امریکی شہری کا اپنے وطن سے وابستگی میں بے حد حساس ہونا ہے ایک اجنبی امریکہ کے مختلف اداروں کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ لیکن جب وہ کسی بات پر نکتہ چینی کی اجازت چاہے گا تو یہ عام طور پر سختی سے مسترد کر دی جائے گی۔ امریکہ ایک آزاد ملک ہے۔ جس میں اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں آپ کے خیالات کسی کے جذبات کو مجروح نہ کریں، آپ کو اس بات کی اجازت نہ ہوگی کہ آپ کسی فرد یا مملکت، شہری، حکام یا سرکاری یا نجی اداروں کے خلاف کچھ کہہ سکیں۔ ہاں موسم اور آب و ہوا اس سے مستثنےٰ ہیں اور اس میں بھی امریکی آپ کی تنقید کی زور شور سے مدافعت کریں گے۔

میں نیکی کے عام تصوّر کے بعد حق کے تصوّر کو سب سے زیادہ برتر تصوّر کرتا ہوں۔ یہ دونوں تصورات دراصل ایک ہی تصور میں متحد ہیں۔ حق کا تصوّر

دراصل نیکی ہی کا تصوّر ہے جو عالمِ سیاست میں متعارف کیا گیا ہے۔ یہ حق ہی کا تصوّر تھا جس نے انسانوں کو تاراج اور استبداد کے خلاف جدوجہد کے قابل بنایا۔ اس نے سکھایا کہ مغرور ہوئے بغیر کس طرح آزادی کی نعمت سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ جو شخص تشدد کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے اپنی عزتِ نفس کو کھو دیتا ہے وہ اگر اپنے کسی ہم جلیس کو مقتدر مان کر، اس کی حاکمیت کے حق کے آگے اطاعت قبول کرتا ہے تو دراصل اس کا مرتبہ اس شخص سے بلند ہوتا ہے جو اسے حکم دیتا ہے۔

جمہوری حکومت سیاسی حقوق کے تصور کو ادنیٰ ترین شہریوں تک پہنچاتی ہے۔ جس طرح دولت کی تقسیم، جائداد کو ہر کس و ناکس کی دسترس میں لے آتی ہے۔ میرے نقطۂ نظر سے یہ ایک بہت بڑا فائدہ ہے۔ میرا ادعا یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو سیاسی حقوق کے استعمال کی تربیت دینا آسان ہے۔ لیکن میں ضرور کہوں گا کہ جہاں کہیں بھی یہ بات ممکن ہو سکی اس کے اثرات انتہائی اہم اور دُور رس ثابت ہوئے۔

لیکن میں یہاں اس بات کو واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں امریکہ کی مثال پیش کرتے ہوئے تصوّرِ حقوق کے سلسلے میں مبالغہ آمیزی کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ امریکہ میں لوگوں کو سیاسی حقوق ایک ایسے دَور میں ملے جب کہ ان کا ناجائز استعمال نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ امریکہ میں آبادکاروں کی تعداد کم تھی۔ ان کے طور طریق سادہ تھے۔ اب جب کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو چکا ہے۔ امریکیوں نے جمہوریت کے اختیارات میں اضافہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کا دائرہ اثر وسیع کر دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ وہ لمحہ انتہائی نازک ہوتا ہے جب کہ ایسے لوگوں

کو شہری حقوق دئے جائیں جو انہیں اس سے قبل حاصل نہ تھے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک نادان بچہ، اپنی جان کی قدر و قیمت جاننے سے پہلے ہی مارا جائے یا وہ کسی دوسرے شخص کو اس کی جائداد سے محروم کر دے اور یہ جان بھی نہ سکے کہ اسے بھی اس کے مال و متاع سے محروم کر دیا جا سکتا ہے۔ شہری حقوق اور عام لوگوں میں وہی تعلق ہوتا ہے۔ جو ایک بچہ اور فطرت میں ہوتا ہے۔

یہ بات عام طور پر ہمیشہ ممکن نہیں رہتی کہ قانون کی تشکیل کے سلسلے میں تمام لوگوں سے بالواسطہ بالراست مشورہ کیا جائے۔ لیکن جب کبھی ایسا ممکن ہو سکا تو یقیناً قانون کی حاکمیت میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے۔ قبولیت عامہ کی شرط، جو اگرچہ قانون کی فضیلت اور حکمت پر بُرا اثر ڈالتی ہے۔ قانون کی طاقت پر زبردست اضافہ کا موجب ہوتی ہے۔ عوام کی مرضی و منشا کے اظہار میں ایک حیرت انگیز طاقت مضمر ہوتی ہے۔ اور جب عوام کی مرضی کا اظہار ہو جاتا ہے تو وہ لوگ بھی جو دل ہی دل میں اس کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں مرعوب ہو جاتے ہیں۔ امریکہ کی سیاسی جماعت اس چیز کی صداقت سے اچھی طرح باخبر ہے۔ چنانچہ اسی لئے وہ جہاں بھی ممکن ہو سکے۔ اکثریت کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر رائے دہندوں کی اکثریت ان کے ساتھ نہ ہو تو وہ دعوے کرتے ہیں کہ رائے دہندوں کی حقیقی اکثریت نے رائے نہیں دی۔ اور اگر اس دعوے میں بھی انہیں ناکامی ہو تو وہ ان لوگوں کا سہارا لیتے ہیں جنہیں رائے دینے کا حق نہیں۔

امریکہ میں، غلاموں، ملازموں اور بلدیات کے زیر پرورش ناداروں کے سوائے ہر شخص کو رائے دینے کا حق ہے۔ اور ہر شخص بالواسطہ قانون بنانے میں حصّہ لیتا ہے۔ جو لوگ قانون کو ہدف ملامت بنانا

چاہتے ہیں انہیں یا تو قوم کی رائے بدلنا پڑتی ہے یا قوم کے فیصلے کو پاؤں تلے روندنا پڑتا ہے۔

یہاں ایک اور بات کا ذکر کرنا ضروری ہے جو اس سے بھی زیادہ وزنی ہے۔ امریکہ میں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ سارا معاشرہ قانون کا تابع و پابند رہے چونکہ اقلیت یہ توقع رکھتی ہے کہ وہ جلد سے جلد اکثریت کو اپنے اصولوں کا ہمنوا بنائے گی۔ اس لئے وہ بھی قانون کا احترام کرتی ہے تاکہ اس کے برسر اقتدار آنے کے بعد جو قانون بنائے جائیں ان کا بھی اسی طرح احترام ہو کوئی قانون کیسا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو۔ امریکہ کے شہری اس کی پابندی کرتے ہیں۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ اکثریت کی خواہش کا نتیجہ ہے بلکہ اس کی اپنی کوششوں کا ماحصل ہے۔ وہ قانون کو ایک ایسا معاہدہ تصوّر کرتے ہیں جس کے وہ خود ایک فریق ہیں۔

امریکہ میں ایسے لوگوں کی تعداد بے حد کم ہے جو قانون کو اپنا فطری دشمن سمجھ کر اس سے نفرت کرتے ہیں یا ڈرتے ہیں۔ اس کے برعکس معاشرہ کے ہر طبقہ کو اپنے قوانین سے ایک خاص نوعیت کی پدرانہ محبت ہوتی ہے علاوہ ازیں لوگ قانون کی اطاعت صرف اس لئے نہیں کرتے کہ وہ ان ہی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اگر کسی مرحلہ پر کوئی قانون نقصان دہ ثابت ہوا تو اسے بدلا جا سکتا ہے۔

اہل امریکہ کو جو حیرت انگیز آزادی حاصل ہے اس کا تصوّر کرنا ناممکن نہیں ہے۔ اور اس طرح امریکہ میں مساوات کے بارے میں کچھ نہ کچھ تصوّر ذہن میں آسکتا ہے۔ لیکن امریکہ کے طول و عرض میں جو سیاسی سرگرمی دکھائی دیتی ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے اس کا مشاہدہ کرنا ضروری ہے۔

امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی آپ ایک اضطراب کی کیفیت دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ ہر طرف ایک عجیب و غریب شور و غوغا سنائی دے گا۔ اور ہزاروں آوازیں اپنی سماجی ضروریات کی تکمیل کا مطالبہ کرتے ہوئے سنائی دیں گی۔ ہر طرف حرکت ہی حرکت دکھائی دے گی۔ کہیں ایک شہر کے لوگ گرجا بنانے کے لئے جلسہ کر رہے ہیں۔ کسی جگہ کسی نمایندہ کا انتخاب ہو رہا ہے۔ دوسری جگہ شہر کے نمایندے اپنے حلقہ میں لوگوں سے ترقیاتی امور پر مشورہ کر رہے ہیں تو تیسری جگہ کسی قصبہ کے مزدور اپنا کام کاج چھوڑ کر سڑک یا سکول تعمیر کرتے نظر آ رہے ہیں۔ انجمنیں بن رہی ہیں۔ جلسے ہو رہے ہیں۔ غرض یہ کہ سیاسی ہنگامہ آفرینی امریکی زندگی کا ایک جزو بنی ہوئی ہے۔

سیاسی امور کی انجمنیں امریکی شہریوں کی روزمرہ زندگی میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ تقریباً ہر امریکی کا واحد مرغوب مشغلہ امور مملکت میں حصہ لینا اور اس پر بحث و مباحثہ کرنا ہے۔ یہی صورتِ حال ہر طرف دکھائی دے گی یہاں تک کہ عورتیں بھی عام جلسوں میں شرکت کرتی ہیں۔ اور گھریلو محنت و مشقت کے بعد تفریح کے طور پر سیاسی جھگڑوں کو سننا پسند کرتی ہیں۔

جمہوری طرزِ حکومت نے سیاسی دنیا میں جو نہ ختم ہونے والا ہیجان برپا کر رکھا ہے وہ امریکیوں کے تمام سماجی امور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا مجموعی طور پر یہ جمہوریت کا سب سے بڑا فائدہ ہے یا نہیں۔ یہ امر ناقابلِ تردید ہے کہ اس طرزِ حکومت کے تحت عوام عام طور پر کاروبارِ مملکت بے ڈھنگے طریقہ سے چلاتے ہیں۔ لیکن یہ بات ناممکن ہے۔ آبادی کے ادنیٰ اور کم تر ذہانت کے حامل لوگ، امور مملکت میں حصہ لیتے ہوئے اپنے خیالات

سے دوسروں کو متاثر نہ کریں۔

معمولی سے معمولی فرد بھی جب معاشرہ اور ملک کی حکومت کے معاملات میں حصّہ لیتا ہے تو اس میں ایک خاص قسم کی خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ بہ حیثیت شہری اور رائے دہندہ وہ ایک باختیار شخصیت ہے۔ اس لیے وہ ان لوگوں پر حکم چلا سکتا ہے جو ذہانت میں اس سے اعلیٰ تر ہیں۔ ہزاروں امیدوار ایک عام شہری کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اسے ہزاروں طریقوں سے دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح دراصل وہ اسے ہوشیار بنا دیتے ہیں۔ غرضیکہ امریکہ کا ایک عام شہری سیاسی مسائل کے بارے میں یورپ کے عام شہریوں سے زیادہ باخبر ہو جاتا ہے۔

جمہوریت کے مخالفین یہ دعوے کرتے ہیں کہ ایک شخص کی حکومت عوام کی حکومت کے بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر اپنے شعور کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے بظاہر اس دعوے میں صداقت ضرور ہے۔ کیونکہ ایک فرد کی حکومت میں قوت عمل، تسلسل، مہارت اور یکسانیت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ باریک باریک باتوں پر نظر رکھ سکتی ہے۔ اور لوگوں کے انتخاب میں زیادہ احتیاط کرتی ہے اس کے برعکس جمہوری حکومت میں یہ بات ممکن نہیں ہے۔ لیکن دوررس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جمہوری حکومت بالآخر زیادہ مفید نتائج حاصل کرتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ جمہوری حکومت صرف چند امور بہتر طور پر انجام دے سکے۔ لیکن وہ شخصی حکومت کے مقابلہ میں زیادہ بڑے کارنامے انجام دیتی ہے۔

۱۲- اکثریت کے غیر محدود اختیارات اور اس کے اثرات

جمہوری طرزِ حکومت کی روح اکثریت کی مطلق حاکمیت میں مضمر ہے، اس لیئے کہ جمہوری حکومتوں میں کوئی اور طاقت اس حاکمیت کی مزاحمت کے قابل نہیں ہوتی امریکی ریاستوں کے آئین اس فطری طاقت میں مصنوعی ذرائع سے اضافہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جمہوری اداروں میں، مجلس قانون ساز ایسا ادارہ ہے، جو اکثریت کی خواہش کے آگے آسانی سے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے۔ امریکہ والوں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ مجلسِ قانون ساز کے ارکان کو عوام راست انتخاب کے ذریعہ اور ایک مختصر سی مدّت کے لیئے منتخب کریں۔ تاکہ یہ ارکان نہ صرف ہمیشہ عام لوگوں کے روزمرہ جذبات کے بھی تابع رہیں۔ بلکہ دونوں ایوانوں کے ارکان معاشرہ کے ایک ہی طبقہ سے منتخب ہوتے رہیں۔ اور ان کا انتخاب ایک ہی طریقہ سے ہوتا رہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مجالس قوانین ساز ایک ہی رفتار سے عمل کریں اور اس طرح تشکیل میں آنے والی مجالس قانون ساز کو حکومت کے کم و بیش تمام اختیارات سونپ دیئے جاتے ہیں۔

چونکہ قانون نے ایسے اداروں کی قوت میں اضافہ کر رکھا ہے جو بذات خود طاقت ور ہیں۔ اس لیئے ایسے ادارے کمزور سے کمزور تر ہو گئے۔ جو فطری طور پر کمزور تھے۔ قانون نے عاملہ کے نمائندوں یعنی انتظامی عہدیداران کو استحکام اور آزادئ عمل سے محروم کیا اور مجلس قانون ساز کی مرضی و منشا کا

تابع بنا کر، قانون نے انہیں اس معمولی اثر و رسوخ سے بھی محروم کر دیا۔ جو ایک جمہوری طرزِ حکومت کے تحت وہ لوگوں پر ڈال سکتے تھے۔ متعدد ریاستوں میں عدالتی حکام کا انتخاب بھی اکثریت ہی کی رائے سے ہوتا ہے۔ اور تمام ریاستوں میں عدالتی حکام کے وجود اور عدم وجود کا انحصار قانون ساز کی خواہش پر ہوتا ہے۔ کیونکہ مجلس قانون ساز کو ہر سال ججوں کی تنخواہ اور معاوضہ مقرر کرنے کا اختیار ہوتا ہے۔

امریکہ میں اکثر امور میں قانون سے زیادہ رسوم کی حکمرانی ہوتی ہے جہاں قانون نے کمی چھوڑی تھی۔ اس کی تکمیل رسوم نے کر دی ہے۔ امریکہ میں ہر جگہ ایک ایسا طریقہ کار عام ہوتا جا رہا ہے۔ جو بالآخر نمائندہ حکومتوں کی حمایت ہی کو ختم کر دے گا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ نمائندوں کے انتخاب کے وقت رائے دہندے اپنے نمائندے کے لیئے ایک خاص طریق عمل کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور منتخب نمائندہ اس بات کا پابند رہتا ہے کہ اپنے منتخب کرنے والوں کے بتائے ہوئے خطوط پر چلے۔

علاوہ ازیں امریکہ میں کئی ایسے عوامل ہیں جو اکثریت کے اقتدار کو نہ صرف غالب بلکہ بالکل ناقابلِ مزاحمت بنا دیتے ہیں۔ اکثریت کی حاکمیت اس تصور پر مبنی ہے کہ ایک فردِ واحد کے مقابلہ میں، متعدد لوگوں کے اتحاد میں زیادہ دانشمندی اور ذہانت مضمر ہوتی ہے۔ اور یہ کہ قانون سازوں کی تعداد ان کی صلاحیتوں سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس طرح انسانی ذہانت پر مساوات کے نظریہ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ اور دوسرے اختیارات کی طرح اکثریت کے اختیار کو بھی زمانہ اور وقت کی منظوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابتداءً اکثریت کی طاقت زبردستی اطاعت کراتی ہے۔ اور اس کے قوانین کا احترام

اس وقت تک نہیں کیا جاتا جب تک کہ انہیں ایک طویل عرصہ تک برقرار نہ رکھا جائے۔

معاشرہ پر حکومت کا حق، جس پر اکثریت بزعم خود اپنی برتر ذہانت کا ادعا کرتی ہے، امریکہ میں سب سے پہلے ابتدائی نو آبادکاروں نے رائج کیا۔ اور یہ شعور، جو بذاتِ خود ایک آزاد قوم کو پیدا کرنے کے لیئے کافی ہے، لوگوں کے عام تصوّرات، عقائد اور روزمرّہ زندگی کے عام مظاہر میں مدغم کر لیا گیا۔

قدیم شاہی کے تحت فرانس میں یہ تصوّر کیا جاتا تھا کہ بادشاہ سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو اس کے مشیر قصور وار ٹھہرائے جاتے اس تصوّر کے ذریعہ لوگوں سے بہ آسانی اطاعت کرائی جا سکتی۔ اور اس نظریہ کے تحت رعایا کے لیئے یہ ممکن تھا کہ وہ بادشاہ سے محبّت اور احترام کرتے ہوئے بھی، قانون کے بارے میں شکایت کریں۔ امریکہ کے لوگ اکثریت کے بارے میں یہی تصوّر رکھتے ہیں۔

اکثریت کی اخلاقی طاقت کی اساس ایک اور اصول پر بھی ہے، وہ یہ کہ زیادہ لوگوں کے مفادات کو چند لوگوں کے مفادات پر ترجیح حاصل ہونی چاہیئے، یہاں اس بات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے حقوق کا جو احترام کیا جاتا ہے اس میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ اور اس کا انحصار سیاسی جماعتوں کے اثر میں کمی و زیادتی پر رہتا ہے۔ اگر کوئی ملک متعدد ناقابل مصالحت مفادات میں بٹا ہوا ہو، تو اکثریت کے اس استحقاق کو عام طور پر نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے مطالبات کو تسلیم کرنا ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔

اگر امریکہ میں کوئی ایسا طبقہ موجود رہتا، جسے قانون ساز ادارہ، اس کے

ایسے حقوق سے محروم کرنا چاہتا جو اسے صدہا سال سے حاصل تھے۔ اور اس کے برتر مقام سے گرا کر عام سطح پر لانا چاہتا تو شاید اقلیت اس کے قوانین کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر آمادہ نہ ہوتی۔ لیکن جن لوگوں نے امریکہ کو آباد کیا تھا وہ وہ ہم رتبہ تھے۔ اس لیئے وہاں کے شہریوں کے مفادات میں نظری یا مستقل اختلافات نہیں ہیں۔

بعض ملکوں میں اقلیت کبھی بھی یہ توقع نہیں کر سکتی کہ وہ اکثریت کو اپنا ہمنوا بنا لے گی۔ کیونکہ ایسی صورت میں خود اقلیت کو ان باتوں سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ جو وجہ اختلافات ہوتے ہیں۔ پس اشرافیہ کا طبقہ اپنے مخصوص اختیارات برقرار رکھتے ہوئے کبھی اکثریت نہیں بن سکتا۔

امریکہ میں سیاسی مسائل کو اس طرح مطلق العنان طور پر حل نہیں کیا جاتا۔ اور تمام سیاسی جماعتیں اکثریت کے حقوق کو تسلیم کرتی ہیں۔ کیونکہ وہ توقع رکھتی ہیں کہ وہ کسی نہ کسی دن اکثریت حاصل کر لیں گی۔ اور اس وقت اس قسم کے سلوک کی مستحق ہوں گی۔ غرض یہ کہ امریکہ میں اکثریت غیر معمولی طور پر اور حقیقی اختیارات کی حامل ہوتی ہے۔ اور کوئی شے اس کے اختیار کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

میں نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ میں اس مقولہ کو غیر مقدس اور قابل نفرت سمجھتا ہوں کہ سیاسی طور پر عوام کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہیں کریں۔ اس کے باوجود میں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ تمام اختیارات کا سرچشمہ اکثریت کی مرضی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا میں غلط بیانی کا مرتکب ہوں!

بات یہ ہے کہ ایک عام قانون ایسا بنایا جا چکا ہے۔ جسے قبول عامہ حاصل

ہے۔ اور جسے انصاف کہا جاتا ہے۔ اسے نہ صرف اس ملک اور اس ملک کے لوگوں نے بنایا ہے۔ بلکہ بنی نوع انسان کی ایک بڑی اکثریت نے بنایا ہے۔ ہر قوم کے حقوق ان حدود کے اندر ہوتے ہیں جو انصاف پر مبنی ہوتے ہیں۔ ایک قوم کی مثال جیوری سے دی جا سکتی ہے۔ جس کو بحیثیت مجموعی معاشرہ کی ترجمانی اور انصاف کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کا اختیار ہے۔ یہ انصاف کے اصول اس کے قانون ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک ایسی جیوری کو اس سوسائٹی کے اختیارات سے زیادہ یا اختیار ہونا چاہیئے۔ جس کی وہ نمائندگی کرتی ہے اور جس کے قوانین کو وہ عملی جامہ پہناتی ہے۔

میں جب کسی ایسے قانون کو تسلیم نہیں کرتا۔ جو انصاف پر مبنی نہیں ہے تو اکثریت کی حکومت کے حق سے انکار نہیں کرتا۔ بلکہ میں تو محض عوام کے اقتدار اعلےٰ سے خلافِ انسانیت اقتدار کے خلاف اپیل کرتا ہوں۔ بعض لوگوں نے تو یہ تک کہنے کی جرأت کی ہے کہ عوام ایسے امور میں جو ان کے اپنے ہیں، انصاف اور عقل و دانش کی حدود سے کبھی تجاوز نہیں کر سکتے۔ اور یہ کہ اکثریت کو مکمل اختیارات دیئے جانے چاہئیں جو عوام کی نمائندگی کرتی ہے۔ مگر یہ زبان اور طرزِ اظہار غلاموں کا ہے۔

بحیثیت مجموعی اکثریت ایک فرد ہی کی مانند ہوتی ہے جس کی آراء اور لبا اوقات مفادات دوسرے فرد کے مفادات اور آراء سے متضاد ہوتے ہیں۔ اور یہ دوسرا فرد اقلیت ہوتا ہے۔ اگر یہ تصوّر کیا جائے کہ ایک غیر محدود اختیارات کا حامل فرد اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے اپنے مخالفوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ تو یہ ہی بات اکثریت پر بھی صادق آتی ہے۔ افراد ایک دوسرے سے متحد ہو کر اپنا کردار تو نہیں بدل سکتے۔ اور نہ ہی ان کی طاقت میں اضافہ کے ساتھ ساتھ ان کے صبر و تحمل میں اضافہ ہوتا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے ایسا نہیں

ہو سکتا۔ میں جب کسی اپنے ہم مرتبہ شخص کو" ہر چیز کرنے کا اختیار دینے سے انکار کرتا ہوں" تو میں یقیناً" ایسے ہم مرتبہ افراد کے ایک گروہ کو یہ اختیار دینا پسند نہیں کروں گا۔

میرا خیال ہے کہ محض آزادی کی حفاظت کے لیئے ایسے متعدد اصولوں کو ایک حکومت کے اندر جمع کرنا ممکن نہیں جو ایک دوسرے سے متضاد ہوں ملی جلی حکومت کے تصوّر کو میں ہمیشہ ایک خیال باطل تصوّر کرتا ہوں حقیقت یہ ہے کہ ملی جلی حکومت کوئی شے ہی نہیں ہے۔ کیونکہ ہر معاشرہ میں صرف ایک ہی اصول ایسا ہوتا ہے جسے غلبہ حاصل رہتا ہے۔ اور جب کسی معاشرہ میں واقعی ملی جلی حکومت مبنی ہے اور اس پر متعدد اور متضاد اصولوں کی حکمرانی ہو وہاں یا تو انقلاب برپا ہوتا ہے یا وہ نراج کا شکار ہو جاتی ہے۔

اور اس بنا پر میری رائے ہے کہ سماجی اقتدار، جو تمام چیزوں سے اعلےٰ و برتر ہے، کسی نہ کسی جگہ مرتکز ہونا چاہیئے۔ لیکن میرا خیال ہے۔ آزادی کو اس صورت میں زبردست خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ جب ایسے اقتدار کو کسی ایسی رکاوٹ سے دوچار نہیں ہونا پڑتا جو اس کی پیش قدمی کو روک سکے۔ اور جو اسے یہ مہلت دے کہ اپنی شدّت اور سختی میں اعتدال پیدا کرے۔

غیر محدود اقتدار بُری اور خطرناک شے ہوتی ہے۔ انسان کی ذات ایسے اقتدار کو دانشمندی سے استعمال کرنے کی قابلیت اور سکت نہیں رکھتی۔ صرف خدا تعالیٰ ہی کی ذات اس بات پر قادر ہے اور جب دنیا میں مکمّل اقتدار کسی کو حاصل ہو۔ خواہ وہ بادشاہ ہو یا اشرافیہ، جمہوریت ہو یا عمومیہ۔ تو یقیناً اس میں بھی استبداد کے جراثیم موجود ہوں گے۔

میری رائے میں، امریکہ میں جمہوری اداروں کی سب سے بڑی برائی ان کی کمزوری

میں مضمر نہیں ہے۔ جیسا کہ یورپ میں خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی برائی اس کی ناقابلِ مزاحمت طاقت میں مضمر ہے۔ میں امریکہ میں اس غیر محدود آزادی کی موجودگی سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ بلکہ میں امریکہ میں استبداد کے خلاف ناکافی تحفظات کی عدم موجودگی سے خوفزدہ ہوں۔

امریکہ میں صورتِ حال یہ ہے کہ رائے عامہ کے نقطہ نظر سے، اکثریت کی رائے عام رائے سمجھی جاتی ہے، مقننہ جو اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے بلا چون و چرا اکثریت کے آگے سر جھکا دیتی ہے اور عاملہ جس کا تقرر اکثریت کرتی ہے۔ اکثریت کے آلۂ کار کے طور پر کام کرتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی فرد یا جماعت کو نقصان پہنچایا جائے تو وہ شکایت کے ازالہ کے لیے کس سے رجوع کرے؟

اس کے برعکس اگر قانون ساز ادارہ ایسا ہو جو اکثریت کی نمائندگی تو کرے۔ لیکن وہ اکثریت کے جذبات کے تابع نہ ہو، عاملہ کو اقتدار و اختیار میں مناسب حصّہ ملا ہو۔ اور عدلیہ ایسی ہو کہ وہ عاملہ اور مقننّہ دونوں سے بڑی حد تک آزاد ہو، تو ایسی حکومت بھی جمہوری ہی کہلائے گی۔ اور اس میں استبداد کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

میں یہ تو نہیں کہتا کہ امریکہ میں اکثریت اپنی استبدادی طاقت کا بعض اوقات استعمال کرتی ہے۔ لیکن یہ بات درست ہے کہ استبداد کے خلاف کوئی یقینی حمایت نہیں ہے۔ اور وہ عوامل جو حکومت کے استبداد کی شدّت میں کمی کرتے ہیں۔ کسی خاص ملک کے حالات اور طرز و رسوم میں پائے جاتے ہیں۔ نہ کہ اس کے قوانین میں۔

یہاں استبداد اور آمریت میں تمیز کرنا ضروری ہے۔

استبداد قانون کے ذریعہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور ایسی صورت میں اسے آمریت نہیں کہا جاسکتا۔ آمرانہ اختیارات عوامی بہبود کے لیئے بھی استعمال میں آسکتے ہیں اور اس صورت میں انہیں مستبدانہ نہیں کہا جاسکتا۔ استبداد عام طور پر آمرانہ ذرائع استعمال کرتا ہے لیکن اگر ضرورت نہ ہو تو یہ بغیر آمریت کے بھی کام چلاسکتی ہے امریکہ میں اکثریت کی مطلق حاکمیت، جو مقننہ کی قانونی حاکمیت کے ہم آہنگ ہے مجسٹریٹ کے آمرانہ اختیارات کی حمایت کرتی ہے۔ اکثریت کو قانون بنانے اور اس کی تعمیل کی نگرانی کرنے دونوں باتوں کا کامل اختیار حاصل ہے۔ اور چونکہ اسے با قتدار لوگوں اور معاشرہ دونوں پر کامل اختیار حاصل ہے اس لیئے وہ سرکاری عہدیداروں کو اپنا خاموش کارندہ تصوّر کرتی ہے۔ اور سرکاری عہدیداران کا یہ فرض ہے کہ وہ اکثریت کی خواہش کو عملی جامہ پہنائیں۔ عہدوں کی تفاصیل اور عہدیداروں کے حقوق کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا جاتا ہے۔ اکثریت عہدیداروں کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو ایک آقا اپنے ملازموں کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ چونکہ سرکاری ملازم کو ہمیشہ اکثریت کی آنکھوں کے سامنے کام کرنا پڑتا ہے اس لیئے اکثریت بر وقت اس کی نگرانی کر سکتی ہے۔

الغرض امریکی حکومت کے عہدیدار اپنے معین کردہ دائرہ کار میں بھی آزادئ عمل رکھتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ اکثریت کی اجازت کے ماتحت اپنے حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔ چونکہ رائے عامہ ان کی حفاظت کرتی ہے۔ اور اکثریت کی طاقت کی حمایت حاصل رہتی ہے۔ اس لیئے وہ یورپی ملکوں کے سرکاری عہدیداروں سے بھی زیادہ، جو آمرانہ اختیارات استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں، اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہیں۔

امریکہ میں اکثریت کی طاقت فکر و تخیل پر کس طرح اثر انداز ہوئی ہے اس کا

مطالعہ کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ تخیل ایک غیر محسوس، نظر نہ آنے والی اور لطیف شے ہے۔ جو استبداد کے تمام مساعی کا منہ چڑاتی ہے۔ یورپ میں طاقت ور اور مفید ترین حکمران بھی اپنی سلطنت تو درکنار خود اپنے دربار میں بھی ایسے خیالات کی تشہیر کو روک نہیں سکتا۔ جو اس کے خلاف ہوں۔ اور خفیہ طور پر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے ہوں۔ مگر امریکہ میں یہ بات نہیں ہے۔ جب تک اکثریت غیر معین ہوتی ہے تو ہر مسئلہ پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن جونہی اکثریت کے فیصلے کا اعلان ہو جاتا ہے تو سب خاموش ہو جاتے اور دوست و دشمن اس کے جواز پر متفق ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ صاف ہے۔ دنیا میں کوئی مطلق العنان حکمران ایسا نہیں کہ وہ ملک کے تمام اختیارات کو اپنے ہاتھوں میں مرتکز کر کے مخالفت کو کچل دے۔ مگر اس کے برعکس اکثریت میں یہ طاقت ہوتی ہے۔ جسے قانون بنانے اور عمل کرانے کا اختیار ہوتا ہے۔

بادشاہ کا اقتدار طبعی نوعیت کا ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کی مرضی اور منشا حاصل کیے بغیر بھی ان کی قوّتِ عمل پر نگرانی کر سکتا ہے۔ مگر اکثریت کو جو طاقت حاصل ہوتی ہے وہ بیک وقت طبعی بھی ہے اور اخلاقی بھی، جو لوگوں کی مرضی و منشا اور اس کے عمل پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اور ہر قسم کے اختلاف کو دبا دیتی ہے۔

مَیں دنیا میں کسی ایسے ملک سے آشنا نہیں ہوں جہاں امریکہ کی طرح آزادیٔ فکر اور بحث و مباحثہ کی آزادی کا اس قدر فقدان ہے۔ یورپ کے کسی بھی آئینی ملک میں ہر قسم کے سیاسی اور مذہبی نظریات کی تبلیغ و تشہیر کی مکمل آزادی ہے کیونکہ یورپ میں کسی بھی ملک میں کسی واحد طاقت کی حکمرانی نہیں اور اگر ایسا شخص جو صداقت کی آواز بلند کرتا ہے خوش قسمتی سے کسی مطلق العنان ملک میں رہتا ہو تو عوام اس کی ہمیشہ تائید و حمایت میں رہتے ہیں۔ لیکن ایسے ملک میں

جہاں امریکہ کی طرح منظم جمہوری ادارے موجود ہوں۔ وہاں صرف ایک با اختیار طاقت ہوتی ہے۔ صرف ایک ہی عنصر طاقت اور کامیابی کا مظہر ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی شے نہیں ہوتی۔

امریکہ میں جمہوریت آزادیٔ فکر و آراء کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹیں کھڑی کرتی ہے۔ ان حدود کے اندر رہ کر کوئی ادیب یا مصنف جو چاہے لکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس نے اس سے تجاوز کرنے کی کوشش کی تو وہ مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہ نہیں کہ اسے کسی محکمہ احتساب کی جانب سے سزا دی جائے گی۔ ہوگا یہ کہ وہ مسلسل سب دشتم اور تنقید و ملامت کا نشانہ بنا رہے گا۔ اس کی سیاسی زندگی ہمیشہ کے لیئے ختم ہو جائے گی۔ غرض یہ کہ وہ بالآخر تنگ آکر گوشۂ گمنامی میں چلا جاتا ہے۔ اور اس سے تاثر قایم ہوتا ہے کہ وہ اپنی صاف گوئی پر پشیمان ہو چکا ہے۔

اگر امریکہ میں اب تک کوئی بڑا ادیب پیدا نہیں ہو سکا تو اس کی وجہ ان ہی حقایق میں ملے گی۔ ادبی ذہانت اس وقت تک جلا نہیں پا سکتی جب تک کہ آزادیٔ فکر موجود نہ ہو۔ اور امریکہ میں آزادیٔ فکر موجود نہیں ہے۔ سپین کے سخت احتسابی قوانین ملک میں خلاف مذہب کتابوں کی ترویج و اشاعت کو نہ روک سکے، لیکن امریکہ میں اکثریت کی شہنشاہیت کو اس سے زیادہ کامیابی حاصل ہوتی ہے کیونکہ شہنشاہیت ایسی کتابوں کی اشاعت کی خواہش ہی کو فنا کر دیتی ہے۔ امریکہ میں دہریے تو ملیں گے لیکن دہریوں کا کوئی ترجمان نہیں ہے۔ بعض حکومتوں نے بڑی کوشش کی کہ قوم کے اخلاق کی حفاظت کے لیئے فحش کتابوں کی اشاعت پر پابندی لگائے۔ امریکہ میں اس قسم کی کتابوں کی اشاعت پر کسی کو سزا نہیں دی جاتی۔ لیکن ایسی کتابیں تصنیف کرنے کی کسی کو ترغیب ہی نہیں ہوتی۔ اس لیئے

نہیں کہ تمام شہری پاکباز اور ثقہ ہیں بلکہ اس لیئے کہ معاشرہ کی اکثریت مہذب اور منظم ہے۔ اس سلسلہ میں اکثریت کے اختیار کا استعمال بلاشبہ اچھا ہے۔ لیکن میں تو یہاں طاقت کی ماہیئت پر بحث کر رہا ہوں۔ یہ ناقابلِ مزاحمت طاقت ایک مسلسل حقیقت ہے۔ اور اس کا دانشمندانہ استعمال محض ایک حادثہ ہے۔

جن رجحانات کا میں نے ابھی تذکرہ کیا ہے وہ سیاسی معاشرہ میں اگرچہ بظاہر کم محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ابھی سے امریکنوں کے قومی کردار پر ناموافق اثر ڈال رہے ہیں۔ امریکہ کی سیاسی زندگی میں ممتاز لوگوں کی کمی کو میں امریکی اکثریت کی روز افزوں مطلق العنانی پر محمول کرتا ہوں۔

امریکہ میں جب انقلاب برپا ہوا تو ذہین اور ممتاز لوگوں کی تعداد زیادہ تھی۔ کیونکہ اس وقت رائے عامہ کی خدمت کا مقصد ان پر دباؤ ڈالنا نہ تھا۔ بلکہ ان سے افراد کی مساعی کی رہنمائی تھا۔ اس وقت کی ممتاز شخصیتیں، جو اگرچہ عوامی خواہش آزادی کی حصہ دار اور مظہر تھیں، ایک خاص عظمت کی حامل تھیں۔ جو قوم پر اثر انداز ہوئی۔ لیکن انہوں نے یہ عظمت اور صلاحیت قوم سے حاصل نہیں کی۔

مطلق العنان حکومتوں میں بڑے بڑے امراء، جو تخت کے قریب ہوتے ہیں، حکمران کی خوشامد کرتے ہیں۔ اور رضاکارانہ طور پر اس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ لیکن قوم کی ایک بڑی اکثریت اس نوع کی غلامی کی شکار نہیں رہتی۔ وہ اطاعت قبول کرتی ہے تو اپنی کمزوری، عادت یا جہالت اور بعض اوقات وفاداری کی امید کرتی ہے۔ بعض اقوام ایسی بھی ملیں گی۔ جنہوں نے اپنی خواہشات کو اپنے حکمران کی خواہشات اور جذبات تفخر کے آگے قربان کر دیا۔ اس طرح انہوں نے ایسی اطاعت قبول کرنے پر بھی آزادیٔ عمل کا مظاہرہ کیا۔ ان قوموں کی حالت قابلِ رحم ضرور ہے۔ لیکن اس سے ان کی بے عزتی نہیں ہوتی۔ اپنی

مرضی کے خلاف کسی چیز کو انجام دینے اور دکھاوے کی خاطر کسی دوسرے شخص کی انجام دی ہوئی چیز کو قبول کرنے میں بڑا فرق ہے۔ اوّل الذکر تو ایک کمزور شخص کی کمزوری کا اظہار ہے اور دوسری بات ایک کاسہ لیس ہی کو زیب دیتی ہے آزاد ملکوں میں جہاں ہر کہ ومہ کو امورِ مملکت میں اپنی رائے دینے کی اجازت ہوتی ہے۔ وہاں ایسے لوگ زیادہ تعداد میں ملیں گے۔ جو اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔

جمہوری ملکوں میں خوشامد اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ کار زیادہ رائج ہے۔ اور یہ بات خاص طور پر ان ملکوں پر صادق آتی ہے جہاں امریکہ کی طرح جمہوری ادارے منظم ہوں۔ اور جہاں اکثریت کی طاقت اس قدر ناطق ہو کہ ایک شہری کو اپنے حقوق ہی سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔

امریکہ میں اقتدار کے مالک ہزاروں لوگوں میں چند ہی لوگ ایسے ہیں جن میں مردانہ صفات اور جرأت آزادی فکر ہے جو امریکہ کے اوّلین قائدین کا طرۂ امتیاز تھا۔ بنظر ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام امریکیوں کے ذہن ایک ہی سانچے میں اس طرح ڈھالے گئے ہیں کہ وہ ایک ہی راستہ پر چلتے ہیں۔ ایک اجنبی کو بسا اوقات ایسے شہری ملتے ہیں جنہیں اپنے ملک کے ان نقائص کا علم ہے اور جو حالات کی اس افتاد سے بیزار ہیں۔ اور ان کے پاس اس کی اصلاح کے لیے علاج بھی ہے۔ لیکن ان کی باتوں کو کسی غیر ملکی کے سوا کوئی اور سننے والا نہیں ملے گا۔

عام طور پر حکومتیں ناطاقتی کی وجہ سے یا استبداد کی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہیں اوّل الذکر صورت میں اگر حکومت کے ہاتھ سے طاقت نکل جاتی ہے تو دوسری صورت میں اقتدار ان سے چھین لیا جاتا ہے۔ متعدد مبصّرین نے جنہوں نے

جمہوری ملکوں کی نراجی حالت دیکھی ہے ۔ یہ قیاس کیا ہے کہ ان ملکوں کی حکومتیں کمزور تھیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ جب دو جماعتوں میں جنگ شروع ہوتی ہے تو حکومت کا معاشرہ پر سے کنٹرول جاتا رہتا ہے ۔ لیکن میرے خیال میں یہ بات درست نہیں کہ جمہوری طاقت عام طور پر قوت اور وسائل سے محروم رہتی ہے ۔ ہاں یہ درست ہے کہ وہ قوّت کے ناجائز استعمال اور وسائل کے غلط استعمال کی بنا پر ناکام رہ جاتی ہے ۔ نراجی حالت اس کے استبداد اور غلطیوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ۔ طاقت کی کمی کی وجہ سے نہیں ۔

یہاں استحکام اور قوّت میں فرق کرنا ضروری ہے ۔ جمہوری ملکوں میں جو طاقت معاشرہ پر حکمرانی کرتی ہے وہ مستحکم نہیں ہوتی ۔ کیونکہ وہ اکثر ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ منتقل ہوتی رہتی ہے ۔ اور اس کے طریقہ کار میں بھی اختلاف رونما ہوتا رہتا ہے ۔ لیکن وہ جس طرف بھی اپنا رُخ کرتی ہے اس کی قوّت ناقابل مزاحمت ہوتی ہے ۔ امریکی جمہوری حکومتیں میرے خیال میں اس قدر مرکزیت کی حامل نہیں جیسی یورپ کی مطلق العنان حکومتیں ہیں ۔ اس لیے میں اس خیال کو درست نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے تباہ ہو جائے گی ۔

اگر امریکہ میں کبھی آزاد ادارے تباہ ہوئے تو اس کی وجہ اکثریت کی مطلق العنانی ہو گی ۔ جو ممکن ہے کہ کسی وقت اقلیتوں کو اس بات پر مجبور کر دیں کہ وہ تنگ آ کر جنگ و جدال پر تُل جائیں یہ نراج اکثریت کی مطلق العنانی کی وجہ سے آئے گا ؎

۱۳۔ اکثریت کے استبداد میں اعتدال پیدا کرنے والے عوامل

میں نے مرکزیت کی حامل حکومت اور مرکزی انتظامیہ کے فرق کو واضح کر دیا ہے۔ امریکہ میں اوّل الذکر شے موجود ہے لیکن ثانی الذکر سے کوئی واقف نہیں ہے۔ اگر امریکہ میں یہ دونوں چیزیں یکجا موجود ہوتیں اور ان دونوں کی متحدہ طاقت کے ہاتھ میں ملک اور ملک کے عوام کی باگ ڈور ہوتی تو امریکہ سے آزادی بہت جلد عنقا ہو جاتی۔

مگر امریکہ میں اکثریت، جو لبا اوقات مطلق العنانی اور استبداد کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اب بھی استبداد کے مختلف ہتھیاروں سے محروم ہے۔ امریکی جمہوریتوں میں مرکزی حکومت نے صرف چند امور ہی تک اپنا دائرہ اختیار محدود رکھا ہے جو لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کیلئے کافی ہیں۔ معاشرہ کے ثانوی امور میں مرکزی اقتدار نے کبھی مداخلت نہیں کی اور نہ ہی کبھی اس قسم کی خواہش ظاہر کی ہے۔ اکثریت زیادہ سے زیادہ مطلق العنان ہے لیکن اس نے مرکزی حکومت کے اختیارات میں کبھی اضافہ نہیں کیا، اور اس کے اقتدارات اور اختیارات صرف چند امور تک محدود ہیں۔ اس طرح اگرچہ بعض امور میں اکثریت کی مطلق العنانی تکلیف دہ ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ ہر شے پر محیط نہیں ہوتی۔ کوئی غالب سیاسی جماعت خواہ کسی جذبہ سے مغلوب ہو کر کام نہ کرے۔ اور اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے میں وہ خواہ کیسی ہی سرگرمی اور جوش و خروش نہ دکھائے، وہ تمام شہریوں کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ اس کی خواہشات کی یکساں طرح پیروی کریں۔ جب کوئی مرکزی حکومت جو اکثریت کی نمائندگی کرتی ہے کوئی ملک گیر حکم جاری کرتی ہے تو اس کی تکمیل کے لیئے اسے اپنے کارندوں کو

ہدایت دینا پڑتا ہے۔ جس پر لیبا اوقات مرکزی حکومت کا راست کنٹرول نہیں ہوتا۔ اور جنہیں وہ ہمیشہ ہدایات نہیں دے سکتی۔ بلدی اور شہری ادارے ایک بند کا کام دیتے ہیں یعنی اکثریت کی خواہش کے سیلاب کی روک تھام کرتے ہیں۔ یا اس کی قوّت کو تقسیم کر دیتے ہیں۔ اگر ایک استبدانہ قانون منظور بھی ہو جائے تو اس کی تعمیل کے دوران اور طریقہ کار کے سلسلہ میں آزادی کی حفاظت ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اکثریت اس قدر نیچے نہیں اتر سکتی کہ جزئیات میں دخل دے۔ وہ اس بات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔ کیونکہ اسے اپنے اختیارات کا کامل شعور بھی نہیں ہوتا۔ وہ صرف اپنے فطری اختیارات سے واقف ہے۔ لیکن وہ ان اختیارات میں اضافہ کے حق سے ناآشنا ہے۔

امریکیوں اور ان کے رسوم اور قوانین کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ قانون کے ارکان کو جو اثر و اقتدار دیا ہے اور یہ لوگ حکومت پر جو اثر ڈالتے ہیں، وہ جمہوریت کی زیادتیوں کے خلاف ایک زبردست ضمانت ہے، جو لوگ قانون کا خاص طور پر مطالعہ کرتے ہیں ان میں نظم کی ایک خاص قسم کی عادت قواعد و ضوابط سے ایک خاص قسم کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ جبلی طور پر مختلف تصوّرات میں ایک تعلق قائم کرنے کی عادت پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اس بنا پر وہ فطری طور پر انقلابی جذبات کے مخالف ہوا کرتے ہیں۔

قانون دان کو علم کے اس خاص شعبہ میں مہارت رکھنے کی بنا پر، معاشرہ میں ایک خاص مرتبہ حاصل رہتا ہے۔ اور ذہین طبقہ میں ایک خاص گروہ کی حیثیت سے شمار کیئے جاتے ہیں۔ اپنے روزمرّہ کے کام میں انہیں ہمیشہ اپنے برتر درجہ کا احساس رہتا ہے۔ وہ ایک ایسے علم کے ماہر ہیں جو انتہائی اہم اور ضروری ہے۔ لیکن جس کے بارے میں لوگوں کو کم واقفیت ہوتی ہے۔ وہ شہریوں کے درمیان ثالث اور مصالحت کنندہ

کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مقدمات اور تنازعات میں فریقین کے اندھے جذبات کی اپنے مقاصد کے تحت رہنمائی کرنے کی عادت کی وجہ سے وہ عوام کی اصابت رائے اور قوت فیصلہ کو حقارت آمیز نظر سے دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ مستزاد یہ کہ قانون دان بحیثیت مجموعی ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ جماعت سازی ارادتاً ہوئی ہو مطالعہ اور طریقہ کار کی یکسانیت، قانون دانوں میں ایک جماعتی یگانگت پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ قانون دانوں میں بھی اشرافیہ کی بعض عادتیں اور مذاق ملتے ہیں۔ نظم و ضبط اور قاعدہ پرستی کی شدت دونوں میں مشترک ہوتی ہیں۔ اور وہ عوام کے فعل و عمل سے یکساں قسم کی کراہت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور دونوں کے دلوں میں عوام کی حکومت کے نظریہ سے ایک ہی قسم کی نفرت پائی جاتی ہے۔

میرا ادعا یہ نہیں ہے کہ قانون سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ ہمیشہ ہمیشہ نظم اور ضبط کے حامی اور جدت کے دشمن رہے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی اکثریت ایسی ہے۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں وکیلوں کو بغیر کسی مخالفت کے ایک اونچا اعزاز حاصل ہو تو وہ فطری طور پر قدامت پسند اور غیر جمہوری ہوں گے۔ جب اشرافیہ اس طبقے کے لوگوں کو اپنی صفوں سے خارج کرے گی تو ایسے دشمنوں کو مشتعل کرے گی جو اس سے زیادہ مضبوط ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی محنت کی بنا پر طبقہ امراء سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ اور جو اپنے آپ کو ذہانت میں طبقہ امراء سے اعلیٰ نہیں تو کم از کم مساوی المرتبہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن جہاں اشرافیہ اس طبقہ کیلئے بعض حقوق دینے پر آمادگی ظاہر کرتی ہے تو وہاں یہ دونوں طبقے ایک خاندان کی طرح اشتراک عمل کرتے ہیں۔

قانون دان کا دائمی تعلق نظم عامہ سے ہوتا ہے۔ اور نظم عامہ کا بہترین ضامن اقتدار ہے اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ اگر قانون دان آزادی کی قدر کرتے ہیں تو وہ اس سے زیادہ قانون پسندی کو ترجیح دیتے ہیں۔ وہ استبداد سے زیادہ لاقانونی قوت

سے ڈرتے ہیں۔

وکلاء کی سیاسی طاقت کے لئے جمہوریت کی حکومت موزوں ترین ہوتی ہے۔ اس لئے کہ جب متمول شرفاء اور شاہزادوں کا طبقہ حکومت سے خارج رہتا ہے تو لازمی طور پر ان سب کی جگہ قانون دان ہی لیتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ معاشرہ میں واحد صاحبِ دانش و بصیرت لوگ رہ جاتے ہیں۔ اگر وکلاء اور اہلِ قانون اپنے مذاق کے اعتبار سے اشرافیہ کے قریب ہوتے ہیں تو وہ اپنے مفادات کے لحاظ سے عوام سے زیادہ نسبت رکھتے ہیں۔ جمہوریت کے میلانات اور رجحانات میں اس کی کمزوریوں میں حصہ لئے بغیر قانون دان طبقہ، جمہوریت کی حکومت کو پسند کرتا ہے۔ وہ اس بناء پر جمہوریت کی حکومت سے دوگونہ اختیار حاصل کرتا ہے۔ جمہوری ریاستوں میں لوگ وکیلوں کو شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھتے، کیونکہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وکلاء عوامی مفادات کے خادم ہوتے ہیں۔ لوگ ان کی باتیں سنتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے ساتھ کسی قسم کے شرانگیز ارادے وابستہ نہیں کیئے جاتے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ قانون دان بھی جمہوری اداروں کا تختہ الٹنا نہیں چاہتے۔ لیکن ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ جمہوریت کو ایسے ذرائع سے اس کی اصل راہ سے ہٹایا جائے۔ جو جمہوریت کے لیئے فطری طور پر میل نہیں کھاتے۔ وکلاء باعتبار پیدائش اور بلحاظ مفادات عوام سے ہوتے ہیں اور عادات اور مذاق کی بناء پر اشرافیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ معاشرہ کے ان دونوں طبقات کے درمیان ایک کڑی کا کام دیتے ہیں۔

امریکہ میں شرفاء اور ادبی شخصیتیں نہیں ہیں اور لوگ عادتاً متمول طبقہ پر اعتماد نہیں کرتے۔ چنانچہ وکلاء معاشرہ میں سیاسی اعتبار سے سب سے زیادہ طاقت ور اور مہذب طبقہ ہیں۔ اس لیئے انہیں جدت پسندی سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر مجھ سے دریافت کیا جائے کہ امریکہ میں اشرافیہ کون ہیں تو میں بلا پس و پیش کہوں گا کہ وہ

امیروں کا طبقہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ بلکہ اشرافیہ طبقہ وکلاء اور ججوں پر مشتمل ہے۔

غرض یہ کہ امریکہ میں قانون دانوں کا طبقہ سب سے زیادہ طاقتور ہے۔ امریکہ کے لوگ جب جذبات کی طاقت کے آگے مغلوب ہو جاتے ہیں یا اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں جلد بازی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ قانون دان طبقہ کا ہی غیر محسوس اثر ہوتا ہے جو انہیں دائرہ اعتدال سے تجاوز کرنے سے روکتا ہے۔

عدالت ہائے انصاف ایک ایسا ظاہری باہر آلہ کار ہوتے ہیں جن کے ذریعہ قانون دان جمہوریت پر کنٹرول کرتے ہیں۔ جج قانون دان ہوتا ہے اور وہ بلاشبہ نظم وضبط اور اصول وقواعد سے محبت رکھتا ہے۔ اور اسے قانون کے ذریعہ استحکام پیدا کرنے میں دوگونہ لذت محسوس ہوتی ہے۔ قانونی پیشہ میں مہارت نے اس کے لیئے معاشرہ میں ایک بلند مقام دے رکھا ہے۔ اور اس کا سیاسی اختیار اس کے رتبہ اور امتیاز میں اضافہ کرتا ہے اور اس طرح ایک مخصوص طبقے کا جزو بن جاتا ہے۔ چونکہ اسے قوانین کو غیر آئینی قرار دینے کا اختیار حاصل رہتا ہے اس لیئے وہ ہمیشہ سیاسی امور میں مداخلت کرتا رہتا ہے۔ وہ لوگوں کو قانون بنانے پر مجبور تو نہیں کر سکتا لیکن وہ انہیں اس بات کے لیئے مجبور کر سکتا ہے کہ ان قوانین کی پابندی کریں جو خود انہوں نے وضع کیئے ہیں۔

یہاں یہ فرض نہیں کرنا چاہیئے کہ امریکہ میں قانون کی روح صرف عدالتوں میں کارفرما ہوتی ہے۔ اس کا دائرہ اثر عدالتوں سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ چونکہ وکلاء کا طبقہ ایسا ہوتا ہے جنہیں لوگ شک وشبہ کی نظر سے نہیں دیکھتے اس لیئے انہیں متعدد عوامی اور سرکاری عہدوں سے نوازا جاتا ہے وہ مجالس قانون ساز کے رکن ہوتے ہیں۔ انتظامیہ کی صدارت کے فرائض انجام دیتے ہیں اور اس طرح

وہ قانون سازی اور تعمیل قانون میں زبردست اثر ڈالتے ہیں۔ مگر قانون دان بھی عوامی رجحانات اور مطالبات کی رو کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہیں۔ یہ رو اس قدر طاقت ور ہوتی ہے کہ اس کی مزاحمت ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود قانون دانوں کا جو اثر ہوتا ہے اس کا بعض باتوں سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ امریکہ میں سیاسی قوانین میں بے شمار تبدیلیاں کی گئیں۔ لیکن جس چیز میں خاص طور پر تبدیلی نہیں ہوئی وہ شہری قوانین ہیں۔ اور اسکی وجہ یہ کہ شہری قوانین کی تبدیلی اور تغیر کے سلسلہ میں عام شہری قانون دانوں کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہیں اور یہ کام انھوں نے قانون دانوں کے سپرد کر رکھا ہے اور امریکی قانون دان قانون کی مرضی پر بات چھوڑ دی جائے تو وہ پھر کسی قسم کی جدت پسند نہیں کرتا اور یہی وجہ ہے شہری قانون میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے قانون پسندی کی عمارت کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ امریکہ میں شاید ہی کوئی ایسا سیاسی مسئلہ ہو جو بالآخر عدالت کے ذریعہ حل نہ کیا گیا ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں اپنے روزمرہ معاملات میں قانونی نظریات اور بسا اوقات قانونی زبان بھی استعمال کرنے کی عادی ہو گئی ہیں۔ چونکہ سرکاری عہدیدار اور عوامی نمائندے عام طور پر قانون دان ہی ہوتے ہیں۔ وہ امور عامہ میں بھی اپنے پیشہ کی روایات اور رسوم رائج کرتے ہیں جیوری کا ادارہ اس عادت کو تمام طبقات میں منتقل کرتا ہے۔ قانون کی زبان عوام کی زبان بن جاتی ہے۔ اور قانون کی روح جو سکولوں اور عدالتوں میں پیدا ہوتی ہے۔ معاشرہ کے ہر دائرہ عمل میں سرایت کر جاتی ہے۔ امریکہ میں قانون دانوں کا گروہ ایک ایسی جماعت ہوتی ہے جس سے کوئی خوف نہیں کھاتا۔ جس کا کوئی نشان امتیاز نہیں ہوتا۔ جو حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالتی رہتی ہے۔ اور معاشرہ کی یہ تحریک ہی روایتی جگہ پیدا کرتی ہے۔ مگر یہ جماعت

معاشرہ کے تمام حصّوں پر حاوی ہوتی ہے۔

امریکہ میں عدالت ہائے انصاف کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے جیوری کے ادارہ پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ جیوری کے ذریعہ مقدمہ کے طریقہ پر ہر دو نقاط ہائے نظر سے غور کیا جا سکتا ہے۔ عدالتی نقطہ نظر سے اور جیوری بحیثیت ایک سیاسی ادارے کے۔

میں یہاں جیوری پر سیاسی ادارے کی حیثیت سے بحث کروں گا۔ جیوری کو محض عدالتی ادارے کے طور پر دیکھنا لوگوں کی تنگ نظری ہوگی۔ ممکن ہے کہ جیوری کے فیصلے کا اثر ایک مقدمہ زیر بحث پر بے حد ہوتا ہو۔ لیکن اس کا زیادہ اثر معاشرہ پر ہوتا ہے۔ جیوری بہر حال ایک سیاسی ادارہ ہے اور اس کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیئے ایک سیاسی ادارے کے طور پر غور کرنا ضروری ہے۔

جیوری کا ادارہ اشرافی یا جمہوری ہو سکتا ہے اور اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ جیوری کے ارکان کس طبقہ سے لیئے جاتے ہیں۔ لیکن جیوری ہمیشہ جمہوری قمیت کی حامل اور جمہوری کردار کی محافظ ہوتی ہے۔ اور اس طرح وہ معاشرہ کی باگ ڈور کو ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں منتقل کرنے کا باعث بنتی ہے جن پر حکمرانی کی جاتی ہے۔ سیاسی قوانین کی اصل طاقت تعزیری قوانین میں مضمر ہوتی ہے اور اگر یہ طاقت کمزور ہو تو قانون جلد یا بدیر اپنا اثر کھو دیتے ہیں۔ جو شخص مجرموں کو سزا دیتا ہے وہ حقیقی حاکم ہوتا ہے۔ ہر جیوری کا ادارہ، خود لوگوں کو یا لوگوں کے ایک طبقہ کو عدالتی حکام کے رتبہ پر پہنچا دیتا ہے۔ جیوری کا ادارہ شہریوں کو یا شہریوں کے ایک طبقہ کو معاشرہ کی نگرانی کا اختیار دیتا ہے۔ اور اس طرح جیوری قومی کردار پر ایک زبردست اثر ڈالتی ہے۔

جیوری، ججوں کی سپرٹ کو تمام شہریوں تک منتقل کرتی ہے۔ اور یہی سپرٹ آزاد اداروں کے لیئے ایک شہری اساس کا کام دیتی ہے۔ یہ سپرٹ شہریوں میں یہ عادت پیدا کرتی ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کا احترام کریں جن کے بارے میں ایک فیصلہ صادر کر دیا گیا ہے۔ اور یہی سپرٹ ان میں حق کا تصوّر پیدا کرتی ہے۔ اگر یہ دونوں عناصر خارج کر دیئے جائیں۔ تو آزادی کی محبت محض ایک تباہ کن جذبہ ہو جائے گی۔ یہ سپرٹ لوگوں کو یہ سکھلاتی ہے کہ وہ منصفانہ اصولوں پر عمل کریں۔ ہر شخص یہ سیکھتا ہے کہ اسے اپنے ہمسایہ کے بارے میں کس طرح کسی فیصلہ پر پہنچنا چاہیئے۔

غرض یہ کہ جیوری کا ادارہ لوگوں میں فیصلہ کرنے کی عادت پیدا کرتا ہے" اور ان کی فطری ذہانت میں اضافہ کرتا ہے۔ میرے خیال میں جیوری کے ادارہ کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے۔

اس طرح جیوری جو بنظر ظاہر عدالت کے اختیارات میں تحدید پیدا کرتی دکھائی دیتی ہے۔ دراصل عدالت کی قوت مستحکم کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی ملک میں جج اتنے زیادہ طاقت ور نہیں ہیں جتنے کہ ان ملکوں میں جہاں جج اپنی طاقت میں لوگوں کو شریک بناتے ہیں۔

۱۴۔ جمہوریت کو برقرار رکھنے میں مدد دینے والے عوامل

عوام کی خواہش اور مرضی کے قطع نظر، ایسے ہزاروں عوامل ہیں جو امریکہ میں جمہوریت کو برقرار رکھنے میں ممد و معاون ہیں۔

امریکہ کے کوئی پڑوسی ممالک نہیں ہیں۔ نتیجتہً انہیں بڑی جنگیں لڑنا نہیں پڑیں۔ اور نہ ہی اسے مالی بحرانوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اسی بنا پر نہ امریکی عوام پر زیادہ محصول لگانے پڑے اور نہ بڑی بحری فوجیں بنانی پڑیں۔ اور نہ امریکہ میں بڑے بڑے حربوں کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اور نہ ہی امریکی عوام کو اس وبا سے سابقہ پڑا جو جمہوریتوں کے لیئے تمام برائیوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ اور وہ عسکری عظمت ہے۔ "عسکری عظمت" قوموں کی قسمت پر جو اثر ڈالتی ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔

امریکہ میں کوئی بڑا شہر نہیں ہے جس کا اثر راست یا بالراست طور پر تمام ملک کے باشندوں پر ہو سکتا ہو۔ میں تو اس کو امریکہ میں جمہوری اداروں کو برقرار رہنے کی اوّلین وجہ قرار دوں گا۔ شہروں میں لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے، صلاح و مشورہ کرنے اور ایک خاص شعور پیدا کرنے سے روکا نہیں جا سکتا۔ شہروں کو بڑی اسمبلیوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جس کے تمام شہری رکن ہوتے ہیں۔ اور معاشرہ کی آبادی مجسٹریٹوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اور عام طور پر شہروں کے لوگ، سرکاری عہدیداران کی مداخلت کے بغیر ہی اپنی خواہشات کی تعمیل کرتے ہیں۔

صوبوں کو ایک شہر کے تابع بنا دینا ایسا ہے جیسے ایک مملکت کی تقدیر چند ہاتھوں میں منتقل کر دینا۔ یہ بات نہ صرف نامنصفانہ ہے بلکہ خطرناک بھی ہے۔ بڑے شہروں کا غلبہ نمائندہ طرزِ حکومت کے لیئے نقصان دہ ہوتا ہے۔

امریکیوں کو اپنی تاریخ کی ابتداء ہی سے موافق حالات ملے۔ امریکیوں کے آبا واجداد اپنے ساتھ مساوات، روایات اور ترقی و ذہانت لائے تھے۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ جمہوری حکومت کا قیام تھا۔ علاوہ ازیں امریکہ کے اوّلین آباد کاروں نے اپنی آئندہ نسلوں کے لیئے ایسے رسوم، قوانین اور افکار و نظریات ورثہ میں چھوڑے جو جمہوری معاشرہ کے قیام اور استحکام میں ممد و معاون ہوئے۔

امریکہ میں جمہوری طرزِ حکومت کے قیام اور برقرار رہنے میں جن متعدد عوامل نے مدد دی ان میں سب سے زیادہ اہم خود ملک کا جغرافیائی محل وقوع ہے۔ امریکیوں نے مساوات اور آزادی سے محبّت تو اپنے اسلاف سے ورثہ میں حاصل کیا۔ لیکن خدا نے وسیع و عریض برِ اعظم انہیں دے کر آزاد اور مساوی رہنے کے ذرائع عطا کیئے۔ عام خوشحالی کسی بھی حکومت کے استحکام کا باعث ہوتی ہے لیکن جمہوری حکومتوں کے لیئے یہ ضروری ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی کا انحصار اکثریت کی مرضی پر ہوتا ہے۔ اور خاص طور پر اکثریت کے اس حصّہ کی مرضی پر ہوتا ہے جو زیادہ حاجت مند ہوتا ہے۔ جب لوگوں پر حکمرانی کی جائے تو انہیں خوش اور خوش حال رکھنا ضروری ہے ورنہ وہ مملکت ہی کا تختہ الٹ سکتے ہیں۔ اور مصیبت اور تکلیف انہیں ان زیادتیوں کے ارتکاب پر مجبور کرتی ہے جو عام بادشاہ اپنی ہوس جاہ اور نشۂ قوّت کی بناء پر کرتے ہیں۔ قوانین کے علاوہ امریکہ میں عام خوشحالی کی بے شمار وجوہ ہیں، امریکہ میں نہ صرف قانون جمہوری ہیں بلکہ فطرت خود لوگوں کے مفادات کی مؤید ہے۔

برِّاعظم امریکہ وسائل قدرت سے مالا مال ہے اور آباد کاروں کے لیئے قدرت کے لامحدود خزانے اپنا منہ کھولے ہوتے ہیں۔ اور لاکھوں یورپی نسل باشندے پُرامن طریقے سے امریکہ کے گوشہ گوشہ میں پھیل رہے ہیں۔ ہراول دستے کے طور پر چار پانچ ہزار سپاہی آباد کاروں کے آگے ہمیشہ کی طرح علاقوں کو صاف کرتے رہتے ہیں۔

ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ امریکہ کے صحراؤں اور جنگلوں کو یورپی تارک وطن آباد کر رہے ہیں۔ جو ہر سال امریکہ کے ساحلوں پر اترتے ہیں۔ اور امریکی مشنریوں کی اولاد اپنے آباؤ و اجداد کے علاقہ میں رہتی ہے۔ حالانکہ بات یہ ہے کہ یورپی تارکان وطن عام طور پر امریکہ کی سرزمین پر جب قدم رکھتا ہے تو وہاں اس کا نہ کوئی دوست ہوتا ہے اور نہ رشتہ دار اور نہ ہی اس کے پاس وسائل ہوتے ہیں۔ نتیجتہً اسے ابتدا میں ملازمت اور نوکری ہی سے پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔ اور شاید ہی کبھی وہ امریکہ کے ساحل سے ملحق صنعتی اور آباد علاقوں سے باہر قدم رکھتا ہے۔ جنگلات کی دریافت اور ان سے استفادہ کے لیئے نہ صرف وسائل اور دولت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ جسمانی طور پر ایک شخص کو نئی آب و ہوا کی سختیوں کا عادی ہونا پڑتا ہے۔ یہ امریکی ہی ہیں جو روزانہ اپنے جائے پیدائش کو چھوڑ کر لق و دق جنگلوں کا رُخ کرتے ہیں۔ اس طرح یورپی اپنے ملک میں اپنا گھر بار چھوڑ کر امریکہ کے ساحل کو اپنا وطن بناتا ہے۔ تو ساحل پر آباد پرانے امریکی ملک کے اندرونی علاقوں میں دشت پیمائی کرتے ہیں۔ یہ دوہری ہجرت مسلسل ہے۔ یہ وسط یورپ سے شروع ہوتی ہے اوقیانوس کو پار کرتی ہے اور نئی دنیا کے خاموش اور تاریک علاقوں میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں لوگ کشاں کشاں ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کی زبان، الگ، ان کی طرزِ معاشرت الگ، ان کا مذہب الگ ——

لیکن ان سب کا مقصد ایک ہے —— انہیں یہ بشارت دی گئی ہے کہ مغرب میں کس جگہ قسمت ان کی یاوری کرے گی۔ اور اس قسمت کی تلاش میں مغرب کی طرف رواں دواں ہیں۔

بسا اوقات انسان کی ترقی کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے کہ وہ بڑے بڑے جنگلوں کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ تناور درخت ان کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے انہیں آگے بڑھنے کے لیئے راستہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اور جب انسان گذر جاتا ہے تو وہ دوبارہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ مغرب کی نئی ریاستوں کی سیاحت کرتے ہوئے جنگلوں اور صحراؤں کے بیچوں بیچ ایسی متعدد غیر آباد بستیاں ملیں گی جنہیں انسانوں نے چند دنوں کے لیئے اپنا مسکن بنایا اور چھوڑ دیا —— اور انسان کے رخصت ہونے کے بعد یہ جنگل پھر اپنی اصلی حالت پر عود کر آئے۔

امریکہ میں جمہوری اداروں کے قایم رہنے میں، حالات، قانون اور طرزِ معاشرت کا دخل ہے۔ اکثر یورپی صرف پہلی وجہ کو زیادہ اہمیت دینے کے عادی ہیں۔ یہ درست ہے کہ انگلو امریکی اس نئی دنیا میں مساوی سماجی مرتبہ کے ساتھ آباد ہوئے تھے۔ ان میں شریف اور کمین کا امتیاز نہ تھا۔ پیدائیشی تعصّبات کی طرح پیشہ ورانہ تعصّبات بھی ناپید تھے۔ چونکہ خود معاشرہ جمہوری نوعیّت کا تھا اسلیئے جمہوریت کی حکمرانی قایم کرنے میں کوئی دقّت پیش نہیں آئی۔ لیکن یہ بات صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ ہی کی نمایاں خصوصیّت نہ تھی۔ امریکہ کی تمام نوآبادیوں کو ایسے ہی لوگوں نے آباد کیا۔ جو یا تو مساوی المرتبہ تھے یا وہاں آباد ہو کر مساوی المرتبہ ہو گئے تھے۔ نئی دنیا کے کسی حصّہ میں یورپی آباد کار اشرافیہ قایم نہ کر سکے۔ لیکن صرف ریاست ہائے متحدہ امریکہ ہی میں جمہوری ادارے پروان چڑھ سکے۔

امریکی یونین کے کوئی بیرونی دشمن نہیں ہیں۔ وہ ایک وسیع و عریض سمندر میں

الگ تھلگ جزیرے کے مانند ہے۔ لیکن جنوبی امریکہ کے ہسپانوی بھی ایسے ہی سب سے الگ تھلگ تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ بڑی بڑی فوجیں رکھنے کے بوجھ سے آزاد نہ ہو سکے۔ اگرچہ ان کے کوئی بیرونی دشمن نہ تھے۔ لیکن انہوں نے ایک دوسرے کے خلاف جنگیں لڑیں۔ صرف انگلو امریکی جمہوریت ہی ایسی تھی جس نے اپنے آپکو ہمیشہ حالتِ امن میں رکھا۔

امریکی یونین کا علاقہ بے حد وسیع ہے اور انسانی سرگرمیوں کے لیئے ایک بے پناہ وسیع میدان مہیا کرتا ہے۔ چنانچہ محنت اور مشقت کے لیئے ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ موجود ہے۔ دولت کی خواہش نے جاہ و مرتبت کی خواہش کی جگہ لے لی ہے۔ اور تمول کے شعور نے دھڑے بندی کے جذبات میں کمی پیدا کر دی ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی علاقہ ایسا ہو جہاں جنوبی امریکہ کی طرح زرخیز میدان، عظیم دریا اور قدرت کے بے شمار خزانے ہوں۔ جہاں اب تک انسان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ اور جو انسانی قوّت عمل کے لیئے ہمیشہ دعوت مبارزت دیتے رہیں گے، لیکن اس کے باوجود جنوبی امریکہ والے اپنے جمہوری اداروں کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اگر کسی قوم کا دارومدار اس کے الگ تھلگ رہنے پر ہوتا ہو تو جنوبی امریکہ کے ہسپانیوں کو اپنی قسمت کا گلہ کرنے کی وجہ باقی نہ تھی۔ اگرچہ ان کا تمول امریکہ کے آبادکاروں کے مساوی نہ ہوتا تو بھی وہ اس قدر اچھی حالت میں ہوتے کہ ان سے یورپ کی اکثر قومیں رشک کر سکتیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود کرہ ارض پر کوئی ایسی قوم نہیں جو جنوبی امریکہ والوں سے زیادہ مصیبت میں ہو۔

ان باتوں سے یہ ثابت ہوا کہ طبعی وجوہات، شمالی امریکہ جیسے نتائج دوسرے علاقوں میں پیدا کرنے کیلئے نہ صرف ناکافی ہیں بلکہ وہ تو جنوبی امریکہ کی آبادی کو یورپی اقوام کی سطح تک بھی نہ لیجا سکے۔ طبعی اسباب کسی قوم کی تقدیر پر اس قدر

زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ جیسا کہ عام طور پر فرض کیا جاتا ہے۔

اہل امریکہ نے ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیئے جو ان کے آئین اور قانون کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں، اپنے ملک کی جغرافیائی اور طبعی حالت پر انحصار نہیں کیا۔ ان برائیوں کے انسداد کے لیئے جو عام طور پر جمہوری ملکوں میں ہوتی ہیں انہوں نے علاج تجویز کیئے۔ یہ علاج نئے تھے اور ان کی اپنی ذہانت اور کاوش کا نتیجہ تھے۔ اگرچہ تاریخ میں انہیں پہلی مرتبہ آزمایا گیا لیکن وہ کامیاب ثابت ہوئے۔ امریکیوں کے رسوم اور قوانین بھی ایسے نہیں جو کسی جمہوری قوم کی ضروریات کے ہم آہنگ ہوں بلکہ امریکیوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ جمہوریت کو قوانین اور رسوم کے ذریعہ سے باقاعدہ بنانے سے مایوس ہونا ایک بھیانک غلطی ہے۔ اگر دنیا کے دوسرے لوگ امریکہ کے اس تصوّر کو اندھی نقل سے اجتناب کیئے بغیر اپنائیں اور اسے اپنے سماجی حالات کے مطابق ڈھالیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں اس میں کامیابی نہ ہو۔

۱۵- امریکہ کے مستقبل کے امکانات

میں اپنے اس جائزہ کے اختتام کے قریب آ رہا ہوں۔

امریکہ کے مستقبل کی قسمت کے بارے میں روشنی ڈالتے ہوئے میں نے یہ کوشش کی ہے کہ اپنے موضوع کو دو واضح حصوں میں تقسیم کر دوں تاکہ ہر ایک حصہ پر زیادہ توجہ دے سکوں۔ فی الحال میرا مدعا یہ ہے کہ سارے مسئلہ کو ایک نقطہ نظر سے دیکھوں۔ میں جن خیالات کا اظہار کروں گا وہ زیادہ تفصیلی نہیں ہوں گے۔ لیکن ان میں زیادہ قطعیت ہو گی۔ کوئی سیاح جب ایک شہر کو خیرباد کہہ کر کسی قریبی پہاڑی پر چڑھ جاتا ہے تو وہ جوں جوں آگے بڑھتا جائے گا۔ اس کی نظروں سے وہ لوگ اوجھل ہوتے جائیں گے جن سے اس نے چند لمحہ پہلے ملاقات کی تھی۔ ان کے بے شمار گھر فاصلہ سے گڈ مڈ نظر آئیں گے۔ وہ بڑی بڑی سڑکوں اور چوراہوں کو پہچان نہ سکے گا۔ لیکن اس کی نظروں میں سارے شہر کے حدود آ جائیں گے۔ اور پہلی مرتبہ اسے پورا شہر بحیثیت مجموعی نظر آ سکے گا۔ چنانچہ شمالی امریکہ میں برطانوی نژاد نسل کے مستقبل کا نقشہ کچھ اس طرح میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس وسیع تصویر کی متعدد جزئیات میری نظروں سے اوجھل تو ہیں۔ لیکن سارے منظر کا واضح تصور موجود ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ جس علاقہ پر محیط ہے وہ دنیا کے قابل آباد علاقہ کا بیسواں حصہ ہے۔ اگرچہ امریکہ کا یہ علاقہ بجائے خود عریض و وسیع ہے لیکن یہ تصور کرنا غلطی ہو گی کہ انیگلو امریکن قوم اس علاقہ میں محدود رہے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس وقت بھی اس علاقہ سے ہٹ کر دور دور پھیل چکی ہے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ جب کہ ہم فرانسیسی بھی امریکی سرزمین پر عظیم فرانسیسی قوم کی داغ بیل ڈال سکے۔ تاکہ اس نئی دنیا میں انگریزوں کے اثر کا مقابلہ کیا جائے شمالی امریکہ میں فرانس یورپ سے زیادہ بڑے حصے پر قابض تھا۔ براعظم کے تین بڑے دریا بھی اس علاقہ سے گذرتے تھے۔ سینٹ لارنس اور مسیسیپی کے دہانہ کے درمیان آباد سُرخ ہندی فرانسیسی زبان کے سوا اور کسی زبان سے آشنا نہ تھے۔ اور اس علاقہ میں آباد تمام یورپی آباد کار فرانس ہی کی رسوم اور معاشرت سے واقف تھے۔

لیکن حالات نے فرانس کو اس عظیم ورثہ سے محروم کر دیا۔ جہاں بھی فرانسیسی آباد کار بہ اعتبار تعداد کم تھے۔ غائب ہو گئے۔ اور جو باقی رہ گئے وہ ایک چھوٹے سے علاقہ میں آباد ہو گئے۔ جہاں دوسرے قوانین کی حکمرانی ہے۔ زیریں کینیڈا کے ۴ لاکھ فرانسیسی باشندے اس قدیم فرانسیسی قوم کی ایک یادگار ہیں جو اس نئی دنیا میں گم ہو کر رہ گئے ہیں۔ اجنبی آبادیاں ان کے اطراف تیزی سے بڑھ رہی ہیں، ان کے شہروں میں غیر فرانسیسیوں کی اکثریت ہو رہی ہے اور ان کی زبان متاثر ہو رہی ہے۔ یہ آبادیاں شمالی امریکہ کے لوگوں کے ہم نسل اور ہم زبان ہیں اور اسی بنا پر میں نے یہ کہا تھا کہ برطانوی نسل کے لوگ صرف شمالی امریکہ میں محدود ہو کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ وہ شمال مشرق میں بھی پھیل گئے ہیں۔

جہاں تک شمال مغرب کا تعلق ہے وہاں اینگلو امریکی باشندوں کی راہ میں چھوٹی چھوٹی روسی نوآبادیوں کے سوا اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ لیکن جنوب مغرب میں میکسیکو ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ اس نئی دنیا کی ملکیت دو قوموں —— اینگلو امریکی اور ہسپانوی —— میں منقسم ہے۔ ان کی تقسیم کے حدود معاہدوں کے ذریعہ متعین کیے جا چکے ہیں۔ اگرچہ ان معاہدات کی شرائط اینگلو امریکنوں کے لیے بڑی سازگار ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ مستقبل قریب میں ان معاہدوں

کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ امریکی یونین اور میکسیکو کے درمیان وسیع علاقے ابھی غیر آباد ہیں۔ اور ان علاقوں میں امریکی قدیم باشندے اس وقت تک آباد رہیں گے جب تک کہ نوآبادکاروں کے قدم وہاں پہنچ نہ جائیں۔

"نئی دنیا" میں زمین کا مالک پہلا قابض ہوتا ہے۔ یہ اولین اور تیز گام آبادکار کے لیئے فطری انعام کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسے ممالک بھی جو پہلے سے ہی آباد ہو چکے ہیں اس نوعیت کے حملہ سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ ٹیکساس میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بارے میں مَیں نے کہیں اشارہ کیا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے باشندے مسلسل ٹیکساس کو ترک وطن کر رہے ہیں۔ جہاں وہ زمینیں خریدتے ہیں۔ اگرچہ وہ مقامی قوانین کی پابندی کرتے ہیں لیکن وہ اپنی زبان اور رسوم کی ایک الگ مملکت قایم کر رہے ہیں۔ اگرچہ ٹیکساس ابھی تک مملکت میکسیکو کا حصّہ ہے لیکن چند دن کے اندر وہاں کوئی میکسکن باقی نہ رہے گا۔ اینگلو امریکی جہاں بھی کسی اور نسل کی قوم سے ربط میں آتے ہیں، وہاں یہی بات واقع ہوتی ہے۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ نئی دنیا میں برطانوی نسل نے دیگر یورپی قوموں پر حیرت انگیز غلبہ حاصل کیا ہے۔ وہ بہ اعتبار تہذیب و ثقافت، صنعت اور طاقت سب سے برتر ہیں۔ جب تک کہ وہ محض جنگلوں اور کم آباد علاقوں سے محصور رہیں گے اور جب تک کہ ان کی راہ میں گنجان آبادیاں حائل نہ ہوں گی۔ اینگلو امریکی برابر آگے بڑھتے اور پھیلتے رہیں گے۔ معاہدوں کی حد بندیاں انہیں روک نہ سکیں گی۔ اس کے برعکس وہ ہر جگہ ان خیالی سرحدوں کو پار کرتے رہیں گے۔

نئی دنیا کے جغرافیائی حالات برطانوی نسل کے لوگوں کی شہری ترقی کے لئے خاص طور پر ساز گار ہیں۔ اس کی شمالی سرحدوں سے اِس پار قطب شمالی کا برفانی علاقہ پھیلا ہوا ہے۔ اور اس کی جنوبی سرحدوں سے ذرا نیچے ہٹ کر خطِ استوا کا جھلسا

دینے والا موسم ہے۔ اس طرح انیگلو امریکی برِاعظم امریکہ کے معتدل ترین اور قابل رہائیش خطہ میں آباد ہیں۔

عام طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ کی آبادی میں زبردست اضافہ "اعلان آزادی" کے بعد ہوا۔ یہ مفروضہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ امریکی آبادی کے نو آبادیاتی دور میں بھی اسی طرح اضافہ ہو رہا تھا جیسا کہ اس وقت ہو رہا ہے۔ اور امریکی آبادی بیس سال میں دوگنی ہو گئی۔ لیکن چونکہ اس وقت آبادی کم تھی، آبادی کے اضافہ کا یہ تناسب عیاں نہ تھا۔ اور اب چونکہ لاکھوں تک پہنچ گئی ہے۔ تو آبادی کے اضافہ کی رفتار سب کو محسوس ہوتی ہے۔

یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہیں کہ اس نئی دنیا میں برطانوی نسل کے اس پھیلاؤ کے رجحان کو روکا جا سکتا ہے۔ یونین کی ریاستوں میں انتشار اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی خانہ جنگیاں یا جھگڑے، جمہوری اداروں کا خاتمہ اور اس کے بعد قائم ہونے والی مستبد حکومتیں، اس رجحان میں عارضی ٹھہراؤ تو پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ تمام امکانی عوامل لوگوں کو بالآخر اپنے مقاصد کی تکمیل سے روک نہیں سکتے۔ جہاں ترقی اور تمول کے لیئے لامحدود امکانات موجود ہیں۔ اور جہاں ان تمام احتیاجات سے چھٹکارا مل سکتا ہے۔ مستقبل کے واقعات، خواہ کسی نوعیت کے ہوں، اہل امریکہ کو ان کے موسموں سے، ان کے دریاؤں سے اور ان کی سونا اگلنے والی زمینوں سے محروم کر سکتے ہیں۔ اور نہ ہی برے قوانین، انقلابات، نراجی کیفیت لوگوں کے دل سے مال و متاع کی محبّت اور جرأت آزمائی کی عادت نکال سکتی ہے جو انیگلو امریکی نسل کے کردار کی نمایاں ترین خصوصیت بن چکی ہے۔ یا انہیں اس علم ہی سے محروم کر سکتی ہیں جو ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

غرض یہ کہ اس غیر متعین مستقبل کے باوجود ایک بات یقینی ہے۔ ایک ایسے دور

ہیں جو یقیناً بہت قریب ہے۔ اور یہاں ہم قوم کی زندگی سے بحث کر رہے ہیں۔ یہ صرف انیگلو امریکی نسل ہی کے لوگ ہوں گے جو براعظم امریکہ میں قطب شمالی سے خط استوا تک اور بحر اوقیانوس کے ساحل سے لے کر بحر الکاہل کے ساحل تک آباد رہیں گے۔ انیگلو امریکی جس علاقہ پر قابض ہوں گے وہ یورپ کے تین چوتھائی علاقہ کے برابر ہوگا۔ چونکہ امریکی یونین کی آب وہوا یورپ کی آب وہوا سے زیادہ بہتر ہے۔ اور اس کے قدرتی امکانات غیر محدود ہیں اس لیئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی آبادی مستقبل قریب میں یورپ کی آبادی کے برابر ہوگی جب یورپ جو مختلف اقوام میں بٹا ہوا ہے اور جہاں قرون وسطی کی بربریت کی یاد تازہ کرنے والی جنگیں ہوتی رہتی ہیں۔ فی مربع میل ۔ ۱۴۰ افراد رہتے ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ امریکہ کی آبادی یورپ سے بڑھ نہ جائے۔

برطانوی نسل کی متعدد شاخوں کے خط وخال میں تبدیلی پیدا ہونے کے لیئے سالہا سال درکار ہوں گے۔ اور مستقبل قریب میں اس بات کا امکان نہیں کہ اس نئی دنیا میں آبادی کے مختلف طبقات میں امتیاز یا عدم مساوات کی حالت پیدا ہو۔ جنگ یا امن، آزادی یا استبداد، تمول یا غربت کی بنا پر انیگلو امریکی نسل کے لوگوں میں خواہ کسی قسم کے اختلافات پیدا ہوں، لیکن وہ کم از کم ایک سماجی حالت کو برقرار رکھیں گے۔

قرون وسطےٰ میں یورپ میں صرف مذہب ہی ایک ایسا طاقت ور بندھن تھا جو لوگوں کو متحد رکھتا۔ مگر نئی دنیا کے برطانوی اس قسم کے متعدد رشتوں کے حامل ہیں اور وہ ایک ایسے دور میں رہتے ہیں جبکہ مساوات کا رجحان عام اور طاقت ور ہے۔ قرون وسطےٰ ایک ایسا دور تھا جبکہ یہ بندھن ٹوٹ چکا تھا۔ ہر قوم، ہر صوبہ ہر شہر اور ہر خاندان اپنی انفرادیت برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ موجودہ زمانے میں

اس کے بالکل برعکس رجحان کارفرما ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقوام اتحاد کی منزل کی طرف بڑھتی جا رہی ہیں۔

ہمارے ذہنی وعلمی تبادلہ کے ذرائع دنیا کے دور دراز علاقوں کو ایک دوسرے سے متحد رکھتے ہیں۔ انسان ایک دوسرے سے اجنبی نہیں رہ سکتے۔ اور انہیں اس بات کا علم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کرۂ ارض کے کسی حصّہ پر کیا خاص واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آج یورپینوں اور نئی دنیا میں آباد ان کے ہم نسلوں کے درمیان اختلافات کم ہیں۔ اگرچہ دونوں کے درمیان ایک بڑا سمندر حائل ہے۔

یقیناً ایک وقت ایسا آئے گا جبکہ شمالی امریکہ کی سرزمین میں ۵ اکر ڈلر آدمی آباد ہوں گے۔ ان میں مکمّل مساوات ہوگی۔ وہ ایک خاندان کے رکن ہوں گے، ایک ہی مقصد سے وابستہ ہوں گے۔ ایک ہی تہذیب، ایک ہی زبان، ایک ہی مذہب اور یکساں قسم کے رسوم معاشرت اور آداب کی حفاظت کریں گے۔ ایک ہی قسم کے افکار وخیالات کے حامل ہوں گے۔ اس کے سوا ہر بات غیر یقینی ہے۔ مگر یہ بات یقینی ہے —— اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے ذہن بہ آسانی قبول نہیں کرتا ہے۔

عہد حاضر میں دو قومیں ایسی ہیں جن کا نقطہ آغاز مختلف تھا۔ لیکن دونوں ایک ہی مقصد کی طرف جا رہی ہیں۔ میری مراد روسیوں اور امریکنوں سے ہے۔ دونوں کا ارتقاء خاموشی سے شروع ہوا۔ اور ایسے وقت جبکہ دنیا کی توجہ اور امور پر مرکز تھی۔ انہوں نے اپنے آپ کو یک دم ایک تیسری قوم کی حیثیت سے اقوام عالم کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اور دونوں کے وجود اور عظمت کا تقریباً ایک ساتھ علم ہوا۔

دنیا کی دوسری اقوام اپنی ترقی کی قدرتی حدوں تک پہنچ چکی ہیں۔ انہیں تو

صرف اپنی طاقت برقرار رکھنا ہے۔ مگر یہ دونوں قومیں ابھی حالتِ ارتقا میں ہیں۔ دنیا کی دوسری قومیں رک گئی ہیں یا بڑی مشکل ہی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ مگر صرف یہ دو قومیں نہایت آسانی اور تیزی کے ساتھ ترقی کی ایسی راہ پر گامزن ہیں جن کی حدود کا تعین اس وقت نہیں کیا جا سکتا۔ امریکہ ان رکاوٹوں کے خلاف جدوجہد کر رہا ہے جو فطرت نے اس کی راہ میں کھڑی کی ہیں۔ روسیوں کے دشمن انسان ہیں امریکہ جنگل اور زندگی کے خلاف نبرد آزما ہے۔ اور روسی اپنی پوری قوت کے ساتھ تہذیب سے لڑ رہا ہے۔ امریکہ کی فتوحات ہل کے ذریعہ حاصل ہو رہی ہیں۔ اور روسی تلوار کے زور پر آگے بڑھ رہا ہے۔ انیگلو امریکی اپنے مقصد کی تکمیل کے لیئے اپنی ذاتی دلچسپی پر انحصار کرتا ہے۔ اور لوگوں کی جبلی طاقت اور شعور کو مکمل آزادی دیتا ہے۔ اور روسی معاشرہ کی تمام قوت اور اختیارات کو ایک ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ امریکی کا اصل اور بنیادی ہتھیار آزادی ہے اور روس کا غلامی۔ دونوں کا نقطہ آغاز مختلف ہے اور دونوں کے طریقہ ہائے کار مختلف ـــــ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاتب تقدیر نے ہر ایک کی قسمت میں نصف نصف دنیا کی حکمرانی لکھ دی ہے۔

۱۶- اہلِ امریکہ کا فلسفۂ حیات

میرے علم میں دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں ہے جہاں امریکہ کی طرح فلسفہ پر اس قدر کم توجہ دی جاتی ہے۔ امریکیوں کا کوئی اپنا علیحدہ مکتب فلسفہ نہیں ہے۔ اور انہیں یورپ کے علم فلسفہ کے متعدد مکاتیب فکر سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں ہے اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں ان مکاتیب فکر کا پتہ تک بھی نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود امریکہ کے تمام باشندے ایک ہی انداز سے سوچتے ہیں۔ اور معاشرہ پر یکساں قسم کے اصولوں کی حکمرانی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا ہے کہ امریکہ کے باشندے ان اصولوں کی وضاحت اور تشریح کی زحمت اٹھائے بغیر ایک خاص فلسفیانہ اسلوب اور طریقہ کار کے حامی ہیں۔ جو تمام لوگوں میں مروّج ہے۔ امریکی نظاموں، عادتوں، مخصوص خاندانی رسوم، طبقاتی نظریات اور بڑی حد تک قومی تعصبات کے بندھنوں سے آزاد رہتا ہے۔ روایات کو وہ ایک ذریعہ معلومات اور حقائق کو ایک سبق کے طور پر قبول کرتا ہے۔ اور کسی چیز کے اسباب و علل کو صرف اپنے لئے معلوم کرتا ہے۔ اور کسی خاص ذریعہ کا پابند ہوئے بغیر نتائج پر پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ تمام باتیں امریکی کردار کی وہ نمایاں خصوصیات ہیں جنہیں امریکیوں کے فلسفہ حیات سے موسوم کرتا ہوں۔ اور اگر میں اس سے زیادہ آگے بڑھوں اور ان نمایاں خصوصیات میں سے اہم ترین خصوصیت کو لوں جو تمام خصوصیات پر حاوی ہو تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ امریکیوں کے طرزِ زندگی میں ہر امریکی انفرادی طور پر اپنی قوتِ تفہیم سے صرف اپنی انفرادی مساعی پر اثر ڈالتا ہے۔

امریکہ، اس طرح ایک ایسا ملک ہے جہاں ڈی کارٹ کے نظریات کا شاید و باید ہی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کا بہترین طور پر اطلاق کیا جاتا ہے۔ یہ بات حیرت انگیز نہیں ہونی چاہیئے۔ امریکی ڈیکارٹ کی تصانیف کا مطالعہ نہیں کرتے کیونکہ ان کے سماجی حالات اس بات کی اجازت ہی نہیں دیتے کہ وہ اس قسم کے مطالعہ میں وقت صرف کریں۔ لیکن وہ ان کے مقولوں کی پیروی کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے سماجی حالات انہیں اس پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ انہیں اپنائیں۔

ایک مسلسل اور متواتر تحریک کی موجودگی میں جو جمہوری معاشرہ کو ہمیشہ ذہنی طور پر ہیجان میں رکھتی ہے۔ ایسی بندھن جو ایک نسل سے دوسری نسل کو چلاتی ہے یا تو ڈھیلی کر دی جاتی ہے یا ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے معاشرہ میں ہر شخص بہت جلد اپنے آباو اجداد کے نظریات سے تعلق کھو دیتا ہے یا ان کی پروا نہیں کرتا۔ معاشرہ کی اس حالت میں رہنے والے لوگ اپنے عقیدے اس طبقہ کی آراء سے اخذ نہیں کر سکتے جس سے وہ متعلق ہیں۔ اس لیئے کہ وہاں کسی قسم کے طبقات ہی نہیں ہیں۔ اور جو طبقات ہیں وہ بھی ایسے متحرک عناصر پر مشتمل ہیں کہ وہ بحیثیت جماعت اپنے ارکان پر کوئی حقیقی کنٹرول نہیں رکھتے۔ جہاں تک، اس اثر کا تعلق ہے، جو ایک شخص کی ذہانت دوسروں پر ڈال سکتی ہے ایک ایسے ملک میں انتہائی محدود ہوگا جہاں شہری آپس میں مساوی ہوں روزمرہ زندگی میں ایک دوسرے سے مل سکتے ہوں اور رابطہ رکھتے ہوں۔ اور جہاں ایک کو دوسرے پر برتری اور عظمت کا کوئی تصور ہی نہ ہو۔ ان حالات میں ہر شہری کی اپنی فکر اور کاوش، حق اور صداقت کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ اس طریقہ سے نہ صرف یہ کہ ایک کا دوسرے پر بھروسہ یا اعتماد کرنے کا جذبہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ بلکہ کسی دوسرے فرد کی کسی شکل میں حاکمیت کو قبول کرنے کا رجحان ہی باقی نہیں رہتا ہے۔ ہر شخص اپنے ہی ذہن کی دنیا میں اپنے آپ کو محصور کر لیتا

ہے۔ اور اپنے ہی نقطہ نظر سے دنیا کو جانچتا اور پرکھتا ہے۔

فیصلہ کرنے اور رائے قائم کرنے کے بارے میں اپنے اپنے معیار مقرر کرنے کے اس طریقہ کار نے امریکیوں میں دوسری فکری عادتیں پیدا کی ہیں۔ چونکہ وہ یہ تصور کرتے ہیں وہ کسی دوسرے کی مدد کے بغیر اپنی عملی زندگی کو متنوع اور چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور مسائل کا خود اپنے طور پر حل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں اس لئے وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ دنیا میں ہر شئے کے اسباب و علل کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔ اور کوئی شے ان کی قوتِ فکر کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ چنانچہ وہ ان باتوں سے انکار ہی کر دیتے ہیں جسے وہ خود سمجھ نہیں سکتے۔ اور اس طرح ان میں ایسی باتوں کے بارے میں جو غیر معمولی ہوتی ہیں کوئی اتحاد نہیں ہوتا اور" مافوق الفطرت" اشیا کا وجود ان کے لیئے ناممکن ہے۔ انہیں اس بات کی عادت ہے کہ وہ کسی چیز کے وجود یا عدم وجود کے بارے میں اپنی ہی شہادت پر انحصار کریں۔ اگر کوئی شئے ان کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرے۔ اور اس کے بارے میں وہ علم حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ اس شئے کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اور اس چیز کو اس پر سے اتار لیں گے جو ان کی شے مطلوبہ کو چھپائے ہوئے ہے اور اس چیز کو ہٹا دیں گے جو اس شے کی اور ان کی نظر کے درمیان حائل ہے۔ تاکہ وہ روز روشن میں اس کا معائنہ کرسکیں۔ یہ طرزِ فکر ان کو ظاہری شکل سے نفرت پیدا کراتا ہے۔ جسے وہ بے فائدہ اور بے کار قرار دیتے ہیں۔ اور ان ظاہری اشکال کو حقیقت اور ان کے درمیان بے کار سے پردے تصور کرتے ہیں۔ اس طرح امریکنوں نے اپنا فلسفہ کتابوں سے اخذ نہیں کیا بلکہ خود اپنے طور پر معلوم کیا۔

یہاں اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ انیگلو امریکی معاشرہ کو مذہب نے پیدا کیا ہے۔ امریکہ میں قوم کی تمام عادات، رسوم اور وطن سے محبت کے

جذبات میں مذہب ملا جلا ہے۔ اور اسی وجہ سے ہمیں ایک خاص قوت پیدا ہوئی ہے۔ اور اس بات کے ساتھ ایک اور طاقت در وجہ کا اضافہ کرنا چاہیئے۔ امریکہ میں مذہب نے خود اپنے چند حدود متعین کر رکھے ہیں۔ مذہبی ادارے، سیاسی اداروں سے بالکلیہ علیحدہ اور ممتاز رہے ہیں۔ تاکہ پرانے قوانین کو پرانے عقاید پر اثر انداز ہوئے بغیر آسانی سے بدلا جا سکے۔ عیسائیت نے اسی لیئے امریکی عوام کے ذہنوں پر اتنا اثر برقرار رکھا ہے۔ اور میں یہاں تک کہوں گا۔ اس کی حکمرانی محض ایک فلسفیانہ نظریہ کی حکمرانی کے مانند نہیں ہے جسے تحقیق اور تجسس کے بعد اپنایا جاتا ہے بلکہ ایک ایسے مذہب کی حکمرانی ہے جسے بلا چون وچرا اور بلا کسی بحث و استدلال کے قبول کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں عیسائیوں کے مختلف العقائد فرقے ہیں جس میں ہمیشہ آئے دن تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن خود عیسائیت ایک مسلمہ اور ناقابل مزاحمت حقیقت ہے۔ جس پر حملہ کرنے یا مدافعت کرنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔ امریکیوں نے عیسائیت کے بڑے اصولوں کو بغیر کسی استدلال یا ذہنی شبہ کے اپنا لیا ہے۔ اور اس طرح وہ ان متعدد اخلاقی اصولوں اور حقائق کو جو عیسائیت کا حصّہ ہیں قبول کرنے پر مجبور ہیں۔ اس لیئے انفرادی ذہنی کاوشوں کی سرگرمی صرف معین اور تنگ حدود میں مقید ہے۔ اور انسانوں کے مختلف افکار اور آراء کو اس کے اثر سے باہر رکھا جاتا ہے۔

میں نے جس دوسری بات کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہے امریکہ کے سماجی حالات اور امریکہ کا آئین دونوں جمہوری ہیں۔ لیکن وہاں کوئی جمہوری انقلاب برپا نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے امریکہ پہنچ کر جس سرزمین پر قبضہ کیا وہ کم وبیش اس حالت میں تھی جیسی کہ آج ہے۔ اور یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے۔

وہاں ایسے انقلابات برپا نہیں ہوئے جو عام طور پر مروّجہ عقائد کو پارہ پارہ

کردیتے ہیں۔ اقتدار کو ناتواں اور کمزور کر دیتے ہیں۔ اور لوگوں کے دلوں میں مروجہ عقائد کے بارے میں شک وشبہ پیدا کرتے ہیں۔ عام طور پر انقلابات کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی ہی رہنمائی قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور ہر انسان کے لیئے ایک ذہنی خلاء پیدا ہو جاتا ہے۔ جس میں ہر قسم کے نظریے یا عقیدے کے جگہ لینے کی گنجائش رہتی ہے۔ مختلف طبقات کے درمیان سال ہا سال کی کشمکش کے بعد جب مساوات کا دور دورہ ہوتا ہے تو رشک وحسد، نفرت بے رحمی، جذبات تفخر اور مبالغہ آمیز خود اعتمادی انسان کے دل پر قبضہ کرلیتی ہے اور ان باتوں کا اثر ایک زمانہ تک رہتا ہے۔ اور یہ بات لوگوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتی ہے۔ وہ دوسرے کے فیصلہ پر اعتماد کرنے کے عادی نہیں رہتے اور حق کی تلاش میں وہ صرف اپنی ہی رائے پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ آپ اپنا رہنما ہے۔ اور ہر موضوع پر اپنی رائے قائم کرتا ہے۔ لوگوں میں نظریات کی اساس پر باہمی اتحاد باقی نہیں رہتا۔ اور محض مفادات کا اتحاد باقی رہ جاتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی خیالات ایک ذہنی گرد وغبار کے مانند ہیں جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ اور جن کو ایک جگہ اکٹھا کرنا اور ان میں ربط پیدا کرنا مشکل ہے۔

اس طرح مساوات کے نتیجہ کے طور پر جو ذہنی آزادی پیدا ہوتی ہے وہ صرف اس وقت زیادہ عظیم اور زیادہ موثر معلوم ہوتی ہے جبکہ مساوات اپنے قیام کے ابتدائی مدارج میں ہوتی ہے۔ مگر اس کے بعد یہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔ اسلیئے کہ ذہنی آزادی جو مساوات عطا کرتی اور اس نراجی کیفیت میں جو انقلاب لاتا ہے احتیاط سے اعتبار کرنا ضروری ہے۔ ان دونوں کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ مستقبل کے بارے میں مبالغہ آمیز توقعات وخدشات قائم نہ

کیئے جائیں۔

میری رائے یہ ہے کہ معاشرہ کی نئی اشکال کے تحت انسان اپنی ذاتی قوتِ فیصلہ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں گے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی اس قوت کا نمایاں استعمال نہیں کریں گے۔ اور اس بات کا اطلاق تمام جمہوری ملکوں پر ہوتا ہے۔ اور ان تمام ملکوں کے لیئے یہ ضروری ہے کہ انفرادی ذہنی آزادی کو چند حدود میں مقید کر دیا جائے۔ مختلف زمانوں میں بعض راسخ عقائد عام رہے ہیں۔ ان کے اظہار کی شکلیں مختلف رہی ہیں اور انکے مقاصد اور اشکال بدلتے رہے ہیں۔ لیکن ان عقائد کا وجود ہمیشہ رہا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان ہمیشہ بعض آرا اور عقائد کو بلا کسی استدلال کے قبول کرتا رہا ہے۔ اگر ہر شخص خود اپنے طور پر رائے قائم کرے اور حق کی تلاش اپنے طور پر کرنے کی فکر کرنے لگے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسانوں کی ایک بڑی تعداد کبھی بھی ایک مشترکہ عقیدہ پر متفق نہ ہو سکے گی۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ بغیر مشترک عقائد کے کوئی معاشرہ ترقی نہیں کر سکتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مشترکہ عقائد کے بغیر خود معاشرہ بھی معرضِ وجود میں نہیں آسکتا۔ اس لیئے کہ مشترکہ تصوّر کے بغیر مشترکہ عمل کا تصوّر محال ہے اور مشترکہ عمل کے بغیر انسان تو ہوں گے لیکن معاشرہ نہیں ہوگا۔ معاشرہ کے وجود اور معاشرہ کی ترقی کے لیئے یہ ضروری ہے کہ معاشرہ کے تمام ارکان کے ذہن چند غالب تصوّرات کے گرد جمع ہوں۔ اور متحد ہوں۔ اور یہ بات اس وقت ممکن ہے جب کہ ہر شخص کی فکر اور رائے کا ایک ہی سرچشمہ ہو۔ اور وہ اس بات پہ آمادہ ہو کہ بعض مسلمہ عقائد کو تسلیم کرے۔

اگر انسان کا اس کی علیحدہ حیثیت میں غور کیا جائے تو اس کے الگ تھلگ زندہ رہنے کے لیئے عقائد اسی قدر ضروری ہیں جتنے کہ اسے اور لوگوں سے

اشتراک کے قابل بنانے کے لیئے ضروری ہوتے ہیں۔ اگر انسان کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ وہ روزمرّہ زندگی میں کام آنے والے تمام حقائق کا خود مشاہدہ و مظاہرہ کرے تو زندگی بھر وہ یہ کام ختم نہ کر سکے گا۔ وہ ابتدا کی باتوں ہی میں اپنی ساری توانائیاں صرف کر دے گا۔ اور اس منزل سے کہیں بھی آگے نہ بڑھ سکے گا۔ غرض یہ کہ وہ اپنی مختصر حیات اور محدود ذہنی استعداد کی بنا پر مجبور ہے کہ وہ متعدد آراء اور نظریوں کو من و عن قبول کرے جنہیں اعلےٰ ترذہانت کے لوگوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کے بعد پیش کیا۔ اس بنیاد پر وہ اپنے خیالات کی عمارت تعمیر کرتا ہے۔ وہ اس طریقۂ کار کو اپنی پسند یا مرضی کی بنا پر منتخب نہیں کرتا۔ بلکہ حالات کے کڑے قانون اسے اس بات پر مجبور کرتے ہیں۔ دنیا میں شاید ہی کوئی فلسفی ایسا ہو جو دوسروں کی باتیں تسلیم کرنے پر مجبور نہ ہو۔ اور اس طرح اسے کئی حقائق کو بغیر کسی ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

یہ نہ صرف ضروری ہے بلکہ پسندیدہ بھی ہے۔ اگر ہر شخص ہر شے کی حقیقت اور ماہیئت معلوم کرنے کی کوشش شروع کر دے تو وہ کسی شے کو بھی خاطر خواہ وقت نہ دے سکے گا۔ اسے یہ کام ہمیشہ بے اطمینانی کی حالت میں رکھے گا۔ اور کسی بات کی بھی صداقت کو نہ پہنچ سکے گا۔ اس کی ذہانت بہ یک وقت آزاد بھی ہوگی اور مفلوج بھی۔ اسلیئے یہ ضروری ہے کہ وہ دنیا کی بے شمار چیزوں میں سے ایک کو اپنے لیئے منتخب کرے اور مختلف آراء کو بغیر کسی دلیل کے قبول کرے۔ تاکہ اس میں اسے اپنی مطلوبہ شے کی حقیقت معلوم کرنے میں آسانی ہو۔

یہ درست ہے کہ کسی شخص کا کسی دوسرے شخص کی رائے کو قبول کرنا، ایک قسم کی ذہنی غلامی قبول کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن یہ ذہنی غلامی فائدہ بخش ہوتی ہے۔ جو اسے اپنی آزادی کے بہتر استعمال کا موقع مہیا کرتی ہے۔

اخلاقی اور ذہنی دنیا میں کسی نہ کسی جگہ اور ہر حالت میں حاکمیت کا اصول ہمیشہ رائج رہتا ہے۔ اس کی جگہ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ کسی نہ کسی جگہ کا حامل ضرور رہتا ہے۔ انفرادی ذہن کی آزادی زیادہ اور کم ہو سکتی ہے۔ لیکن بے لگام نہیں ہو سکتی۔ اب سوال یہ نہیں رہتا جمہوریت کے اس دور میں ذہنی حاکمیت کا وجود ہے بھی یا نہیں، بلکہ سوال صرف یہ ہے کہ یہ کہاں ہے اور کن باتوں سے اسے ناپا جا سکتا ہے۔

میں نے اس سے پہلے باب میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالات کی یکسانیت اور مساوات لوگوں میں جبلی طور پر ما فوق الفطرت اشیاء کے بارے میں بے یقینی اور انسانی سوجھ بوجھ کے بارے میں عام طور پر مبالغہ آمیز حد تک بلند تصور پیدا کرتے ہیں۔ جو لوگ سماجی مساوات کے دور میں پیدا ہوتے ہیں وہ آسانی سے ذہنی حاکمیت کسی کے سپرد کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ وہ عام طور پر حقیقت کو خود اپنے اندر تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یا اپنے ہی جیسے لوگوں میں تلاش کرتے ہیں۔ یہ چیز یہ ثابت کرنے کے لیئے کافی ہے کہ اس دور میں کوئی نیا مذہب جاری نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس مقصد کی تمام تجاویز نہ صرف غیر مقدس بلکہ بے ہودہ اور غیر دانشمندی پر مبنی ہوں گی۔ یہ پیش خیالی کی جا سکتی ہے کہ جمہوری لوگ آسانی سے ربانی اور روحانی عقائد پر ایمان نہیں لاتے۔ اور وہ موجودہ دور کے پیغمبروں کو لائق استہزاء تصور کرتے ہیں۔ اور اپنے عقائد کا منصف خود اپنی ذات کے اندر تلاش کریں گے۔

جب معاشرہ میں غیر مساوی حالات ہوں اور افراد میں ایک دوسرے سے یکسانیت نہ پائی جاتی ہو تو اس میں چند افراد ایسے ہوتے ہیں جو برتر ذہانت، علمیت اور قابلیت کے حامل ہوتے ہیں اور ہزاروں لوگ جہالت اور تعصبات

کے شکار رہتے ہیں۔ اشراقیہ کے اس دور کے رہنے والے لوگ فطرتاً اپنی آراء کو اپنے سے برتر لوگوں کے پیمانوں سے قائم کرتے ہیں اور عوام کی رائے کی قطعیت کے نظریئے سے متنفر رہتے ہیں۔ مساوات کے دور میں معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ لوگ مرتبہ اور حیثیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے جس قدر قریب اور مساوی ہوتے جائیں گے اسی طرح وہ کسی شخص میں یا اشخاص کے کسی گروہ میں اعتقاد نہیں رکھیں گے۔ لیکن عوام اور انبوہ کی رائے پر اعتماد کرنے کا رجحان اس میں بڑھتا جائے گا۔ اور دنیا پر رائے عامہ کی ہمیشہ حکمرانی رہی ہے۔ نہ صرف یہ کہ عام رائے جمہوری ملکوں میں لوگوں کی واحد رہنما ہوتی ہے۔ بلکہ ایسے ملکوں میں اس کی طاقت بے پناہ ہوتی ہے۔ مساوات کے دور میں، لوگوں کو باہمی یکسانیت اور مشابہت کی بنا پر ایک دوسرے پر ایمان نہیں رہتا۔ لیکن یہی یکسانیت اور مشابہت ان میں عوامی رائے کی صحت پر غیر محدود بھروسہ پیدا کر دیتی ہے۔

جمہوری ملک کا کوئی باشندہ، جب اپنے سے متعلق تمام لوگوں سے اپنا موازنہ کرتا ہے تو وہ اس بات پر فخر محسوس کرتا ہے وہ سبھوں کے مساوی ہے لیکن وہ اپنے رفقاء کا مجموعی طور پر جائزہ لیتا ہے اور اس پوری جماعت کے مقابلہ پر اپنی ذات کو لا کھڑا کرتا ہے۔ تو اسے فوراً اپنے . . . کمزور ہونے کا زبردست احساس ہوتا ہے۔ وہی مساوات جس نے اسے اپنے ہم وطنوں سے الگ طور پر آزاد رکھا تھا مجموعی طور پر ان کے سامنے اسے اکیلا، بےبس اور غیر محفوظ کر دیتی ہے۔ اس طرح جمہوری ملکوں میں عوام کی بحیثیت مجموعی ایک واحد طاقت ہوتی ہے جس کا غیر جمہوری ملکوں میں تصور نہیں کیا جا سکتا۔

امریکہ میں، اکثریت افراد کے استعمال کے لیئے پہلے ہی سے تیار کردہ رائیں مہیا کرتی ہے۔ اور افراد خود اپنی رائے بنانے کے بوجھ سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ وہاں

ہر شخص بغیر کسی ذہنی کاوش اور جستجو کے اخلاقیات، فلسفہ اور سیاسیات پر رائے رکھتا ہے۔ اور اگر ہم ذرا قریب سے مطالعہ کریں تو یہ اندازہ ہو سکے گا کہ امریکہ میں مذہب کی بھی جو حکمرانی ہے وہ الہامی نظریہ سے زیادہ ایک مقبول عام نظریہ کی حیثیت سے ہے۔

یہ واقعہ کہ امریکہ کے سیاسی قوانین کچھ اس طرح ہیں کہ اکثریت کو وہ معاشرہ پر مطلق حکمرانی عطا کرتے ہیں، اکثریت کے اس اثر و اقتدار میں بے حد اضافہ کرتے ہیں جو وہ لوگوں کے اذہان پر ڈالتی ہے۔ اس لیے کہ حکمران شخص کی اعلیٰ ذہانت کو تسلیم کرنے سے زیادہ کوئی اور شے عام نہیں۔ اکثریت کی یہ سیاسی مطلق العنانی بلاشبہ اس اثر میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے جو معاشرہ کے ارکان کے اذہان پر بغیر اس کی مطلق العنانی کے مرتب ہو سکتا ہے۔ لیکن اس اثر کی بنیادیں اس پر قائم نہیں ہو سکتیں۔ اسے تو مساوات کے اصولوں میں ہی تلاش کرنا ہو گا۔ نہ کہ ان مقبول عام اداروں میں جنہیں لوگوں نے قائم کیا ہے۔ عددی اعتبار سے زیادہ لوگوں کی ذہنی حکمرانی ایسے جمہوری لوگوں پر، جن میں بادشاہ کی سربراہی ہو، کم ہو گی بہ نسبت ان ملکوں کے جہاں مکمل جمہوریت ہو لیکن یہ ہمیشہ مطلق نوعیت کی ہو گی۔ اور مساوات کے دور میں لوگوں پر کسی قسم کے بھی قوانین کی حکمرانی کیوں نہ ہو، رائے عامہ میں اعتماد، مذہبی عقیدہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور اکثریت اس عقیدہ کا پیغمبر ہو جاتی ہے۔

غرض یہ کہ ذہنی حاکمیت مختلف نوعیت کی ہو گی۔ لیکن وہ ختم نہیں ہو گی۔ اور نہ صرف یہ کہ غائب نہیں ہو گی بلکہ یہ ضرورت سے زیادہ غلبہ حاصل کر لے گی۔ اور نجی قوت فیصلہ کا دائرۂ عمل محدود ہو کر رہ جائے گا۔ جو انسانی نسل کی عظمت اور مسرت کے شایان شان نہیں ہے۔ مساوات کے اصولوں میں

مجھے دو رجحانات نظر آتے ہیں۔ ایک رجحان تو انسان کو غیر معلوم تصورات کی دنیا کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا اسے سوچنے ہی سے منع کرتا ہے۔ اور میں اس بات کا تصوّر کر سکتا ہوں کہ کس طرح بعض قوانین کی حکمرانی کے تحت، جمہوریت ذہنی آزادی کی اس لو کو بجھا دے گی۔ جس کے لیئے جمہوری معاشری حالات سازگار ہوتے ہیں۔ تاکہ عام انسانوں یا ذی مرتبہ افراد کے مسلط کردہ بندھنوں کو توڑنے کے بعد، انسانی ذہن تعداد افراد کی عام مرضی سے باندھ دیا جائے۔

اگر جمہوری اقوام اکثریت کی مطلق طاقت کی جگہ دوسری تمام گوناگوں طاقتوں کو دے دیں۔ جو فرد کے ذہن کی توانائی پر ضرورت سے زیادہ پابندیاں لگاتی ہوں تو یہ برائی محض اپنی ہیئت بدل لے گی۔ انسانوں کو آزاد زندگی کے ذرائع ہی نصیب نہ ہوں گے۔ اور وہ صرف غلامی کی ایک ہی صورت دریافت کریں گے۔ میں اس بات کو بار بار دہرانا نہیں چاہتا۔ کہ یہ معاملہ ان لوگوں کی انتہائی توجہ کا محتاج ہے جو آزادیٔ تخیل کو مقدس شے تصوّر کرتے ہیں۔ اور جو نہ صرف مستبد حکمران بلکہ استبدادیت کو بھی نفرت سے دیکھتے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے جب بھی کسی طاقت کا بھاری ہاتھ اپنی پیشانی پر محسوس کرتا ہوں تو مجھے اس کی مخالفت کرنے پر اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ یہ ہاتھ کس کا ہے اور میں محض اسی بنا پر اس غلامی کے تحت جانے پر آمادہ نہیں تھا کہ یہ ایک شخص کا ہاتھ نہیں بلکہ لاکھوں لوگوں کا ہاتھ ہے۔

۱۷۔ مذہب پر جمہوریت کا اثر

انسان عقائد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ اس کی بھلائی اس بات میں مضمر ہے کہ وہ کسی نہ کسی عقیدہ کا حامل ہو۔ راسخ عقائد ہی میرے نقطہ نظر سے سب سے زیادہ پسندیدہ عقائد وہ ہیں جن کا تعلق مذہب سے ہوتا ہے۔ انسانوں کے قول و عمل میں شاید ہی کوئی بات ایسی ہوتی ہے جس کا سرچشمہ مذہب اور مذہبی تصوّرات نہ ہوتے ہوں انسانوں کے اپنے خالق، روح اور اپنے ہموطنوں سے متعلق فرائض کے بارے میں عقائد ہی خاص تصوّرات متعین کرتے ہیں۔ اگر ان امور کے بارے میں ان کے دلوں میں کسی قسم کا شبہ ہو تو پھر ان کے فعل و عمل کا سارا انحصار محض اتفاق پر رہ جاتا ہے۔ اور اس طرح وہ بے نظمی اور بالآخر کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔

خدا اور فطرت انسانی کے بارے میں مخصوص تصوّرات کا تعین انسانوں کی روزمرّہ زندگی کے لیئے بے حد ضروری ہے لیکن کاروبارِ زندگی انسانوں کے لیئے اس قسم کے تصوّرات متعین کرنے کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ یہ جو مشکل ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ علوم اور فنون کی دنیا کو لیجیئے۔ بعض ایسے علوم ہوتے ہیں جو انسانیت کے لیئے مفید ہوتے ہیں۔ اور ان علوم تک انسانوں کی رسائی ممکن بھی ہے۔ بعض علوم تک صرف گنے چنے ہی لوگ پہنچ سکتے ہیں اور باقی لوگ صرف ان علوم کا بالواسطہ اطلاق ہی جانتے ہیں۔ لیکن تمام لوگوں کے لیئے علوم کا روزمرّہ استعمال میں لانا ضروری ہے۔ اگرچہ کہ اس کا مطالعہ سب کے لیئے ممکن ہی نہیں ہے۔ خدائے تعالیٰ اور انسانی فطرت کے بارے میں عام تصوّرات ایسے تصوّرات ہیں جن کو انسانوں کے روزمرّہ زندگی کے دوران ان

کے نجی فیصلوں سے الگ رکھنا ضروری اور مناسب ہے۔ اور جس میں ایک عالمگیت کے اصول کو تسلیم کرنے سے آپ کو نقصان سے زیادہ فائدہ ہی پہنچتا ہے۔

مذہب کا اوّلین مقصد اور اس کا اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ مذہب ہر بنیادی مسئلہ کا ایک ایسا حل پیش کرتا ہے جو واضح، متعین اور پائیدار ہوتا ہے۔ اور عوام کی فہم سے بالاتر نہیں ہوتا۔ بلاشبہ بعض مذاہب جھوٹے اور لغو ہیں۔ لیکن ہر وہ مذہب جو اس دائرہ کار کے اندر رہتا ہے جس کی میں نے وضاحت کی ہے وہ لوگوں کی ذہانت اور فکر و عمل پر انتہائی فائدہ بخش اثر ڈالتا ہے۔ اور اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر ایک مذہب اپنے پیروؤں کی بالغرض محال حیثیت نہیں سدھار سکتا تو کم از کم اس دنیا میں ان کے لیے خوشحالی، مسرّت اور عظمت کا باعث تو بن سکتا ہے۔ آزاد ملکوں کے باشندوں کے سلسلے میں یہ بات بطور خاص درست ہے جب لوگوں کا مذہب تباہ کر دیا جاتا ہے تو اُن کی فکر و ذہانت کی اعلیٰ تر قوتیں شکوک و شبہات کا شکار ہوتی ہیں۔ وہ نہ تمام صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہیں۔ ہر شخص اس بات کا عادی ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے اُمور میں جن کا تعلق ان کے ابنائے وطن کی بہبود سے ہو۔ ہر لمحہ اپنے خیالات اور تصوّرات میں تبدیلی پیدا کرے۔ وہ اپنی آراء اور عقائد کی مدافعت نہیں کرتا۔ اور ان سے آسانی سے دستبردار ہو جاتا ہے۔ اور اپنے اور مقدرِ انسان سے متعلق مشکل اور پیچیدہ مسایل کو حل کرنے کا اپنے آپ کو نااہل پا کر عالمِ مایوسی میں ان کے بارے میں غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال روح کو ضعیف اور ناتواں کر دیتی ہے۔ قوّتِ ارادی کو کمزور کر دیتی ہے۔ اور لوگوں کو غلامی کی زندگی کا عادی بناتی ہے۔ ایسا اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اس صورتِ حال کے تحت نہ صرف یہ کہ لوگوں کی آزادی چھین لی جاتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات خود عوام اپنی آزادی سے دستبردار ہو جاتے ہیں

اور جب مذہب کی دنیا میں حاکمیت کا اصول باقی نہیں رہتا، تو لوگ غیر محدود پیمانہ پر مذہبی بے راہ روی کے خطرہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ ماحول اور گردوپیش میں ہیجانی حالت انہیں خوف زدہ کر دیتی ہے۔ اور ان کی توانائیوں کو صرف کر کے نڈھال کر دیتی ہے اور چونکہ معاشرہ اور ذہن کی دنیا میں ایک انتشار رہتا ہے تو لوگ یہ سوچنا چھوڑ دیتے ہیں کہ معاشرہ مضبوط اور متعین ہونا چاہیئے یا نہیں۔ اور چونکہ وہ اپنے پرانے عقائد کی طرف نہیں جا سکتے اس لیئے وہ ایک آقا کا انتخاب کرتے ہیں۔

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میرا خیال ہے کہ انسان بہ یک وقت مکمل مذہبی آزادی اور مکمل سیاسی آزادی کے نظریہ کی حمایت نہیں کر سکتا۔ میں یہ بھی کہوں گا کہ اگر کسی شخص میں ایمان کی کمزوری ہے تو وہ یقیناً غلام ہوگا۔ اور اگر وہ آزاد ہے تو یقیناً کسی مذہب یا عقیدہ پر ایمان رکھتا ہوگا۔

مذہب کی افادیت سے وہ ممالک زیادہ مستفید ہو سکتے ہیں جہاں یکساں قسم کے سماجی حالات ہوں۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جہاں مساوات دنیا کے لیے بے شمار فوائد کی حامل ہے وہیں وہ لوگوں میں بعض خطرناک قسم کے رجحانات پیدا کرتی ہے۔ مساوات افراد کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیتی ہے۔ اور ہر شخص کی توجہ اپنی ہی ذات پر مبذول ہو جاتی ہے۔ اور انسان صرف مادی راحتوں کا پرستار بن کر رہ جاتا ہے۔ مذہب کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ وہ اس کے بالکل برعکس رجحانات کو فروغ دیتا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا مذہب ہو جس نے دنیاوی آسائشوں کو ترجیح دی ہو۔ اور جس نے انسان کی روح کو عالم شعور اور احساس سے بلند اور ماورئی ہونے کی تعلیم نہ دی ہو۔ اور نہ ہی ایسا کوئی مذہب ہے، جس نے انسان کو اپنے ہم وطنوں اور ہم جلسوں کے بارے میں اپنے فرائض یاد نہ دلائے ہوں۔ اور اس طرح اس کی اپنی ذات کی دنیا سے باہر نکلنے کے لیئے سوچنے پر

مجبور نہ کیا ہو۔

لہٰذا مذہبی اقوام ایسے معاملات میں انتہائی طاقت ور ہوتی ہیں۔ جن میں جمہوری اقوام کمزور ہوا کرتی ہیں۔ اور یہ بات ثابت کرتی ہے کہ ایسی قوموں کے لیئے جہاں معاشری مساوات ہے، مذہبی اصولوں اور مذہب کی حفاظت کرنا انتہائی اہم اور ضروری ہے۔

اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں میں نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ امریکہ میں کلیسا کس طرح دنیوی امور سے اپنے آپ کو الگ رکھتا ہے۔ کلیسا نے اپنے آپ پر جو پابندی لگائی ہے یہ اس کی واحد نہ سہی واضح مثال ہے۔ امریکہ میں مذہب کی ایک بالکلیہ علیحدہ دنیا ہے۔ جس میں پادری کی حکمرانی ہے۔ اور پادری اس دنیا سے باہر جانے کی کوشش ہی نہیں کرتا۔ اس دنیا کے حدود میں وہ لوگوں کے اذہان پر حکمرانی کرتا ہے۔ اور اس سے باہر کے امور کو وہ خود لوگوں کے لیئے چھوڑ دیتا ہے۔ میں کسی ایسے ملک سے آشنا نہیں ہوں جہاں امریکہ کی طرح عیسائیت کو رسوم، روایات اور ظاہری آداب واشکال کا اس قدر کم پابند بنایا گیا ہے۔ اگرچہ امریکہ کے عیسائی متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں، وہ اپنے مذہب کے بارے میں یکساں قسم کا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ یہ بات رومن کیتھولک فرقوں اور دوسروں پر یکساں طور پر صادق آتی ہے

امریکہ کے مختلف عیسائی فرقوں میں ایک اور بات مشترک ہے۔ امریکہ کے پادری آئندہ زندگی کے بارے میں اپنے نظریات، اپنے پیروؤں پر مسلط نہیں کرتے۔ اور "حال" کے بارے میں بھی اپنے تعلق خاطر کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہوتا ہے کہ دنیادی بہبود بھی اگرچہ ثانوی حیثیت ہی کی سہی، کافی اہمیت کی حامل ہے۔ گو وہ صنعت وحرفت، زراعت یا کسی پیداوار محنت میں حصہ نہیں لیتے۔ مگر وہ ترقی میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور ترقی کی کوششوں اور نتائج کو سراہتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس بات کی یاد دہانی کرانا فراموش نہیں کرتے کہ دوسری دنیا ہی کو اہل ایمان کی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز

ہونا چاہیئے۔ مگر لوگوں کو اس دنیا میں بھی خوشحالی کے حصول کی مساعی سے منع نہیں کرتے۔

امریکہ میں اہل کلیسا اکثریت کی ذہنی برتری کو تسلیم کرتے اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ اور انتہائی مجبوریوں کی صورت میں وہ اکثریت کے تصادم میں آنا گوارا کرتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے اختلافات اور جھگڑوں میں وہ حصہ نہیں لیتے لیکن وہ ملک اور اپنے زمانے کی عام رائے کو بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے ہم عصروں کی اصلاح کی کوششیں تو کرتے ہیں لیکن وہ ان کی رفاقت ترک نہیں کرتے۔ اور اسی لیئے رائے عامہ ان کی کبھی مخالف نہیں رہی ہے۔ اس کے برعکس وہ ان کی حامی اور محافظ رہی ہے پس اپنے تمام جمہوری رجحانات کا احترام کرتے ہوئے جو بالکلیہ ان کے مخالف نہ ہوں اور ان میں سے اکثر رجحانات کو خود اپنے فائدے کیلئے استعمال کرتے ہوئے مذہب نے انفرادی آزادی کے جذبہ کیساتھ جو عام حالات میں کلیسا کا بدترین دشمن ہوتا ہے کامیاب کشمکش جاری رکھی ہے۔

امریکہ دنیا کا سب سے زیادہ جمہوری ملک ہے۔ اور قابل اعتماد رپورٹوں کیمطابق یہ واحد ملک ہے جہاں رومن کیتھولک عقیدے نے بیحد ترقی کی ہے۔ بظاہر یہ بات حیرت انگیز معلوم ہوگی۔ لیکن دو باتوں میں ٹھیک ٹھیک طور پر امتیاز کرنا ضروری ہے مساوات لوگوں میں اپنی رائے آپ قایم کرنیکی خواہش پیدا کرتی ہے لیکن اسکے ساتھ ساتھ ان میں اتحاد کا تصور اور سادگی کا مذاق پیدا کرتی ہے اور ان لوگوں کو غیر جانبدار و یکھنے کا عادی بناتی ہے جو ان پر حکومت کرتے ہیں اسلیئے جمہوری ملکوں کے لوگ مذہبی حاکمیت کے بندھنوں کو توڑنے کی جانب زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنے آپ کو ایسی کسی حاکمیت کا تابع بنانے پر آمادہ ہو جائیں تو وہ اس بات کو پسند کریں گے کہ یہ حاکمیت واحد اور یکساں نوعیت کی ہو — ایسی مذہبی قوتیں جن کا سرچشمہ ایک مرکز نہ ہو۔ ان کے اذہان کے لیئے قابل قبول ہی نہیں ہونگیں۔ وہ اس بات کو پسند کریں گے کہ کوئی مذہب ہی نہ ہو۔ بہ نسبت اس کے کئی مذاہب ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں رومن کیتھولک مذہب نے زیادہ ترقی کی ہے۔ کیونکہ یہ ایک خاص نظم و ضبط کا داعی ہے۔

۱۰- مساوات کا اثر انسانی تصوّرات پر

مساوات انسانوں میں ایسے مختلف تصوّرات پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے جو کسی اور ذریعہ سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ اور ان تمام تصوّرات میں ترمیم کرتی ہے جو اس سے پہلے مروّج تھے۔ مثال کے طور پر انسان کی کاملیّت کے تصوّر کو لیجئے۔ کیونکہ یہ اہم ترین تصوّر ہے جو انسانوں کے ذہن میں آسکتا ہے۔ اور ہمیشہ ایک اہم فلسفیانہ نظریہ کے طور پر انسانوں کے زیرِ بحث رہا۔

انسانوں اور درندوں میں متعدد باتیں مشترک ہیں۔ لیکن ایک بات جو اسے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ انسان ترقی پذیر ہے اور جانور ترقی کے ناقابل ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان ابتدا ہی سے اس فرق کو پہچانے بغیر نہ رہ سکتا۔ اس لیئے تصوّر کاملیتِ دنیا ہی کی طرح پرانا ہے۔ مساوات نے اسے جنم نہیں دیا۔ بلکہ اسے ایک نیا کردار عطا کیا ہے۔

جب کسی معاشرہ کے ارکان میں مرتبہ، پیشہ اور پیدائش کی اساس پر درجہ بندی کر دی جائے اور جہاں ہر شخص اس بات پر مجبور ہو کہ وہ اس پیشے کو اختیار کرے جو اتفاق سے اسے حاصل ہوا ہے تو انسان یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ انسانی طاقت محدود ہے اور کوئی شخص قانونِ تقدیر کی مزاحمت نہیں کر سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ اشرافیہ مطلق طور پر انسان کی ترقی کی صلاحیت سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن وہ یہ ضرور تصوّر کرتا ہے کہ اس کی صلاحیتیں محدود نہیں۔ اشرافیہ اصلاح اور ترقی کو تو ممکن تصوّر کرتا ہے لیکن تبدیلی کو ناممکن۔ وہ خیال کرتا ہے کہ معاشرہ کے آئندہ حالات بہتر ہوں گے۔ لیکن بنیادی طور پر مختلف نہیں۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ انسانیت نے ترقی

کی ہے اور ممکن ہے کہ مزید ترقی کرے۔ لیکن وہ یہ تصوّر کرتا ہے انسان کی ترقی کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹیں ہیں۔

اس طرح اشرافیہ کا یہ نقطۂ نظر ہے کہ انسان کامل حقیقت تک یا برتر نیکی کی منزل تک پہنچ چکا ہے۔ اور یہ کہ ہم عظمت کی طرف صرف اس حد تک آگے بڑھ سکتے ہیں جس حد تک کہ انسان کی ناقص اور نامکمل فطرت اجازت دے سکتی ہے۔

ذات پات اور درجہ بندی جس تناسب سے ختم ہوتی ہے معاشرہ کے مختلف طبقات میں بُعد کم سے کم ہوتا جاتا ہے ـــــ اور جیسے جیسے آداب معاشرت، رسوم اور قانون میں لوگوں کے باہمی ربط وضبط سے تنوع پیدا ہو۔ جیسے جیسے نئے حقائق اُبھریں اور جیسے جیسے نئی صداقتیں سامنے آئیں اور جیسے پرانے عقائد کی جگہ نئے عقائد لیں تو انسانوں کے ذہن میں ایک معیاری انسان کا تصوّر اُبھرتا ہے۔ انسان کے مشاہدہ میں آئے دن تغیرات اور تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ ان تغیرات سے بعض لوگوں کی حالت اور خراب ہو جاتی ہے اور اپنے تجربات اور مشاہدات سے یہ جان لیتا ہے کہ دنیا کا کوئی شخص خواہ کیسا ہی ذہین اور ہوشیار ہونے کا ادعا کیوں نہ کرے، بے خطا اور کامل ہونے کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ دوسروں کی حالت بہتر ہوتی ہے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ انسانوں کو ترقی کی غیر محدود صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ انسان کی ناکامیاں اسے سکھاتی ہیں کہ اب تک مکمل حقیقت کی تلاش کوئی نہ کر سکا۔ اور انسان کی کامیابیاں ابھی غیر مختتم مساعی کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔

کوئی شخص بمشکل اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ انسان کی غیر محدود کاملیّت کے فلسفیانہ نظریئے سے کس قدر بے شمار حقیقتیں پیدا ہوئیں اور اس کا کس قدر

قوی اثر ان لوگوں پر ہوا جو سکرو تخیّل کی دنیا میں نہیں بلکہ عمل کی دنیا میں رہتے ہیں۔ اور اس نظریہ کو جانے بغیر ہی اپنے ۔۔۔ فعل اور عمل کو اس نظریہ کے ہم آہنگ بناتے ہیں۔

میں نے ایک امریکی ملاح سے دریافت کیا کہ تم لوگ ایسے جہاز کیوں بناتے ہو جو صرف چند دن ہی چل سکتے ہیں۔ اس نے فوراً بلا پس و پیش یہ جواب دیا کہ عہد حاضر میں فن جہاز رانی اور علم البحر میں اس قدر تیزی سے ترقی ہو رہی ہے کہ بہترین سے بہترین جہاز بھی چند دن کے بعد بیکار ہو جائے گا۔ یہ الفاظ جو اتفاقی طور پر ایک ایسے آدمی کی زبان سے ادا ہوئے جو زیادہ پڑھا لکھا نہیں۔ دراصل ایک ایسے فلسفہ حیات کے ترجمان ہیں جس کے تحت ایک زیرک قوم اپنی مساعی کو روبکار لاتی ہے۔

۱۹۔ سائنس ادب اور آرٹ کے بارے میں

جمہوری قوموں کا مذاق

یہ درست ہے کہ دنیا کے کسی تہذیب یافتہ ملک میں امریکہ کی طرح سائنس کے میدان میں اس قدر کم ترقی نہیں ہوئی۔ اور نہ بڑے ادیبوں، شاعروں اور ممتاز سائنسدانوں کا اس قدر فقدان ہے۔ ان حقائق سے متاثر ہو کر متعدد یورپی مفکروں نے یہ نظریہ اخذ کیا ہے کہ یہ بات مساوات کا راز اور فطری نتیجہ ہے۔ اور تصوّر کیا ہے کہ اگر ساری روئے زمین پر جمہوریت اور مساوات کی حکمرانی ہو گئی تو انسانی ذہانت کی شمع کی روشنی بتدریج مدھم ہو جائے گی اور انسان تاریکی کے دور میں چلا جائے گا۔

میرے خیال میں اس قسم کا طرز فکر متعدد تصوّرات کو گڈ مڈ کر کے غور کرنے کا نتیجہ ہے یہ ضروری ہے کہ ہر تصوّر کو علیحدہ علیحدہ کر کے غور کیا جائے۔ نتیجہ اخذ کرنے میں غلطی اس بات سے ہوتی ہے کہ غیر ارادی طور پر ہی سہی، ہر اس شئے کو جو امریکی ہے جمہوری سمجھا جائے امریکہ کے ابتدائی آباد کاروں نے جس مذہب پر عمل کیا اور جسے اپنی اولاد کے لئے ورثہ میں چھوڑا وہ سیدھا سادہ تھا۔ اس کے اصولوں میں لچک نہ تھی۔ اور ظاہری رسوم اور جاہ و شوکت کا زبردست مخالف تھا۔ یہ تمام خصوصیات فنون لطیفہ کی مخالف ہیں اور ادب کی رنگینیوں کو بمشکل ہی قبول کرنے کی اجازت دیتی ہیں۔ امریکی پرانی اور روشن خیال قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنہیں قسمت نے ایک ایسی نئی سرزمین میں لا آباد کیا جس کی وسعتیں غیر محدود تھیں۔ اور جہاں وہ اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق پھیل سکتے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں کسی جگہ ایسے حالات کی مثال نہیں ملتی۔ امریکہ میں اپنی تقدیر

بنانے اور اپنی زندگی کو سنوارنے کے اس قدر وسیع امکانات اور سہولتیں موجود ہیں جن کا دوسری جگہ علم تک بھی نہیں ہے۔ منفعت اور مادی فوائد کا جذبہ سب پر حاوی ہے اور انسانی ذہن کے لیئے جو فکر کی مسرّتوں اور ذہن کی کاوشوں سے دور رہتا ہے تلاشِ دولت کی خواہش کے سواء کوئی اور محرک نہیں ہوتا۔ اگرچہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی امریکہ کی طرح صنعتی اور تجارتی طبقات موجود ہیں۔ لیکن دنیا کے کسی ملک میں امریکہ کی طرح سارے کا سارا معاشرہ پیداوار، تجارت اور صنعت میں حصّہ نہیں لے سکتا۔ مگر اس کے باوجود میری رائے یہ ہے کہ اگر دنیا میں امریکی اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں حاصل کی ہوئی آزادی اور علم اور اپنے مخصوص جذباتِ عمل کے ساتھ اکیلے ہی ہوتے تو وہ بہت جلد یہ بات معلوم کرتے کہ علوم اور فنون کے اطلاق میں ترقی کرنا ایک طویل عرصہ تک ممکن نہیں جب تک کہ ان علوم کے اساسی نظریات پر مہارت حاصل نہ کی جائے۔ اور یہ کہ تمام فنون ایک دوسرے کے تعاون سے مکمل ہوتے ہیں۔ اور خواہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں کسی قدر منہمک کیوں نہ ہوتے وہ اس بات کو تسلیم کر لیتے کہ انہیں اپنی عملی زندگی سے ہٹ کر کبھی کبھی ان امور پر توجہ دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے مقصد کو بالآخر امکانی حد تک حاصل کر سکیں۔

مہذّب انسانوں میں ذہنی مسرّت کا مذاق اس قدر فطری ہوتا ہے کہ ایسی شائستہ قوموں میں بھی، جو ممکن ہے کہ اس قسم کی ذہنی کاوشوں کی جانب میلان نہ رکھتی ہوں ہر وقت چند لوگ ایسے موجود رہتے ہیں جنہیں فکر و تخیّل کے مشغلے محبوب ہوتے ہیں جب یہ ذہنی خواہش محسوس ہوتی ہے تو اس کی تسکین کا سامان بھی مہیّا ہو جاتا ہے مگر عین اس وقت جب امریکی، سائنس اور فلسفہ کے اساسی نظریات کے قطع نظر ان کے اطلاق میں منہمک تھے۔ تاکہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار اور پُرراحت بنایا جائے۔ یورپ کے مفکرین حق و صداقت کے مشترک سرچشموں کی تلاش

کر رہے تھے۔ اور ساتھ ہی ان چیزوں کو ترقی دے رہے تھے جن سے انسانوں کی احتیاجات کو پورا کیا جا سکے۔

بیرونی دنیا کی صفِ اوّل کی روشن خیال قوموں میں سے امریکہ کے باشندوں نے اپنے آپ کو اس قوم سے وابستہ کر لیا جو بہ اعتبار تاریخ، رسوم اور عادات ان سے مشترک تھی۔ اس قوم میں انھوں نے نمایاں سائینسدان، بہترین آرٹسٹ اور ممتاز ادیب پائے، اور ان کی ذہنی کاوشوں اور اس ملک کے دانش کے خزانوں سے استفادہ کیا۔

ایک بڑے سمندر کے حائل ہونے کے باوجود امریکہ اور یورپ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں۔ میں امریکہ کے باشندوں کو برطانیہ کے ان لوگوں کا حصّہ تصوّر کرتا ہوں جنھیں نئی دنیا کے صحراؤں اور رہگزاروں کی دریافت اور تسخیر کا کام سونپا گیا ہے۔ اور باقی قوم نے جسے امریکہ میں آباد باشندوں کی سی سخت کوشی کی ضرورت نہیں، اپنا وقت اور توانائی فکر و تخیّل کے لیئے وقف کر دی ہے۔

چنانچہ امریکیوں کی حالت استثنائی نوعیت کی ہے۔ اور یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کا کوئی جمہوری ملک ان حالات سے دوچار نہیں ہوگا۔ ان کا پیوریٹانی آغاز، ان کی بالکلیہ تجارتی عادات، ان کے ملک کی جغرافیائی حالت جو امریکیوں کی توجہ فنون لطیفہ اور فکر و تخیّل سے ہٹاتی ہے۔ یورپ کی تہذیب اور فکر سے ان کا تعلق اور اس قسم کے متعدد عوامل نے امریکی ذہن کی توجہ کو بالکلیہ عملی مقاصد پر مرتکز کیا ہے اس کے جذبات، اس کے احتیاجات، اس کی تعلیم، غرض کہ اس سے متعلق ہر شئے متحد ہو کر امریکی کی توجہ کو ہمیشہ زمین ہی کی طرف کھینچتی ہے۔ صرف اس کا مذہب کبھی کبھی اسے ایک نگاہ آسمان کی طرف ڈالنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لیئے ہمیں تمام جمہوری ملکوں کو امریکہ کی مثال کے تحت، تصوّر نہیں کرنا چاہیئے۔ اور ان کا مطالعہ خود

ان کی اپنی نمایاں خصوصیات کے لحاظ سے کرنا چاہیئے۔

یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک قوم مختلف طبقات میں بٹی ہوئی نہ ہو۔ اور اس کا قانون کسی قسم کی مراعات اور درجہ بندیاں قبول نہ کرتا ہو۔ اور وہاں معاشی اور معاشرتی مساوات ہو۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود وہ قوم علم اور آزادی سے محروم ہو سکتی ہے۔ یہ محض خیالی مفروضہ نہیں ہے یہ عین ممکن ہے۔ ایک مطلق العنان اور مستبد حاکم اپنے ہی مفاد میں یہ ضروری سمجھے کہ لوگ مساوی المرتبہ رہیں۔ اور ساتھ ہی جاہل اور بے علم تاکہ ان پر آسانی سے حکومت کی جا سکے۔ اس قسم کے جمہوری لوگوں کو نہ صرف یہ کہ علم اور سائینس سے دلچسپی ہی نہ ہو گی بلکہ شاید علم اور سائینس کبھی بھی ان کے قبضے میں نہ آئے۔ قانون وراثت ان کی جائداد کو مساوی طور پر نسل در نسل تقسیم کرتا چلا جائے گا۔ غریب آدمی جس کو نہ علم حاصل ہے اور نہ آزادی مزید دولت حاصل کرنے کا تصور بھی ذہن میں نہ لا سکے گا۔ اور امیر آدمی بتدریج کسی مزاحمت کا تصور کیئے بغیر ہی غربت کی طرف چلے جائیں گے۔ اور چند ہی دنوں میں معاشرہ کے ان ارکان کے درمیان مکمل مساوات قائم ہو جائے گی۔ اور کسی شخص کے پاس ذہنی کاوشوں کے لیئے نہ وقت ہو گا اور نہ مذاق۔ اور تمام انسان عالم جہالت اور مساویانہ غلامی کے تحت تقریباً مفلوج حالت میں زندگی بسر کریں گے۔

میں جب اس قسم کی کسی جمہوریت کا تصور کرتا ہوں تو اپنے آپ کو ایک ایسے تاریک کمرہ میں پاتا ہوں جہاں روشنی اور ہوا کا کوئی گذر نہیں۔ اور عالمِ مایوسی میں ہاتھ پاؤں مارتا ہوں۔ تاکہ کوئی ایسا سوراخ معلوم کر سکوں جہاں سے مجھے روشنی اور ہوا دوبارہ مل سکے۔ لیکن یہ تمام باتیں ان لوگوں پر صادق نہیں آتیں جنہوں نے اپنی آزادی برقرار رکھی ہے۔ اور جنہوں نے اپنے ان مخصوص موروثی حقوق کو ختم کر دیا ہے جو جائیداد کی ملکیت کو صرف چند ہاتھوں میں رکھنے کا باعث رہتے ہیں۔

جب جمہوری معاشرہ میں رہنے والے روشن خیال اور تعلیم یافتہ ہوں تو وہ خود اُس بات کا پتہ چلا لیتے ہیں کہ وہ کسی ایسے بندھن میں جکڑے ہوئے نہیں ہیں جن کی بنا پر وہ اپنی موجودہ حالت پر قانع رہنے پر مجبور رہوں۔ اس لیئے وہ اپنی قسمت کو بہتر بنانے کے لیئے کوشش کرتے ہیں۔ اگر وہ آزاد ہیں تو سب ایسی کوشش کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ سب کو اس میں کامیابی نہ ہو۔ بے شک مجلس قانون ساز مراعات اور حقوق عطا نہیں کرتی۔ لیکن فطرت کرتی ہے۔ چونکہ فطرت عدم مساوات پر رہی ہوتی ہے اس لئے تمول اور دولت مندی میں عدم مساوات پیدا ہوتی ہے۔

قانونِ وراثت متمول خاندانوں کے معرض وجود میں لانے کو روکتا ہے۔ لیکن یہ افراد کو متمول ہونے سے نہیں روک سکتا۔ یہ قانون معاشرہ کے ارکان کو اس سطح پر لاتا رہتا ہے۔ جس سے لوگ بچ کر آگے نکل جاتے ہیں۔ اور دولت کی عدم مساوات میں اسی تناسب سے اضافہ ہوتا ہے جس رفتار سے کہ ان کے علم میں وسعت اور آزادی میں اضافہ ہوتا ہے۔

ہمارے اس دور میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا ہے جس کے ارکان انتہائی ذہین اور باصلاحیت لوگ ہیں۔ یہ طبقہ چاہتا ہے کہ ساری دولت کو ایک مرکزی طاقت کے ہاتھ میں دے دیا جائے ۔ جس کے بعد یہ طاقت ساری دولت کو افراد میں ان کی قابلیت کے لحاظ سے تقسیم کرے۔ ممکن ہے کہ یہ اس مکمل اور دائمی مساوات سے مفر اختیار کرنے کا ایک طریقہ ہو۔ جس کے خطرے سے جمہوری معاشرہ کو دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن کسی کو کسی قسم کی مُراعات نہ دینا۔ اور سب کو مساوی آزادی اور مساوی بہبود عطا کرنا اور ہر ایک شخص کو اپنا مقام متعین کرنے کی اجازت دے دینا شاید ایک سادہ اور کم خطرناک علاج ہو۔ اس کے بعد فطری عدم مساوات اپنا راستہ آپ بنالے گی۔ اور دولت فوراً ان لوگوں کے ہاتھوں منتقل ہو جائے گی جو سب سے زیادہ قابل ہیں۔

اسی بناء پر آزاد اور جمہوری معاشروں میں ایسے بے شمار لوگ ہمیشہ ہوا کرتے ہیں جو مرفہ الحال اور قابلیت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان دولت مندوں میں وہ باہمی تعلق نہیں ہوتا جو شرفا کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے میلانات مختلف ہوتے ہیں۔ اور وہ شاید ہی فرصت کے لمحات سے مستفید ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بے حد زیادہ ہوتی ہے۔ یہ لوگ عملی زندگی کی الجھنوں میں ہمیشہ گرفتار نہیں رہتے۔ اور کسی نہ کسی حد تک وہ ذہنی کاوشوں میں حصّہ لینے کے قابل ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب تک انسان طبعی احتیاجات میں مبتلا رہتا ہے وہ زمین ہی سے وابستہ رہتا ہے اور جونہی احتیاجات کی بندھنیں ڈھیلی پڑ جاتی ہیں تو وہ پھر زمین سے بلند ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

چنانچہ اس طرح فکری اور ذہنی تخلیقات زیادہ ہوں گی۔ بلکہ ذہنی مسّرتوں کا ذوق بتدریج معاشرہ کے ان طبقات تک بھی پہنچ جائیگا جن کا اشرافیہ کے تحت گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جب دولت، مرتبہ اور جاگیر کی بناء پر امتیاز رکھا جائے گا۔ تو ایسی صورت میں لوگوں میں امتیاز پیدا کرنے والی ایک ہی شے۔ یعنی ذہنی صلاحیتیں ہوں گی۔ اور ایسی صورت میں اُس شے کی زیادہ سے زیادہ قدر ہوگی جو ذہنی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ جلا دے۔

آزاد اور تعلیم یافتہ معاشرہ میں کوئی شے انسانوں کو انسانوں سے جدا نہیں رکھ سکتی۔ اور انہیں اپنے مقاموں پر محدود نہیں کر سکتی۔ وہ ترقی اور تنزّل کی طرف بہت تیزی سے بڑھتے ہیں۔ تمام طبقات ایک دوسرے سے قریب رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے فیضان حاصل کرتے رہتے ہیں۔ ان کے باہمی اختلاط سے متعدد نظریات پیدا ہوتے ہیں۔

ایک جمہوری معاشرہ میں خادم اپنے آپ کو آقا کے ذوق اور کاوشوں سے جدا نہیں

رکھ سکتا۔ اور نہ غریب آدمی امیروں سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔

غرض یہ کہ جوں ہی لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ذہنی کاوشوں میں حصّہ لیتی ہے تو انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک میں برتری حاصل کرنے میں شہرت، طاقت اور دولت مضمر ہے۔ مسادات جو لوگوں کو بے پناہ جذبۂ عمل عطا کرتی ہے وہ اس میدان میں بھی محرک ہو جاتی ہے۔ اور ان لوگوں کی تعداد بڑھتی ہی چلی جاتی ہے جو سائنس، ادب اور فنونِ لطیفہ کے میدان میں جوہر دکھاتے ہیں — ذہنی دنیا میں ایک عظیم سرگرمی دکھائی دیتی ہے۔ اور ہر شخص اپنے لئے ایک نئی راہ ہموار کرنے کی کوشش کرتا نظر آتا ہے۔ اور لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا دکھائی دیتا ہے۔ ایسی کاوشیں اکثر نامکمّل ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بے شمار ہوتی ہیں۔ اور اگرچہ انفرادی مساعی کے نتائج معمولی ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ ان باتوں کے پیشِ نظر یہ کہنا درست نہیں ہے کہ جمہوری معاشرہ کے تحت رہنے والے لوگ سائنس، ادب اور فنونِ لطیفہ سے بے گانہ ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ان میدانوں میں اپنے مخصوص انداز میں اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔

(۲۰)

امریکی عملی علوم کو نظریاتی علوم پر کیوں ترجیح دیتے ہیں؟

اگر کسی معاشرہ کی جمہوری حالت اور جمہوری ادارے انسانی ذہن کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے تو یقیناً وہ کسی معاشرہ کی ایک خاص سمت میں رہنمائی کرتے ہیں۔ ان کی مساعی پھر بھی بے حد زیادہ ہوتی ہیں۔ اگر میں عالمِ خیال میں ان کی مساعی کا تصوّر کروں تو امید ہے کہ آپ مجھے معاف کریں گے۔

امریکیوں کے فلسفیانہ طریق کار پر بحث کرتے ہوئے میں نے بعض امور کا تذکرہ کیا تھا میں نے یہ کہا تھا کہ مساوات انسان میں یہ خواہش پیدا کرتی ہے کہ وہ ہر مسئلہ کے بارے میں اپنی رائے آپ قائم کرے اور ٹھوس اور حقیقی معنوں میں فائدہ رساں چیزوں کا ذوق پیدا کرتی ہے۔ اور روایات اور رسوم سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ یہ عام رجحانات زیرِ نظر باب کے مخصوص موضوع میں نظر آئیں گے۔

جو لوگ جمہوری قوموں میں علوم کی ترویج کرتے ہیں اس خوف میں مبتلا رہتے ہیں کہ کہیں وہ محض قیاس آرائیوں میں بھٹک نہ جائیں۔ وہ نظاموں پر اعتماد نہیں کرتے اور ہمیشہ حقائق سے وابستہ رہتے ہیں اور حقائق کا اپنے اپنی احساسات کے ذریعہ مطالعہ و تجزیہ کرتے ہیں۔ چونکہ وہ اپنے کسی ہم جنس کے محض نام کا احترام نہیں کرتے اسلئے وہ کسی شخص کی حاکمیت اور استبداد کو تسلیم کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس ان کی مسلسل یہی کوشش رہتی ہے کہ اپنے ہمسایہ کے نظریات کے کمزور پہلو معلوم کریں۔ سائنس کی مثالیں ان کے لئے کوئی وزن نہیں رکھتیں۔ نہ ہی انہیں کسی

خاص مکتبِ فکر کی نازک خیالی متاثر کر سکتی ہے۔ اور نہ ان پر پُرشکوہ الفاظ اثر ڈال سکتے ہیں۔ اور وہ بذاتِ خود اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ حقائق کی تہہ تک پہنچیں۔ اور وہ ان کی وضاحت اور اظہار اپنی عامیانہ زبان میں کرتے ہیں۔

یہ طرزِ فکر، سائنس کو تین شعبوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلا حصّہ نظریاتی اصول، اور مجرّد تصوّرات پر مشتمل ہوتا ہے جن کا اطلاق نامعلوم یا دور از کار ہوتا ہے۔ دوسرا حصّہ ان عام حقائق پر مشتمل ہوتا ہے جو اصلاً تو اصول اور نظریات ہی کا حصّہ ہوتے ہیں لیکن ان کے ذریعہ بالراست عملی نتائج حاصل ہو سکتے نہیں۔ اطلاق کے طریقہ ہائے کار اور ذرائع تعمیل تیسرا حصّہ ہوتے ہیں۔ علم کے ان تینوں حصّوں کا علٰحدہ علٰحدہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ علٰحدہ علٰحدہ طور پر ان ہی سے کوئی ایک حصّہ زیادہ دیر تک دوسرے حصّہ کی اعانت کے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔

امریکہ میں سائنس کے بالکلیہ عملی حصّہ کو قابلِ ستائش حد تک بہتر طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اور اس نظری حصّہ پر گہری توجہ دی جاتی ہے جس کا راست تعلق سائنس کے اطلاق سے ہے۔ اس سلسلہ میں امریکی ہمیشہ واضح، آزادانہ اور جدت پسندی اور ذہانتِ طبع کا مظاہرہ کریں گے۔ لیکن امریکہ میں شائد ہی کوئی شخص سائنس کے بالکلیہ نظریاتی اور مجرد حصّہ پر توجہ دیتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں بے اعتنائی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ہے۔

سائنس اور اعلےٰ علوم کے فروغ کے لئے گہری غور و فکر اور انہماک سے زیادہ کسی اور شے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور غور و فکر کے لئے ناسازگار ترین شئے جمہوری معاشرہ کی ہیئتِ ترکیبی ہوتی ہے۔ اشرافیہ کی طرح، جمہوری معاشرہ میں کوئی طبقہ ایسا نہیں ہوتا ہے جو اپنے حالات سے اس قدر مایوس رہتا ہے کہ وہ حرکت ہی نہیں کرتا۔ جمہوری معاشرہ کا ہر شخص حرکت میں ہوتا ہے۔ بعض طاقت کی خواہش میں اور

بعض منفعت کی تلاش میں۔ ظاہر ہے کہ اس ہیجان اور ہنگامہ آفرینی میں وہ خاموشی ہی میسر نہیں آسکتی جو عمیق غور و فکر کے لئے ضروری ہے۔

مگر یہاں اس مستقل ہیجانی کیفیت میں جو ایک مستحکم اور پر امن جمہوریت ہی لوگوں کے دلوں میں موجزن کر سکتی ہے۔ اور ان ہنگامہ خیز اور انقلابی تحریکوں میں امتیاز کرنا ضروری ہے۔ جو ایک جمہوری معاشرہ کی پیدائش کے وقت وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ انسانی مہذب اقوام میں جب انقلاب برپا ہوتا ہے تو وہ ان کے نظریات اور احساسات کو جھنجوڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور یہ بات خاص طور پر جمہوری انقلابات کی صورت میں بطورِ خاص صادق آتی ہے۔ انقلابات آبادی کے تمام طبقات میں ایک خاص ہیجان پیدا کرتے ہیں۔ اور ہر فرد کے سلسلے میں غیر متوازن حوصلے پیدا کرتے ہیں۔ فرانسیسیوں نے سائنس کے میدان میں اسی زمانے میں حیرت انگیز ترقیاں کیں جس زمانے میں وہ جاگیردارانہ نظام کو پارہ پارہ کر رہے تھے۔

بڑے انقلابات جمہوری ملکوں میں عام طور پر نہیں آتے۔ لیکن آبادی کے طبقات میں بے چینی سی رہتی ہے۔ جو ذہن کو بھی مشتعل کئے بغیر حرکت میں رکھتی ہے

جمہوری معاشروں میں رہنے والے لوگ نہ صرف یہ کہ غور و فکر میں غلطاں نہیں رہتے بلکہ وہ اس استغراق کی کیفیت کو کچھ زیادہ باعثِ عزت بھی تصور نہیں کرتے۔ معاشرہ کی جمہوری حالت زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مصروفِ عمل رکھتی ہے۔ اور ذہن کے عملی امور میں یہ مصروفیت کا ماحول غور و فکر کے لئے موزوں نہیں رہتا۔

(۲۱) امریکی اور فنون

یہ بات تضیع وقت کا باعث ہو گی۔ اگر ہیں اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کروں کہ متوسط طبقہ کے لوگوں کی کثرت، فالتو دولت کی کمی اور مادی آسائشوں اور راحتوں کی عام خواہش لوگوں کے نقطۂ نظر میں حسن وجمال سے محبت کی بجائے افادیت پسندی پیدا کرتے ہیں۔ ایسی جمہوری اقوام جن میں مندرجہ باتیں موجود ہیں، صرف ایسے ہی فنون میں دلچسپی کا اظہار کریں گی جن سے ان کی زندگی آسان بنتی ہو۔ اور ان چیزوں کو کم ترجیح دیں گی جو ان کی زندگی کے لئے باعث زینت ہوں۔ وہ عادتاً مفید چیز کو خوبصورت شے پر فوقیت دیں گے۔ اور یہ کوشش کریں گے کہ خوبصورت شے بھی مفید ہو۔

مراعات اور استحقاق کے دور میں عام طور پر آرٹ میں بھی ایک خاص قسم کی اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے۔ اور ہر پیشہ ایک الگ راستہ کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جس پر دوسرے کو چلنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ جب پیداوار صنعت آزاد ہو جاتی ہے تو پیشہ میں یہ درجہ بندی پیدا ہو جاتی ہے جو امراء کی حکومت کی نمایاں خصوصیت ہوا کرتی ہے۔ یہ بات ان تمام لوگوں کو جو ایک ہی قسم کے فن یا پیشہ کے ماہر ہوتے ہیں بتدریج دوسروں سے علیحدہ کر کے ایک خاص فرقہ بنا دیتی ہے۔ اور بالآخر ایک خاص پیشہ سے تعلق رکھنے والے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے ارکان آپس میں ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں۔ اس قسم کے طبقہ یا جماعت میں ہر فنکار کو نہ صرف اپنا مستقبل سنوارنا پڑتا ہے بلکہ اس کو

اپنی شہرت کی حفاظت کرنا پڑتی ہے ۔ اس کے اپنے مفادات یا اس کے گاہک بھی اس کو اپنی متعین راہ سے نہیں ہٹا سکتے ۔ بلکہ وہ بحیثیت مجموعی اس جماعت کے تابع ہوتا ہے جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے ۔ اور اس جماعت کی بہبود اسی بات میں مضمر ہے کہ اس کا ہر ایک رکن یعنی فنکار اپنی کاریگری کا بہترین نمونہ پیش کرے ابتدائی دور میں آرٹ کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جو چیز بھی پیدا کی جائے وہ ممکن حد تک بہترین ہو۔

اس کے برعکس ایسی صورت حال میں جبکہ ہر پیشیہ کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا ہوا ہو ۔ اور جب ہزار ہا لوگ کسی پیشیہ کو قبول اور ترک کر رہے ہوں ۔ اور جب اس پیشیہ سے متعلق ہزاروں لوگ ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں ، تو ان میں باہمی سماجی تعلق ختم ہو جاتا ہے ۔ ہر کاریگر یکہ و تنہا ہو جاتا ہے اور اس کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ کم از کم لاگت پر زیادہ سے زیادہ منافع کمائے ۔ گاہک کی خواہش اس کے حد کی انتہا ہوتی ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ گاہکوں میں بھی ایک تبدیلی آتی ہے ۔ ایسے ملکوں میں جہاں دولت اور طاقت دونوں چند ہاتھوں میں مرتکز ہوتے ہیں ۔ دنیا کی زیادہ اشیاء بھی چند ہی لوگوں کی ملکیت میں ہوتی ہیں ۔ اور بالآخر یہ بات جہاں تک فنون کا تعلق ہے قوم کے طرز فکر پر بھی اثر انداز ہوتی ہے ۔ اشرافیہ کا مذاق عام لوگوں کو بھی متاثر کرتا ہے ۔ اس قسم کے معاشرہ میں شائستگی ذوق اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ ایک معمولی کسان بھی اپنی کسی محبوب شے کے حاصل نہ کرنے کو اس بات پر ترجیح دے گا کہ وہ ناقص شے حاصل کرے ۔ پس اس طرح اشرافیہ میں کاریگر صرف چند لوگوں کے لئے اشیاء تیار کرتے ہیں ، اور اپنی شے کی خوبصورتی اور اپنے کام کی عمدگی کے ذریعہ منافع حاصل کرتے ہیں ۔

لیکن جمہوری دور میں جہاں تمام مدارج اور طبقات ختم ہو جاتے ہیں یہ صورت حال باقی نہیں رہتی ۔ لوگوں کی سماجی حالت میں تغیر و تبدل آتا رہتا ہے ۔ آج کا امیر کل کا

غریب، کل کا غریب آج امیر بن جاتا ہے۔ اشرافیہ کے برعکس جمہوری معاشرہ میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جن کی اقتصادی حالت مائل بہ ترقی ہوتی ہے۔ لیکن ان کی خواہشات ان کی روزافزوں دولت سے بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ اور وہ ان تمام چیزوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں جن کا بار ان کی اقتصادی حالت اٹھا نہیں سکتی۔ اس قسم کے افراد اپنی آرزوؤں کی تسکین کے لئے چھوٹے راستے تلاش کرتے ہیں۔ ان دونوں وجوہات کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ جمہوری ملکوں میں عام طور پر ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جن کی خواہشات ان کے ذرائع سے زیادہ ہوتی ہیں۔ اور وہ عام طور پر اس بات پر آمادہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنی خواہشوں کی ناقص طور پر ہی تکمیل کریں۔ بہ نسبت اس کے کہ اس خواہش سے ہی دستبردار ہو جائیں۔

کاریگر اس رجحان کو فوری طور پر تاڑ لیتا ہے، کیونکہ وہ خود اس رجحان کی رَو میں بہتا ہے۔ اشرافیہ میں تو وہ اپنی بہترین کاریگری کے نمونوں کو صرف چند لوگوں کے ہاتھوں اعلیٰ قیمتوں پر فروخت کرتا ہے۔ لیکن جمہوری معاشرہ کے اس رجحان کے تحت وہ اندازہ کر لیتا ہے کہ دولت مند بننے کا آسان ترین راستہ یہی ہے کہ چیزیں سب کو اور کم قیمت پر فروخت کی جائیں۔ لیکن اشیاء کی قیمتوں میں کمی کرنے کے صرف دو طریقے ہیں۔ اولاً یہ کہ اشیاء کو تیار کرنے کے آسان، تیز اور تیز تر ذرائع معلوم کئے جائیں اور دوسرا یہ کہ انہیں زیادہ سے زیادہ مقدار میں پیدا کیا جائے جو یکساں قسم کی ہوں لیکن بہ اعتبار قیمت کم ہوں۔ جمہوری معاشرہ میں کاریگروں کی ساری صلاحیتیں اا۔ دونوں مقاصد کے حصول کے لئے صرف ہوتی ہیں۔ وہ ایسے طریقے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے جن کے ذریعہ نہ صرف بہتر طور پر کام کر سکے بلکہ تیز اور ارزاں کام کر سکے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو وہ اس شے کی اصلی قدر کو گھٹا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر جس زمانے میں صرف دولت مند ہی گھڑیاں

خریدنے کے متحمل ہو سکتے تھے تو اُس وقت ہر گھڑی اچھی ہؤا کرتی تھی۔ لیکن اب چند ہی گھڑیاں اچھی ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ انہیں ہر کس و ناکس خرید سکتا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیئے کہ جمہوری معاشرہ میں صنعت اور حرفت ضرورت کے وقت محیر العقول کارنامے انجام نہیں دے سکتی۔ لبا اوقات متعدد صنعتوں کی موجودگی میں اور ان کے درمیان شدید قسم کی مسابقت اور متنوع تجربات کی وجہ سے بہترین کاریگر پائے جاتے ہیں جو اپنے فن کی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن انہیں اپنی ہنرمندیوں کے جوہر دکھانے کا شاید و باذ ہی موقع ملتا ہے۔

جب میں کسی ملک کی سیاحت کرتا ہوں اور وہاں مجھے کاریگری اور صنعت کے اعلیٰ نمونے دکھائی دیتے ہیں تو مجھے ان سے اس ملک کی معاشی، سماجی یا سیاسی حالت کا کچھ پتہ نہیں چل سکتا ہے۔ لیکن اگر اس ملک میں محنت کے نمونے گھٹیا ہوں، بجد زیادہ اور سستے ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اس ملک میں مخصوص طبقات ختم ہو رہے ہیں۔ اور ملک میں غیر طبقاتی معاشرہ پیدا ہو رہا ہے۔

جمہوری معاشروں میں ہنرکار اور صناع نہ صرف اپنی مصنوعات کو ہر کس و ناکس کی رسائی کے قابل بنانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ وہ اپنی مصنوعات سے ایسی مصنوعات بھی منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو دراصل ان میں نہیں پائی جاتیں۔ اور بالآخر اصل سے زیادہ نقل پر توجہ دی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں فنون لطیفہ کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ جمہوری معاشرہ میں یہ ضروری نہیں ہے کہ فنونِ لطیفہ کے پرستاروں کی تعداد کم ہو۔ لیکن جمہوری معاشرہ کے مخصوص رجحانات فنون لطیفہ پر بھی ایک خاص طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور عام فنون ہی کی طرح فنون لطیفہ میں بھی بالآخر اصل کی جگہ نقلی اور گھٹیا اشیاء کا ذوق حاصل کر لیتا ہے۔

اعیانی معاشرہ میں چند لیکن عظیم تصاویر بنائی جاتی ہیں — جمہوری ملکوں میں تصویروں کی تعداد زیادہ تو ہوتی ہے لیکن وہ گھٹیا ہوتی ہیں۔ اوّل الذکر ملکوں میں کانسی کے عظیم مجسّمے ایستادہ کر دیئے جاتے ہیں۔ لیکن جمہوری ملکوں میں وہ پلاسٹر میں ڈھالے جاتے ہیں۔

میں پہلی مرتبہ جب نیویارک پہونچا تو ساحل کے ساتھ ساتھ مجھے سنگ مرمر کے چھوٹے چھوٹے محلّات دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی۔ ان محلّوں میں سے اکثر کا طرزِ تعمیر قدیم تھا۔ دوسرے دن جب ان محلات کو دیکھنے کے لئے گیا تو اور ان کا قریب سے مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ سنگِ مرمر کے نہ تھے۔ ان کی دیواریں سفید اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ اور ان کے چوبی ستونوں پر سفید روغن کیا ہوا تھا تاکہ وہ سنگِ مرمر کے دکھائی دیں۔

(۲۲) جمہوری دور کی ادبی خصوصیات

کوئی سیاح امریکہ کے کسی کتب فروش کی دوکان میں قدم رکھتا ہے تو اُسے الماریوں میں بے شمار کتابیں نظر آئیں گی لیکن ان میں مشہور و معروف مصنّفوں کی بے حد کم ہوں گی۔ زیادہ تر کتابیں ابتدائی نوعیت کی ہوں گی۔ ان میں سے اکثر یورپ میں لکھی ہوئی ہوں گی۔ امریکی انہیں اپنے مخصوص حالات کے تحت دوبارہ چھاپ لیتے ہیں۔ اور اپنی ضروریات کے مطابق تبدیلیاں کر لیتے ہیں۔ کتابوں کی دوسری قسم ’بائبل اور دیگر مذہبی رسالے ہیں۔ اور تیسری قسم سیاسی پمفلٹوں کی ہے۔ امریکہ میں سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے نظریات کا مقابلہ کرنے کے لئے کتابیں نہیں لکھتے ہیں بلکہ وہ پمفلٹ لکھتے ہیں۔ جو ایک ہی دن انتہائی تیزی کے ساتھ لوگوں میں تقسیم کر دیئے جاتے ہیں اور اس کے بعد ان پمفلٹوں کی عمر ختم ہو جاتی ہے۔

غرض یہ کہ ان کتابوں کے انبوہ میں بعض ایسے مصنّفوں کی کتابیں بھی ملیں گی جن سے اہل یورپ کو واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ امریکہ دنیا میں ایک ایسا واحد تہذیب یافتہ ملک ہے جہاں ادب کی طرف کم ہی توجہ دی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود لوگوں کی ایک بڑی تعداد اپنے فرصت کے اوقات میں ہی سہی ادبی شہ پاروں سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ انگلستان سے زیادہ تر کتابیں منگوائی جاتی ہیں۔ تمام اہم کتابیں خود امریکہ میں دوبارہ شائع کی جاتی ہیں۔ امریکہ کی علمی دنیا میں روشنی انگلستان ہی کی ادبی مشعل سے قائم ہے۔ امریکہ کے ہر ابتدائی نوآبادکار کی جھونپڑی میں ضرور شیکسپیئر کی کوئی نہ کوئی جلد ملے گی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے ایک لکڑی کے گھر

میں شیکسپیئر کا مشہور ڈرامہ "ہنری پنجم" پڑھا تھا۔
امریکہ کے لوگ نہ صرف انگلستان کے ادبی خزانوں سے مستفید ہوتے ہیں بلکہ یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے کہ ان کی اپنی سرزمین پر انگریزی ادب نشوونما پا رہا ہے امریکہ میں جو لوگ ادب کی خدمت میں منہمک ہیں ان کا بڑا حصّہ انگریزی نسل سے تعلق رکھنے والوں پر مشتمل ہے۔ اور وہ انگریزی روایات ہی کے پابند ہیں۔
اپنے ادیبوں اور ان کے شہ پاروں کی امریکہ میں اشاعت کے بعد وہ اپنی رائے قائم کرنے کے سلسلے میں اس وقت تک انتظار کرتے ہیں جب تک اس ادیب یا اس کی تصنیف کی شہرت پر انگلستان کی رائے عامہ مہر توثیق ثبت نہ کرے۔
غرض یہ کہ امریکہ کے باشندے صحیح معنوں میں اپنے کسی خاص ادب کے حامل نہیں ہیں۔ امریکہ میں جو بھی کوئی ادیب یا مصنّف ہیں وہ صحافی ہیں۔ اگرچہ وہ بڑے ادیب یا انشا پرداز نہیں ہیں لیکن وہ اپنے ملک کے ترجمان ہیں۔ اور لوگ ان ہی کی تحریروں سے آشنا ہیں۔ دوسرے ادیب غیر ملکی ہیں۔ امریکیوں کی نظر میں ان کی وہی وقعت ہے جو ہمارے ابتدائی دور میں یونان اور روما کے ادب کے نقالوں کی تھی۔ ان کا مطالعہ جذبہ تجسّس کی تسکین کے لئے تو کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ عام ہمدردی اور مقبولیت کے حامل نہیں۔
میں نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ یہ صورت حال محض جمہوری معاشرے ہی کی پیداوار نہیں ہے۔ اور اس کے وجوہ کو متعدد عوامل میں تلاش کرنا پڑے گا۔ اگر امریکی بہ اعتبارِ نسل اہل یورپ سے مختلف ہوتے اور ان کو اپنے موجودہ قوانین اور سماجی حالات کے ساتھ کسی اور ملک میں منتقل کر دیا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ اس کا ایک خاص ادب پیدا ہو گیا ہوتا۔ اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ وہ بالآخر ایک ادب کے حامل ہو جائیں گے۔ لیکن وہ ادب اس ادب سے مختلف ہوگا جو اس دور میں ہے۔ اس ادب کی کیا نوعیت ہوگی اس کا اندازہ کرنا چنداں مشکل نہیں ہے۔

اشرافیہ میں سیاست کی طرح ادب بھی ایک مخصوص طبقہ سے وابستہ رہتا ہے۔ اور یہی بات کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔

جب افراد کی ایک محدود تعداد ایک ہی مقصد کے لئے کوشاں ہو تو وہ مختلف امور میں آسانی سے متحد الخیال ہو سکتے ہیں۔ اور وہ بعض قواعد پر متفق ہو جاتے ہیں اور اگر یہ مقصد ادب ہو تو یقین ہے کہ ادبی تخلیقات کرنے والے بعض ایسے واضح اور معیّن قواعد کے پابند ہو جائیں گے۔ جن سے وہ انحراف نہ کر سکیں گے۔ اور اگر ان لوگوں کا کوئی موروثی اعلیٰ مقام ہو تو وہ اس بات کا بھی انتظام کریں گے ان کے معین کردہ قواعد کی پابندی آئندہ نسلیں بھی کریں۔ اس طرح یہ قواعد متعدد نسلوں کی رہنمائی کریں گے۔ غرض اس طرح ادب میں ایک اسلوب پیدا ہو گا۔ اور ہر تحریر قواعد اور اصولوں کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہو گی۔

جمہوری معاشرہ میں اس کے برعکس حالات ہوں گے۔ وہاں معاشری طبقات کی عدم موجودگی کی وجہ سے کوئی روایات نہ ہوں گی۔ اور نہ ہی رسوم اور قواعد کی پابندی ہو گی۔ کیونکہ ہر نسل نئی ہو گی اور وہ اپنے ہی ڈگر پر چلے گی۔

علاوہ ازیں، اعیانی معاشرہ کے برعکس، جمہوری معاشرہ میں یہ ضروری نہ ہو گا کہ ادیب یا شاعر کو ادبی تربیت بھی حاصل ہو۔

بہر حال یہ کہ جمہوری دور میں ادب میں وہ تنظیم باقاعدگی، عظمت نہیں پیدا ہو سکتی ہے جو اشرافی معاشرہ کے ادب میں ہو سکتی ہے۔ اس کے اسلوب میں ہلکا پن ہو گا۔ طرز نگارش میں عام طور پر مبالغہ آرائی ہو گی۔ تحریر میں صحت کا فقدان ہو گا۔ مصنف کی کوشش یہ ہو گی کہ کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لکھے۔ ضخیم کتابوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی کتابیں زیادہ ہوں گی۔ علمیت سے زیادہ مزاح مقبول ہو گا۔ ٹھوس دلائل اور جامعیت کی جگہ قیاس آرائی زیادہ ہو گی۔ مصنف کا مدعا زیادہ تر اپنے قاری کو

حیرت میں ڈالا ہو گا نہ کہ اس کی ذہنی مسرّت کا سامان مہیا کرنا۔ اور وہ ذوق کی تسکین کی بجائے جذبات کو بھڑکائے گا۔

خال خال ایسے ادیب اور انشاء پرداز بھی ملیں گے جنہوں نے اپنی راہیں الگ تلاش کی ہوں۔ اور اگر وہ برتر صلاحیتوں کے حامل ہوں تو وہ اپنا ایک خاص مقام اور حلقہ بھی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن ایسے ادیب کم ہوں گے۔

میں نے دو انتہائی صورتیں بیان کی ہیں۔ کسی قوم کو ایک حالت سے دوسری حالت میں جانے کے لئے بتدریج عبوری دَور میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور اس دَور میں ادب اور ادیب پر مختلف قسم کے اثرات کام کرتے ہیں۔ اور اسی دور میں جمہوری دَور کی ادبی ذہانت اور اشرافی ادب میں ایک امتزاج پیدا ہوتا ہے۔ اور دونوں ذہنِ انسانی پر اپنا سکّہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے دَورِ عبوری ہوتے ہیں۔ لیکن وہ روشن ترین دور ہوتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کا فرانسیسی ادب اس امر کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔

(۲۳) جمہوری اقوام میں شاعری کے چند ماخذ

لفظ "شاعری" کو مختلف معنی و مفہوم پہنائے گئے ہیں۔ اور ان متعدد مفہوم اور تعریفات میں کسی ایک کا انتخاب کرنے کی وجہ بیان کرنے کے لئے وقت، اور لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے میں یک لخت اپنے قارئین کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے شاعری کی کونسی تعریف قبول کی ہے۔ میرے نزدیک شاعری ایک مقصد کی تلاش اور پھر اسی مقصد کی عکاسی اور تصویر کشی کا نام ہے۔

شاعر بعض باتوں کو رد کرتا ہے اور اپنی تصویر میں بعض خیالی باتوں کا اضافہ کرتا ہے اور بعض ایسے حقیقی حالات کا امتزاج کرتا ہے جو در اصل وقوع پذیر نہیں ہوتے۔ اور اس طرح وہ فطرت کے کام کی تکمیل اور توسیع کرتا ہے۔ شاعری کا مقصد محض حقائق کی ترجمانی نہیں ہے۔ بلکہ حقائق کو زینت بخشنا ہے۔ اور انسانی ذہن کے لئے چند اعلیٰ تصوّرات پیش کرتا ہے۔ نظم جو زبان کے مثالی حسن کی ایک شکل ہوتی ہے یقیناً شاعرانہ ہوگی لیکن نظم بجائے خود شاعری نہیں کہلائی جا سکتی۔

اب میں اس مسئلہ پر بحث کروں گا کہ جمہوری اقوام کے طرز فکر، جذبات اور ان کی روزمرہ زندگی کی مصروفیتوں میں کوئی شے ایسی بھی ہے یا نہیں جو ان کی ایک مسلک اور ایک آدرش کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور اسی بناء پر وہ شاعری کا ماخذ کہلائی جا سکتی ہے۔

اوّلاً اس بات کو تسلیم کرنا چاہیئے کہ جمہوری ملکوں میں مثالی حسن اور جمال کا ذوق، اور ان کے اظہار سے ذہنی مسرّت حاصل کرنے کی عادت اس قدر شدید اور ہمہ گیر نہیں ہوتی۔ جو عام طور پر اشرافی ملکوں میں ہوتی ہے۔

جمہوری ملکوں میں جسمانی راحتوں کی محبت، اپنی حالت کو بہتر سے بہتر بنانے کا تصوّر، مسابقت کی شدید خواہش، متوقع کامیابیوں کے تصوّر سے لطف اندوزی اور اس قسم کی متعدد باتیں ایسی ہیں جو انسانوں کو ان کے اپنے پسندیدہ پیشوں اور کاموں میں دن رات منہمک رکھتی ہیں۔ اور انہیں دوسری باتوں پر توجہ دینے کی لمحہ بھر فرصت نہیں ملتی۔ ان کی تمام صلاحیتیں اس مقصد کے حصول کے لئے صرف ہوتی ہیں۔ تخیل اور فکر مفقود نہیں رہتے لیکن تخیل و فکر کا اساسی مقصد یہ رہ جاتا ہے کہ فائدہ مند چیزیں معلوم اور دریافت کی جائیں۔ اور انہی چیزوں کی ترجمانی کریں جو حقیقی ہوں۔ مساوات کا تصوّر لوگوں کی توجہ نہ صرف خوبصورت اشیاء کے اظہار و بیان سے ہٹا دیتا ہے بلکہ وہ اس نوع کی قابل بیان اشیاء کی تعداد بھی گھٹا دیتا ہے۔

اشرافیہ کے تحت چونکہ معاشرہ ایک متعین مقام میں رہتا ہے، اس لئے وہ مثبت مذاہب کے استحکام اور پائیداری کے لئے موزوں ہے۔ اور اسی طرح وہ سیاسی اداروں کے استحکام کے لئے بھی سازگار ہوتا ہے۔ یہ نہ صرف انسانی ذہن کو چند متعین اور مخصوص عقائد کی حدود میں پابند رکھتا ہے بلکہ وہ انسانی ذہن کو صرف ایک ہی مذہب یا عقیدہ کو قبول کرنے کے لئے پہلے ہی سے آمادہ رکھتا ہے

اشرافیہ کے تحت عوام ہمیشہ اس بات کی طرف مائل ہوں گے کہ وہ درمیانی طاقت خدا اور انسان کے درمیان کسی اور شے کو دیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشرافیہ کا ماحول شاعری کے لئے سازگار ہے۔ جب دنیا میں مافوق الفطرت ہستیاں موجود ہوں۔ اور جن تک شعور کے ذریعہ نہیں بلکہ خیال اور تصوّر کے ذریعہ رسائی ممکن ہو۔ تو انسانی فکر و تخیل بھی آزادی سے کام کرتا ہے۔ اور شاعر جو اپنے ارد گرد بے شمار اشیاء کو موضوعِ فکر بنا سکتا ہے۔ ہزارہا لوگوں کی توجہات اپنی طرف مبذول کرا سکتا ہے۔

جمہوری ملکوں میں لبا اوقات لوگ مذہب اور عقیدہ کے معاملہ میں بھی زیادہ استقامت نہیں دکھاتے۔ قوانین کی طرح ان کے مذاہب اور عقیدے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ایسے ماحول میں شک و شبہ کا عنصر شاعر کی قوّتِ تخیلہ کو زمین پر رہنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ صرف ظاہر اور باہر اشیاء تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور بالفرض اگر مساوات کا تصوّر مذہب کو متاثر نہ بھی کرے تو وہ شاعری اور اظہار کو سادگی کی طرف مائل کرتا ہے اور ثانوی باتوں کی طرف سے شاعر کی توجہ ہٹا کر اسے سب سے "بر تر طاقت" کی طرف مبذول کراتا ہے۔

اشرافیہ میں انسانی ذہن فطری طور پر ماضی کی عظمت کی طرف لوٹتا ہے ــــ اس کے برعکس جمہوریت، ماضی اور قدیم اشیاء سے ایک جبلی نفرت پیدا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے اشرافیہ کا ماحول شاعری کے لئے زیادہ سازگار ہے۔

شاعری سے جب ماضی چھین لیا جاتا ہے تو اس کے بعد مساوات کا تصوّر "حال" کے بھی بعض حصّوں سے محروم کر دیتا ہے۔ اشرافی اقوام میں ہمیشہ ایک مخصوص طبقہ ایسے لوگوں کا ہوتا ہے جن کی حالت عام انسانوں سے ہمیشہ بلند و بالا ہوتی ہے۔ اور اس طبقہ میں دولت طاقت، شہرت، دانش، شائستگی، ہوتی ہے۔ عوام انہیں قریب سے کہیں نہیں دیکھتے اور نہ ہی ان کا تفصیلی مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اور اس قسم کے لوگوں کے بارے میں بیان آرائی کو شاعرانہ بنانے کے لئے اور کسی چیز کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسی اشرافی اقوام میں ایسے طبقات بھی ہوتے ہیں جو بے حد جاہل، اَن پڑھ ہوتے ہیں۔ ایسے طبقات بھی اپنی تباہ حالی کی بناء پر شاعری کے لئے غیر اہم موضوع نہیں ہوتے۔ علاوہ ازیں اشرافیہ کے معاشرہ کے مختلف طبقات ایک دوسرے سے بالکلیہ علٰحدہ ہوتے ہیں اور ان میں باہمی ربط نہیں ہوتا ہے۔ اور اس لئے جب ان کے بارے میں شاعری میں موضوع بحث بنایا جاتا ہے تو عام طور پر اس میں مبالغہ آرائی شامل ہو جاتی ہے۔

جمہوری ملکوں میں جہاں لوگ ایک دوسرے کے ہم مرتبہ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی معاشری اور معاشی حالت مساوی ہوتی ہے ہر شخص ایک دوسرے کو آسانی سے دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے جمہوری دور کا شاعر کسی دوسرے شخص کو موضوع شعر نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ اس موضوع کے لئے اس شخص کی کوئی خاص اہمیت ہی نہیں رہتی۔ اور چونکہ اس کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے اس لئے وہ مثالی شخصیت کے طور پر پیش کئے جانے کے قابل نہیں رہتا۔

لہذا یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ مساوات کے تصور نے دنیا سے شاعری کے قدیم سرچشمہ کو خشک کر دیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مساوات نے آیا کوئی نئے سرچشمے معلوم کئے ہیں۔

جہاں تشکک نے عالم ماوراء سے انسان کی توجہ ہٹا دی ہو۔ اور جب مساوات نے ہر فرد کو یکساں اور غیر اہم حالت پر پہنچا دیا ہو تو شاعر جو اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ وہ انسانی دور کے مدہم تصورات کی جگہ کس چیز کو دیں اپنی توجہ بے جان خطرات کی طرف مبذول کرتا ہے۔ دیوتاؤں اور سورماؤں کی بجائے شاعر چشموں مرغزاروں اور پہاڑوں کو اپنا موضوعِ سخن بناتا ہے۔ چنانچہ اس طرح پچھلی صدی میں اس شاعری کا آغاز ہوا ہے جسے ہم "بیانیہ" شاعری کہتے ہیں۔ بعض مفکرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس نوع کی شاعری جس میں فطرت کے بے جان مظاہر کی ترجمانی کی گئی ہے جمہوری دور کی مخصوص شاعری ہے۔ لیکن میری رائے میں یہ تصور درست نہیں ہے میرا خیال ہے کہ یہ کیفیت عبوری ہے۔

جمہوریت بالآخر انسانوں کی توجہ ان تمام چیزوں سے ہٹا دیتی ہے جو خارجی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اور صرف انسان کی ذات ہی پر مبذول کرتی ہے۔ جمہوری اقوام ایک مختصر مدت کے لیئے ممکن ہے کہ اپنے آپ کو مظاہرِ قدرت سے لطف

اندوز کریں۔ لیکن انہیں حقیقی لطف اپنے ہی حالات کا جائزہ لینے سے آتا ہے۔ اور اس قسم کی قوتوں میں شاعری کا حقیقی سرچشمہ نہیں ملے گا۔ جو شاعر انسان کی ذات سے باہر اپنی فکر و تخیل کی جولاں گاہ تلاش کرے گا۔ وہ عوام کے اذہان پر حکمرانی نہ کر سکے گا۔

میں نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ جمہوری ملکوں میں انسان کی ترقی اور انسان کی غیر محدود قابلیت کا تصور کس حد تک کارفرما رہتا ہے۔ جمہوری اقوام اس بات کی پروا نہیں کرتیں کہ ماضی کیا تھا اور کیا تھا۔ ان کے لئے مستقبل سب کچھ ہے اور مستقبل ہی کا خیال ان کی ساری زندگی میں جاری و ساری رہتا ہے۔ اور اس سمت میں ان کی فکر و تخیل کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ اور ایسی بنا پر میرا ادعا یہ ہے کہ اس میدان میں شاعروں کے لئے وسیع میدان کھلے ہوئے ہیں۔ جمہوریت نے جہاں شاعروں پر ماضی کے دروازے بند کر دیئے ہیں وہیں غیر محدود مستقبل کو ان کے لئے کھول دیا ہے۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ امریکہ میں کوئی شاعر نہیں ہے۔ لیکن امریکہ میں شاعرانہ تصورات کی کمی نہیں ہے۔ یورپ میں لوگ امریکہ کے جنگلوں اور بیابانوں کی باتیں کرتے ہیں لیکن خود امریکہ میں لوگ ان کا خیال ذہن تک بھی نہیں لاتے۔ قدرت کے عظیم مظاہر اور عجائب کا انہیں شعور تک نہیں ہے۔ اور وہ اپنے اردگرد کے گھنے جنگلوں کا تصور اس وقت تک ذہن میں نہیں لاتے جب تک کہ انہیں وہ زیر نہیں کر لیتے۔ ان کی آنکھیں کسی اور منزل پر جمی رہتی ہیں۔ امریکی عوام ذہنی طور پر ان جنگلوں اور بیابانوں میں صرف اپنی ہی پیش قدمی کو دیکھتے ہیں —— اور عالم خیال میں وہ دلدلوں کو خشک کرتے ہیں، دریاؤں کا رُخ بدل دیتے ہیں اور دُور دراز علاقوں میں بستیاں قائم کرتے ہیں۔ اور فطرت کی تسخیر کرتے ہیں۔

اشرافی دَور میں ہر قوم، ہر فرد یکہ و تنہا اور ایک دوسرے سے علیحدہ رہتا ہے

جمہوری ملکوں میں غیر معمولی باہمی ارتباط، اثر پذیری اور ان کی خواہشات میں بے صبری، لوگوں کو ہمیشہ حرکت میں رکھتی ہے۔ اس طرح مختلف ملکوں کے لوگ آپس میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے عادات اور خیالات قبول کرتے ہیں افراد اور معاشرے ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہیں اور اس طرح انسانیت کے اتحاد کا ایک عظیم مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے۔ اور یہ تمام باتیں مجموعی طور پر شاعری کے لئے ایک عظیم خزانے کا کام دیتی ہیں۔

اشرافی دور کا شاعر انتہائی کامیابی کے ساتھ زندگی، قوم یا کسی فرد کے کسی خاص حادثہ یا واقع کی بہترین عکاسی کرے۔ لیکن ان میں سے کوئی شاعر انسانیت اور تقدیر انسانی کو اپنا موضوع کلام بنانے کی جرأت تک نہیں کر سکتا ہے —— اور جمہوری دور کے شاعر کے لئے یہ بات عین ممکن ہے۔

اور اس کے ساتھ ساتھ انسان جب اپنے قبیلے یا ملک کی سرحدوں سے بلند ہو کر ساری انسانیت پر نظر ڈالتا ہے تو وہ اپنے پروردگار کی عظمت کا ایک نئے انداز میں نظارہ کر سکتا ہے جمہوری ملکوں میں اگر کسی ایک مخصوص مذہب یا عقیدے میں لوگوں کا ایمان متزلزل ہو تو بھی انسان اپنے خالق کو ایک وسیع تر تصور کے تحت دیکھتا ہے۔ نسل انسانی کو ایک وحدت کے طور پر دیکھنے کی بنا پر ہر فرد اس بات کا اندازہ کر لیتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی تقدیر کے تابع ہیں۔ اور ہر فرد کا عمل و عمل ایک غیر فانی اور آفاقی منصوبہ کے تحت ہے۔ جس کے تحت خدائے تعالیٰ نسل انسانی پر حکومت کرتا ہے۔ اور یہ امر بھی شاعری کا ایک عظیم اور نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے۔

جمہوری دور کا شاعر انسانوں اور ان کے کارناموں کو اپنا موضوع سخن بنانے کی بجائے تصورات اور جذبات کی عکاسی کرے گا جمہوری ملکوں میں لوگوں کی زبان، لباس اور ان کے روزمرہ کام ایک مثالی شخصیت کی تصویر پیش کرنے کیلئے

نوزدل نہیں ہوا کرتے ہیں۔ اور یہ باتیں بجائے خود شاعرانہ نہیں ہوتیں۔ چنانچہ معاشرہ کی یہ حالت شاعر کو مجبور کرتی ہے کہ وہ بیرونی سطح کی تہ میں پہنچنے کی کوشش کرے اور انسان کی روح کا مطالعہ کرے۔ انسان کی اپنی ذات اور اس کے اندرونی جذبات اور احساسات سے بڑھ کر اور کوئی شاعری کا خزانہ نہیں ہے۔

اگر انسان خود اپنے آپ سے مکمّل طور پر لاعلم ہو تو وہ شاعری کا حامل ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو بات اس کے احاطہ تصور میں نہیں آ سکتی وہ بیاں بھی نہیں کی جا سکتی اگر آدمی اپنی فطرت کو واضح طور پر پہچاننے کے قابل ہوتا تو اس میں قوّتِ متخیّلہ ہی نہ رہتی۔ اور وہ اپنی تصویر میں کسی چیز کا اضافہ نہ کر سکتا۔ لیکن انسان کی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ بعض باتیں اس حد تک منکشف ہیں کہ وہ اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ سمجھ لیتا ہے۔ اور بعض باتیں اس قدر غیر معلوم اور پردہ راز میں ہیں کہ انسان تاریکی میں چھپا تک لگاتا ہے اور اپنے بارے میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ تاکہ اپنے وجود کا اس کو زیادہ سے زیادہ علم ہو سکے۔

جمہوری ملکوں میں شاعری کو قدیم کہانیوں اور روایات سے غذا نہیں ملے گی۔ شاعر دنیا کو مافوق الفطرت ہستیوں سے آباد کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اور نہ ہی وہ برائیوں اور بدلیوں کی نقاشی کرے گا۔ یہ نام نہاد "خزانے" اس کے لیئے بے کار ہوں گے۔ لیکن خود انسان کی ذات موجود ہو گی —— اور شاعر کو اس سے زیادہ کسی اور شے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۴- امریکی ادیبوں اور مقررین کا اسلوب

میں نے اکثر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ امریکی، جو عام طور پر کاروباری امور میں، انتہائی واضح اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں۔ جب شاعرانہ زبان استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ثقیل الفاظ استعمال کرنے لگتے ہیں اور عبارت آرائی اور مبالغہ آمیزی میں دوسری انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔ اگر ان امریکیوں کو اس وقت سننے کا موقع ملے تو یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ انھوں نے کبھی سادہ زبان استعمال ہی نہیں کی۔ انگریز شاید و باید ہی اس قسم کی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ معلوم کرنا چنداں مشکل نہیں ہے۔ جمہوری معاشروں میں ہر شخص عادتاً اپنی ہی دنیا میں مگن رہتا ہے اور اس کے تخیل و فکر کا موضوع بھی عام طور پر خود اپنی ہی ذات ہوتی ہے اور اگر کبھی اس کی نگاہ اوپر اٹھتی ہے تو اس کے سامنے پورے کا پورا معاشرہ ہوتا ہے۔ نتیجۃً اس کے تصورات یا تو انتہائی واضح ہوتے ہیں یا بالکلیہ عام اور مبہم اور دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک خلا ہوتا ہے۔ جب وہ کبھی اپنی ذات کے دائرہ سے باہر آنے پر مجبور ہوتا ہے۔ تو اس بات کا متوقع رہتا ہے کہ اس کی توجہ میں کوئی حیرت انگیز اشیاء آئیں گی۔ اور وہ صرف اسی شرط پر اپنی ذات اور زندگی سے باہر آنے پر آمادہ ہوتا ہے۔

میرے خیال میں یہی وجہ ہے کہ جمہوری ملکوں کے لوگ، جن کے اپنے مسائل اور معاملات معمولی ہوتے ہیں، اپنے شاعروں سے زیادہ وسیع تصورات اور غیر محدود قوتِ بیان کی توقع رکھتے ہیں۔

شاعر اور ادیب، اس رجحان کا اتباع کیئے بغیر نہیں رہ سکتے اور وہ ہمیشہ اپنے خیالات اور تصورات کو ثقیل الفاظ میں مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اس طرح لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ اور اس کوشش میں انھیں نا امیدی نہیں ہوتی۔ اس لیئے کہ خود عوام کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ شاعری میں غیر محدود اور وسیع اشیاء پیش کی جائیں۔ اس طرح مصنّف اور عوام دراصل دونوں ایک دوسرے کے جذبات کی تسکین کرتے ہیں۔

جمہوری قوموں میں یہ بات بھی مشاہدہ میں آتی ہے کہ شاعری کے خزانے عظیم ہیں لیکن زیادہ نہیں۔ یہ خزانے جلد ختم ہو جاتے ہیں اور شاعر، حقیقی اور ظاہر باتوں میں مثالی شئے کے عناصر نہ پاکر، ان خزانوں کو ترک ہی کر دیتے ہیں اور اپنے قوّتِ متخیلہ سے بڑے بڑے بھوت پیدا کرتے ہیں۔ مجھے اس بات کا خدشہ نہیں ہے کہ جمہوری قوموں کی شاعری بے مزہ ہوگی اور اس کی اڑان ہمیشہ زمین ہی کی قریب رہے گی۔ ڈر یہ ہے کہ جمہوری ملکوں کے شاعروں کی تخلیقات بے پناہ اور غیر متواتر اور غیر متوازن قیاس آرائی پر مشتمل ہوں گی۔ جس میں مبالغہ آرائی اور عجیب غریب باتیں ہوں گی اور کہیں اس کے ذہن کی پیدا کردہ مبالغہ آرائیاں بعض اوقات تمھیں اس دنیائے رنگ و بو سے نفرت نہ پیدا کر دیں۔

۲۵۔ جمہوری دَور کے مورخین

اشرافی دَور کے مورخین اس بات کے عادی ہوتے ہیں کہ وہ تمام واقعات کو چند افراد کے نقطہ نظر سے دیکھیں اور سارے حالات کا مطالعہ ان افراد کے کردار اور مرضی کے مطابق کریں۔ وہ بڑے سے بڑے انقلابات کو معمولی حادثے قرار دیتے ہیں۔ معمولی وجوہات کی انتہائی سنجیدگی کے ساتھ چھان بین کرتے ہیں اور اہم باتوں کو عام طور پر چھوڑ ہی دیتے ہیں۔

جمہوری دَور کے مورخین کی خصوصیات اس سے بالکل مختلف ہوتی ہیں۔ ان میں اکثر کسی خاص فرد سے نسل انسانی پر کسی اثر کو منسوب نہیں کرتے۔ اس کے برعکس وہ معمولی معمولی واقعات کے پیچھے بڑی بڑی وجوہات تلاش کرتے ہیں۔ ان متضاد رجحانات کی وجوہات بھی ہیں۔

اشرافی دَور کا مورخ جب بزم گاہِ عالم پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی نظر صرف ان چند اداکاروں پر پڑتی ہے۔ جو اس کھیل میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں اور جو سارے کھیل کا اہتمام کر رہے ہیں۔ تمام بڑی شخصیتیں، جو سٹیج پر پیش پیش ہیں، اس کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں اور جوں ہی مورخ ان خفیہ محرکات کو تلاش کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے جن کے تحت اس کے کردار اداکاری کرتے ہیں اور مکالمے ادا کرتے ہیں تو اس کے حافظے سے باقی تمام باتیں محو ہو جاتی ہیں۔ چند لوگ جو کام انجام دیتے ہیں ان کی اہمیت مورخ کے ذہن پر ان لوگوں کے اثر کا مبالغہ آمیز تاثر مرتب کرتی ہے۔ اور فطری طور پر وہ سوچنے لگتا ہے کہ لوگوں کے جذبات کی وضاحت کرنے کے

سیلئے یہ ضروری ہے کہ ان کا مطالعہ اس ایک فرد کے اثر کے تحت کیا جائے۔

اس کے برعکس جمہوری ملکوں میں ہر فرد آزاد ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر ہر شخص کمزور ہوتا ہے اور کوئی شخص انفرادی طور پر نہ تو معاشرہ پر اثر ڈال سکتا ہے اور نہ معاشرہ کی طاقت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ بنظرِ ظاہر فرد کسی بھی اثر ڈالنے کی صلاحیت سے عاری نظر آتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ تمام لوگوں کے مجموعی عمل کی بنا پر آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ صورتِ حال مؤرخ کے ذہن کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ ان عام عوامل کو تلاش کرے جو معاشرہ کے تمام لوگوں پر بہ یک وقت اثر ڈال رہے ہیں۔

میری یہ حتمی رائے ہے کہ جمہوری اقوام میں بھی چند افراد ہی کی ذہانت، نیکیاں یا برائیاں قوم کی تاریخ کے فطری بہاؤ میں تیزی یا رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ مگر اس قسم کی ثانوی اور اتفاقی نوعیت کے عوامل اس قدر زیادہ، پوشیدہ، پیچیدہ، کم طاقتور ہوتے ہیں کہ ان کی چھان بین جمہوری دور میں تقریباً ناممکن ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اشرافی دور میں مؤرخ کا کام صرف یہی ہوتا ہے کہ عام واقعات اور حالات کے انبوہ میں صرف اس خاص اثر کو معلوم کرے جو کسی ایک خاص فرد یا گروہ کا بحیثیت مجموعی عوام پر ہوتا ہے۔ جمہوری دور کا مؤرخ اگر جزئیات میں جانے کی کوشش کرے تو وہ بہت جلد تھک جائے گا اور اس کا ذہن اس بھول بھلیاں میں گم ہو کر رہ جائے گا۔ اور جب وہ کسی فرد یا افراد کے اثر کو معلوم کرنے میں اپنی مجبوری کی بنا پر اس بات ہی سے انکار کر دے گا کہ کسی فرد کا کوئی اثر بھی ہو سکتا ہے تو وہ کسی نسل یا قوم کی عام خصوصیات گنوائے گا۔ ملک کے طبعی حالات کا ذکر کرے گا۔ اور اپنی تہذیب کی ذہانت کی باتیں کرے گا۔ یہ باتیں نہ صرف اس کی محنت کو مختصر کر دیں گی بلکہ اس طرح وہ انتہائی کم محنت اور کم لاگت پر اپنے قاری

کو مطمئن کرے گا۔

جہاں تک میری ذاتی رائے کا تعلق ہے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ دنیا کے طول و عرض میں جو واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں ان میں اکثر... عام حقائق سے منسوب کیے جا سکتے ہیں اور بعض چند خاص اثرات کے ماتحت ہوتے ہیں۔ یہ دونوں قسم کے وجوہ ہمیشہ کارفرما رہتے ہیں۔ ان کے امتزاج میں تغیر و تبدل آتا رہتا ہے۔ جمہوری ادوار میں عام واقعات میں زیادہ رونما ہوتے ہیں اور اشرافی دور میں خاص اثرات طاقتور ہوتے ہیں۔

جمہوری دَور کے مؤرخین اگر تمام واقعات کا مطالعہ عام حقائق کے پیش نظر کریں تو وہ حق بجانب ہیں۔ لیکن وہ افراد کے اثر سے انکار کرتے ہیں غلطی پر ہیں اس لیئے کہ وہ افراد کے اثر کو آسانی سے پہچان نہیں سکتے اور نہ تجزیہ کر سکتے ہیں۔

جمہوری ملکوں کے مؤرخ نہ صرف ہر واقعہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی بڑی وجہ منسوب کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ بلکہ اس قسم کے متعدد واقعات میں ایک ربط اور تسلسل پیدا کر کے ایک نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ اشرافی دَور میں مؤرخ کی نگاہ افراد پر جمی رہتی ہے۔ اور واقعات میں ربط پیدا نہیں کرتا۔ یا ایسے تعلق میں یقین ہی نہیں رکھتا۔ ان کے نقطہ نظر سے تاریخ ایک ایسی ڈور کے مانند ہے جسے انسان کے قدم ہر لمحہ روندتے اور توڑتے رہتے ہیں۔ جمہوری دور میں مؤرخ کی نگاہ اداکار سے زیادہ اداکاری اور عمل پر ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اداکاری کے درمیان ایک ربط اور ایک خاص نظم قائم کر لیتا ہے۔

قدیم ادب میں، جو لاجواب تاریخی مواد سے مالا مال ہے، کوئی بڑا تاریخی نظام نہیں ملے گا۔ مگر جدید ادب کے معمولی سے معمولی نمونوں میں ایسے یہ تمام نظام ملیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قدیم کے مؤرخین ان عام نظریات سے زیادہ فائدہ نہ

اٹھا سکے جنھیں ہمارے دور کے مؤرخین زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں۔

جمہوری دَور کے مورخین ایک اور خطرناک رجحان میں مبتلا رہتے ہیں۔ جب فرد کے عمل کا قوم پر جو اثر مرتب ہوتا ہے اس کی چھان بین نہ بھی ہو سکے تو دنیا ترقی کی راہ پر گام زن رہتی ہے لیکن جو شے حرکت میں رکھتی ہے وہ ناقابلِ شناخت رہتی ہے اور جب یہ بات تشنۂ تحقیق رہتی ہے کہ وہ کونسا اثر اور کس کا اثر ہے جو قوم کو حرکت میں رکھتا ہے تو یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ قوم کی حرکت اور اس کا عمل غیر رضاکارانہ ہے۔ اور یہ کہ معاشرے غیر شعوری طور پر کسی برتر قوت کی اطاعت کرتے ہیں۔ لیکن جب اس "عام حقیقت" کو دریافت کر لیا جاتا ہے جو لوگوں کی قوتِ ارادی اور عمل پر حکمران ہے تو اس سے آزاد انسانی مرضی اور عمل کے اصول پر ضرب پڑتی ہے۔ کیونکہ جب یہ بات یقینی تصوّر کر لی جائے کہ ایک ایسا سبب معلوم کر لیا گیا ہے کہ جو لاکھوں کروڑوں لوگوں پر اثر انداز ہے اس قدر طاقتور ہے کہ سب کو ایک ہی راہ پر چلا سکتا ہے۔ تو اس کا امکان ہے کہ اس کو ناقابلِ مزاحمت تصوّر کر لیا جائے۔

اس طرح جمہوری دَور کے مؤرخین نہ صرف ایسے چند لوگوں کے اثر سے انکار کرتے ہیں جو وہ قوموں اور ملکوں کی قسمت پر ڈال سکتے ہیں۔ بلکہ وہ لوگوں کو ان کی طاقت ہی سے محروم کر دیتے ہیں۔ جس سے وہ اپنے احوال کی اصلاح کر سکیں اور عوام کو کسی غیر لچکدار برتر طاقت یا کسی اندھی ضرورت کے تابع کر دیتے ہیں۔ ان کے تصوّر کے مطابق ہر قوم اپنے جائے وقوع۔ جائے پیدائش۔ اپنے اسلاف اور اپنے کردار سے اس طرح جکڑی ہوئی ہے کہ کوئی کوشش اس میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ اپنے اس طرزِ استدلال اور نظریہ کا اطلاق ساری

نسلوں پر کرتے ہیں اور ماضی کے ہر دور کا اس طرح مطالعہ کرتے ہوئے ان میں ایک باہمی ربط پیدا کرتے ہیں اور تصوّر کرتے ہیں کہ اس زنجیر میں ساری انسانیت بندھی ہوئی ہے۔ ان کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ کوئی خاص واقعہ رونما ہوا ہے بلکہ وہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس سے کوئی مختلف واقعہ رونما ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تاریخ کی کسی خاص منزل پر کسی خاص بات کا مطالعہ کریں گے اور یہ حکم صادر کر دیں گے کہ جس راہ پر وہ قوم چل رہی تھی وہ سوائے اس مقام کے کسی اور جگہ نہیں لے جا سکتا تھا۔

اشرافی دَور کے اور خاص طور پر زمانۂ قدیم کے مؤرخین کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص کو اپنے ہم جنسوں پر حکمرانی کا اہل ہونے کے لیے اور ان پر آقائی کرنے کے لیے ایک خاص قابلیت کا حامل ہونا پڑتا ہے اور اپنے آپ پر قابو پانا پڑتا ہے۔ اور موجودہ دَور کی تاریخوں کا مطالعہ یہ ثابت کرے گا کہ انسان بے حقیقت ہے۔ نہ تو وہ اپنی ذات پر قابو رکھ سکتا ہے اور نہ اپنے گرد و پیش کے ماحول پر۔ قدیم مؤرخوں نے انسان کو حکمرانی کے گُر سکھائے۔ اور ہمارے مورخ اطاعت کے گُر سکھاتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں مصنف تو بڑا دکھائی دیتا ہے لیکن انسانیت کم تر حقیقت کی معلوم ہوتی ہے۔

جزو دوم

جمہوریت کا اثر امریکی عوام کے احساسات پر

۲۶۔ جمہوری اقوام مساوات کو آزادی پر کیوں ترجیح دیتی ہیں؟

مساوات کی حالت لوگوں میں شدّت سے جو چیز پیدا کرتی ہے وہ مساوات ہی سے محبت ہے۔ اور اسی لیے میں سب سے پہلے اسی احساس پر بحث کروں گا۔

ہر شخص یہ کہتا ہوا سنائی دے گا کہ ہمارے اس دور میں مساوات کا جذبہ عام ہو رہا ہے۔ اور لوگ یہ کہتے ہوئے نظر آئیں گے کہ ہمارے معاصرین آزادی کے بہ نسبت مساوات سے زیادہ جذباتی طور پر وابستہ ہیں۔ لیکن ان کے عوامل اور اسباب کا تجزیہ کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے۔

ایک ایسے انتہائی نکتہ کا تصوّر کیا جا سکتا ہے جہاں آزادی اور مساوات مل کر ایک دوسرے میں مدغم ہو سکتے ہیں۔ یہ فرض کر لیجیے کہ ملک کے تمام لوگ کاروبارِ حکومت میں حصّہ لیتے ہیں۔ اور ہر شخص کو امورِ مملکت میں حصّہ لینے کا مساوی حق ہے۔ چونکہ کوئی شخص دوسرے سے مختلف نہیں ہے۔ اس لیے کوئی شخص مستبدانہ اختیارات استعمال نہیں کر سکتا۔ انسان بالکلیہ آزاد ہوں گے۔ کیونکہ وہ سب مساوی مرتبہ کے ہیں اور یہ مکمل طور پر مساوی ہوں گے۔ اس لیے کہ وہ مکمل طور پر آزاد ہیں۔ جمہوری اقوام اس مقصد کی طرف جانے کی کوشش کرتی ہیں اور یہی وہ ایک شکل ہے جو مساوات اس دنیا میں حاصل کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کئی اور اشکال ہیں جو ناقص ہونے کے باوجود، ان قوموں کو اس قدر زیادہ عزیز ہیں۔

مثال کے طور پر، مساوات کے اصول کو سیاسی دنیا میں رائج کئے بغیر معاشری دنیا میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ یکساں قسم کی تفریحات میں حصہ لینے، ہر قسم کے شعبوں میں داخل ہونے اور ایک ہی قسم کی کلبوں میں جانے، بالفاظ دیگر دولت کو یکساں قسم کے ذرائع سے حاصل کرنے میں مکمل مساوی حقوق ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ کاروبار حکومت میں تمام لوگ مساویانہ حصہ نہ لیں یا سیاسی دنیا میں بھی سیاسی آزادی کے بغیر ایک خاص قسم کی مساوات قائم کی جا سکتی ہے۔ ایک آدمی اپنے تمام ہم وطنوں کے مساوی المرتبہ ہو سکتا ہے۔ سوائے ایک جزد کے جو بلا امتیاز سب کا آقا ہو۔ اور جو باقی لوگوں میں سے مساوی طور پر اپنی حکومت کے کارندے انتخاب کرے۔ غرض اس قسم کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اگرچہ انسان بالکلیہ۔۔ آپس میں مساوات قائم نہیں کریں گے۔ جب تک کہ وہ مکمل آزاد نہ ہوں اور نتیجتہً اگر مساوات کو اس کی منطقی انتہا تک پہنچایا جائے تو وہ آزادی میں مدغم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں میں ایک خط فاصل موجود ہے اور دونوں میں اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ آزادی کا ذوق اور مساوات کی خواہش دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ جمہوری اقوام میں یہ دونوں غیر مساوی اشیا ہیں۔

تاریخ کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ہر دور میں ایک مخصوص غالب حقیقت کی حکمرانی ہوتی ہے۔ جس سے تمام دوسری باتیں منسلک ہوتی ہیں اور یہ حقیقت چند ایسے تصورات یا جذبات کو پیدا کرتی ہے۔ جو اپنی رو میں اپنے زمانے کے سارے افکار اور خیالات کو بہائے جاتے ہیں۔

آزادی، دنیا کے ہر دور میں اور ہر ملک میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ کسی خاص سماجی حالات کا نتیجہ نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ جمہوریتوں تک ہی محدود ہے۔ اس لیے آزادی

جمہوری ملکوں کی ہی نمایاں خصوصیت نہیں ہے ۔ لیکن جمہوری ملکوں کی مخصوص اور غالب حقیقت مساوات ہے ۔ ان ملکوں میں لوگوں کی سب سے بڑی کشش مساوات میں ہوتی ہے ۔ یہ سوال الگ ہے کہ جمہوری ملکوں کے عوام کے لیے مساوات میں اس قدر کشش کیوں ہوتی ہے ؟

کوئی جمہوری قوم کبھی مساوات کو تباہ کرنے یا کم کرنے میں صرف اسی صورت میں کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ وہ ایک طویل عرصہ تک اس کے لیئے محنت کرے اس کے لیے سماجی حالات کو بدلنا پڑے گا ۔ اپنے قوانین کو ختم کرنا ہو گا ۔ اپنے افکار اور آرا کو دبانا پڑے گا ۔ عادات کو بدلنا ہو گا ۔ مگر سیاسی آزادی آسانی سے انسان کے ہاتھ سے نکل جا سکتی ہے ۔ اگر سیاسی آزادی کی حفاظت میں ذراسی غفلت برتی گئی تو وہ پھر چلی ہی جاتی ہے ۔ اس لیئے لوگ مساوات سے زیادہ وابستہ رہتے ہیں ۔ اس لیئے نہیں کہ وہ انھیں عزیز ہے ، بلکہ اس لیئے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ پائدار ہے ۔

معمولی ذہن و دماغ کا شخص بھی آسانی سے یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ انتہائی صورتوں میں سیاسی آزادی میں امن اور سکون ، جائداد اور افراد کے جان و مال کی قربانی بھی دینا گوارا کرے گی ۔ لیکن صرف صاحبِ بصیرت لوگ ہی ان نقصانات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو مساوات کی وجہ سے معاشرہ اور قوم کو طویل المیعاد نقطۂ نظر سے برداشت کرنا پڑتے ہیں ۔ اور یہ لوگ بھی ان احکامات کی طرف نشاندہی کرنے سے احتراز کرتے ہیں ۔ اس لیئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اس کے نقصانات ایک زمانۂ دراز کے بعد ظاہر ہوں گے اور اپنے آپ کو تسلی دے لیتے ہیں کہ اس کا اثر مستقبل بعید میں آئندہ نسلوں پر پڑے گا ۔

آزادی کے فوائد ایک زمانۂ دراز کے بعد ظاہر ہوتے ہیں ۔ مساوات کے فائدے

فوراً نظر آتے ہیں۔ سیاسی آزادی صرف چند لوگوں کو وقتاً فوقتاً اعلیٰ مناصب اور رتبے عطا کرتی ہے۔ لیکن مساوات کی خوشیاں ہر جگہ اور ہر شخص کو محسوس ہوتی ہیں جب کہ انہیں اس کے حصول کے لیے بے شمار قربانیاں دینی پڑیں۔ لیکن مساوات کے لیے ایسی قربانیوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

جمہوری اقوام ہمیشہ ہی مساوات کی دلدادہ رہی ہیں۔ لیکن مساوات سے ان کی یہ وابستگی اور محبت میں شدت بعض اوقات جنون کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ ایک پرانے سماجی نظام کو ایک زبردست کشمکش کے بعد پارہ پارہ کردیا جاتا ہے اور جاہ اور مرتبہ کی حدیں اور امتیازات بے دردی سے ڈھادی جاتی ہیں۔ اس دور میں انسان "مساوات" پر مالِ غنیمت کی طرح لپکتے ہیں اور اس کو اپنے گلے سے اس طرح چمٹائے رہتے ہیں۔ جیسے کہ وہ کوئی انتہائی عزیز شے ہو۔ اور وہ اس اندھی محبت سے کبھی دست بردار ہونے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

یہ بات جمہوری قوموں پر صادق آتی ہے۔ جمہوری معاشرے آزادی کا فطری مذاق رکھتے ہیں۔ لیکن مساوات سے انھیں والہانہ وارفتگی ہوتی ہے۔ ان کی خواہش غیر محدود، ناقابلِ تسکین اور ناقابلِ تسخیر ہوتی ہے۔ وہ افلاس، محکومی اور بربریت کو پسند کریں گے۔ لیکن اشرافیہ کو برداشت نہیں کریں گے۔

۲۷۔ جمہوری ملکوں میں انفرادیت

میں نے اس سے پہلے یہ بتایا ہے کہ مساوات کے دَور میں کس طرح انسان اپنے بارے میں رائے خود اپنے طور پر تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب میں پھر اس کی وضاحت کروں گا۔ کہ اس دَور میں کس طرح انسان کے تمام احساسات کا مرکز اس کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ انفرادیت ایک انوکھا طریقۂ اظہار ہے۔ جیسے ایک انوکھا نظریہ پیدا ہوا ہے۔ ہمارے آباؤاجداد صرف "خودغرضی" کی اصطلاح سے آشنا تھے خودغرضی، محبت نفس کی ایک مبالغہ آمیز شکل ہے جو انسان کو ہر شے اپنی ہی ذات سے منسلک کرنے پر مجبور کرتی ہے اور انسان اپنے آپ کو دنیا کی ہر شے پر ترجیح دیتا ہے۔ انفرادیت ایک پختہ اور خاموش احساس کا نام ہے۔ جس کے تحت معاشرہ کا ہر ایک فرد اپنے آپ کو اپنے باقی ہم جنسوں سے الگ کرتا ہے اور اپنے دوستوں اور خاندان کا ایک الگ حلقہ پیدا کرتا ہے اور اس طرح اپنا ایک مخصوص حلقہ قائم کرنے کے بعد وہ سماج کو اپنے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ خودغرضی ایک اندھی جبلّت کی پیداوار ہے۔ انفرادیت بے راہ روی کے جذبات سے زیادہ فیصلہ کی غلطی سے پیدا ہوتی ہے۔

خودغرضی، نیکیوں کے تمام جراثیم کو کھا جاتی ہے۔ انفرادیت ابتدا" عوامی زندگی کا عرق نچوڑ لیتی ہے۔ لیکن طویل مدت میں وہ سب پر حملہ آور ہو کر تباہ کر دیتی ہے اور بالآخر خودغرضی میں ہی ختم" ہو جاتی ہے۔ خودغرضی ایک ایسی برائی ہے۔ جس کی عمر دنیا کی عمر ہی کے مساوی ہے۔ اور اس کا تعلق کسی خاص معاشرہ یا قوم سے

نہیں ہوتا۔ انفرادیت جمہوری حالت کی پیداوار ہے۔ اور اسی تناسب سے پھیلتی ہے جس تناسب سے کہ مساوات نشوونما پاتی ہے۔

اشرافی اقوام میں، چونکہ خاندان صدیوں تک ایک ہی حالت میں اور بسا اوقات ایک ہی جگہ رہتے ہیں۔ اس لیے تمام نسلیں تقریباً ہمعصروں کے مانند ہوتی ہیں۔ ہر شخص اپنے آباؤ اجداد سے آشنا رہتا ہے۔ وہ ان کا احترام کرتا ہے۔ وہ اپنی آیندہ نسلوں کا تصور بھی آسانی سے کر سکتا ہے اور نتیجۃً ان سے محبت کرتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے اپنے آپ، اپنے اسلاف اور اخلاف دونوں کے بارے میں فرائض عاید کر لیتا ہے۔ اور اپنے اسلاف اور آیندہ نسلوں کی خاطر اپنی شخصی راحتوں اور آسودگیوں کی قربانی دینے پر آمادہ رہتا ہے۔ اشرافی ادارے اپنے ملک کے شہریوں کو ایک دوسرے سے منسلک کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ اشرافی معاشرہ میں لوگ ایک دوسرے سے کسی نہ کسی طرح منسلک رہتے ہیں۔ کوئی کسی کی سرپرستی میں ہوتا تو کوئی کسی کا سرپرست۔ یہ درست ہے کہ ایسے دور میں انسانیت کا تصور مدہم ہوتا ہے۔ اور لوگ انسانیت کی خاطر قربانی دینے کے تصور سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات وہ دوسرے آدمیوں کی خاطر قربانی دیتے ہیں۔ جمہوری دور میں اس کے برعکس، چونکہ ہر فرد کے بنی نوع انسان کے بارے میں فرائض واضح ہوتے ہیں اس لیے کسی خاص شخص کی بے غرضانہ خدمت کرنے کا تصور پایا نہیں جاتا ہے۔ انسانی محبت کی بندھنیں وسیع تو کر دی جاتی ہیں۔ لیکن یہ بندھنیں ڈھیلی ہوتی ہیں۔

جمہوری اقوام میں ہر لمحہ نئے خاندان ابھرتے ہیں۔ دوسرے خاندان ختم ہو جاتے ہیں اور جو رہ جاتے ہیں وہ اپنے حالات بدل دیتے ہیں اور وقت کے تانے بانے ہمیشہ ٹوٹتے رہتے ہیں اور نسلوں کی راہیں مٹائی جاتی ہیں۔ جو لوگ رخصت ہو چکے ہیں وہ

جلد بھلا دیے جاتے ہیں۔ اور آنے والوں کا کسی کو خیال نہیں رہتا ہے۔ انسان کی دلچسپی اس کی ذات کے گرد و پیش کے لوگوں تک محدود رہتی ہے۔ جوں جوں ایک طبقہ دوسرے طبقہ کے قریب ہوتا جاتا ہے اور جوں جوں ایک دوسرے میں ضم ہوتا ہے۔ اس کے ارکان ایک دوسرے سے بے تعلق ہوتے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں۔ اشرافیہ معاشرہ کے ہر رکن کو بادشاہ سے لے کر کسان تک ایک زنجیر میں پروئے رکھتا ہے۔ جمہوریت وہ زنجیر توڑ دیتی اور اس کی ہر ایک کڑی کو علیحدہ کر دیتی ہے۔

سماجی حالات میں جوں جوں مساوات قائم ہوتی ہے۔ ویسے ہی ایسے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے۔ جو نہ تو زیادہ متمول ہوتے ہیں اور نہ ہی اس قدر طاقتور کہ اپنے ہم وطنوں پر کوئی خاص اثر ڈال سکیں۔ لیکن یہ لوگ اس قدر تعلیم اور دولت حاصل کرتے ہیں۔ جن سے ان کی اپنی ضروریات کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ وہ نہ تو کسی شخص سے کسی بات کی تمنا کرتے ہیں اور نہ ان سے کوئی شخص سلوک کی توقع کر سکتا۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو الگ اور تنہا دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں اور یہ تصور کرنے لگتے ہیں کہ ان کی ساری تقدیر خود ان کے ہاتھ میں ہے۔

اس طرح جمہوریت نہ صرف لوگوں کو ان کے ذہن سے آباؤ اجداد کو بھلا دیتی ہے بلکہ اخلاق کو بھی ان کی نظروں سے چھپاتی اور متاخرین کو ان سے جدا کر دیتی ہے۔ اور انسان کو ہمیشہ کے لیے تنہائی میں پھینک دیتی ہے۔ اور بالآخر اسے اس کے دل ہی کی دنیا میں مقید کر دیتی ہے۔

۲۸۔ انفرادیت اور آزاد ادارے

استبداد، جو اصل میں انتہائی بزدل ہوتا ہے، اپنے آپ کو اس وقت بے حد محفوظ تصور کرتا ہے۔ جب انسان ایک دوسرے سے جدا ہوں اور استبداد ہمیشہ اس بات کا کوشاں رہتا ہے کہ انسانوں میں اتحاد نہ ہونے پائے۔ انسانی برائیوں میں اس کے لیے سب سے زیادہ عزیز خود غرضی ہے۔ اگر رعایا ایک مستبد آقا سے محبت نہ کرے تو وہ انھیں آسانی سے معاف کر دے گا۔ بشرطیکہ لوگوں میں خود آپس میں محبت نہ ہو۔ وہ کبھی رعایا سے یہ خواہش نہ کرے گا کہ انتظامِ مملکت میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ اس کے لیے یہی کافی ہے کہ رعایا حکومت کرنے کی خواہش دل میں نہ لائے۔ مستبد حکمران ان لوگوں کو فسادی اور شرپسند قرار دے گا جو معاشرہ میں بہبود اور ترقی کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور ان لوگوں کو بہترین شہری کی حیثیت سے سراہے گا۔ جن کو اپنی ذات کے سوا کسی سے ہمدردی نہیں ہوتی۔

غرض یہ کہ استبداد جن برائیوں کو پیدا کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے وہ یہی برائیاں ہیں جنھیں مساوات پرورش کرتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں باہمی طور پر ایک دوسرے کی امداد اور تکمیل کرتی ہیں۔ مساوات لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ایک صف میں کھڑا کرتی ہے۔ لیکن ان میں کوئی باہمی رشتہ پیدا نہیں کرتی۔ استبداد ان کے درمیان دیواریں کھڑی کر دیتا ہے۔ مساوات افراد کو یہ سکھاتی ہے کہ وہ اپنے ہم جلیسوں کا خیال نہ کریں۔ اور استبداد عام بے تعلقی کو ایک نیکی کے طور پر پیش کرتا ہے۔

استبداد، جو ہر دور میں خطرناک ہوتا ہے۔ جمہوریت میں تو بے حد خوفناک ہو

جاتا ہے۔ جمہوریت ہی میں لوگوں کو آزادی کی بے حد ضرورت ہوتی ہے۔ جب کسی معاشرہ کے ارکان کے لیے سیاسی امور میں حصّہ لینا ضروری ہو جائے تو لازمی طور پر یہ لوگ وہی ہوں گے جن کے مفادات ایک ہوں گے اور جب انسان سرکاری امور کھلے طور پر انجام دیتا ہے تو وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ اس قدر آزادیٔ عمل کا حامل نہیں ہے۔ جیسا کہ اس نے تصوّر کر رکھا تھا اور لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے اسے ان کے ساتھ تعاون بھی کرنا پڑتا ہے۔

جب عوام حکومت کرتے ہیں تو ہر شخص عوام کی مرضی کی قدر و قیمت سے آگاہ ہوتا ہے۔ اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان لوگوں کی محبت اور احترام حاصل کرے۔ ایسی صورت میں ایسے مختلف جذبات جو انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھنے کی طرف مائل رہتے ہیں سطح کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ آزاد حکومتوں کے تحت، جہاں تقریباً سب ہی عہدے انتخابی ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جو ان عہدوں کے خواہشمند ہوتے ہیں ہمیشہ یہ خیال ذہن میں رکھتے ہیں کہ ان کی تمنائیں اس وقت تک بر نہیں آسکتیں جب تک لوگوں کی حمایت حاصل نہ ہو۔ ان حالات میں یہ لوگ اپنے ہی اغراض کی خاطر دوسرے لوگوں کی بہبود پر توجہ دیتے ہیں اور بعض اوقات وہ اپنے مفادات کو بھی فراموش کر دیتے ہیں۔

یہاں اعتراض کے طور پر انتخابی سازشیں، امیدواروں کی کمینگی اور مخالفین اور حریفوں کی الزام تراشیاں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس قسم کی دشمنی اور عناد کے مظاہرے اکثر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور انتخابات جس قدر زیادہ ہوں گے، مظاہرے بھی زیادہ ہوں گے۔ اگرچہ یہ برائیاں ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت عارضی ہے۔ مگر ان کے فوائد بے حد ہیں۔ منتخب ہونے کی خواہش ممکن ہے لوگوں میں متشددانہ عناد اور مخالفت کا مظاہرہ کرنے پر مجبور کرے۔ لیکن یہی خواہش انھیں دوسروں

سے تعاون پر اکساتی ہے۔ یہ ہوتا ہے کہ ایک انتخابی مہم دو گہرے دوستوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔ لیکن یہی انتخابات ہزاروں شہریوں کو ایک دوسرے کے مستقل دوست بنا دیتے جو بصورت دیگر ایک دوسرے کے لیے ہمیشہ اجنبی رہتے۔ آزادی نجی دشمنیاں پیدا کرتی ہے۔ لیکن استبداد عام بے تعلقی کو جنم دیتا ہے۔

امریکیوں نے ایسے آزاد اداروں کے ذریعہ لوگوں میں علیحدگی پیدا کرنے کے مساوات کے رجحان کا مقابلہ کیا ہے۔ اور انھوں نے اس طرح اس رجحان پر فتح پائی ہے۔ امریکہ کے قانون ساز نے جمہوری معاشرہ کے ڈھانچہ کو بدنظمی اور تباہی سے بچانے کے لیے صرف ساری قوم کی عام نمایندگی پر اکتفا نہیں کیا۔ انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ ملک کے ہر حصّہ میں اور ہر شعبہ میں سیاسی زندگی کو فروغ دیا جائے۔ تاکہ لوگوں کی مساعی میں اتحاد پیدا کرنے کے علاوہ انھیں اس بات کا ہر وقت اور ہمیشہ خیال رہے کہ وہ ایک دوسرے کے کس قدر محتاج ہیں۔ یہ منصوبہ انتہائی دانشمندانہ تھا۔ ملک کے عام حالات صرف چند سیاستدانوں کی توجہ میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ ایک خاص وقت کے لیے ایک خاص وقت جمع ہوتے ہیں۔ اور اس کے بعد جب بکھر جاتے ہیں تو ان میں کسی قسم کا باہمی ربط قائم نہیں رہتا۔ لیکن جب مقصود یہ ہو کہ کسی ایک خاص ضلع یا مقام کے مقامی معاملات وہاں کے رہنے والے خود نمٹائیں تو پھر یہ لوگ ہمیشہ آپس میں ربط رکھتے ہیں اور اس طرح ایک دوسرے سے شناسائی اور دوستی رکھنے پر مجبور رہتے ہیں۔

بسا اوقات کسی شخص کو اپنی علیحدہ دنیا سے نکال کر امور مملکت میں دلچسپی ظاہر کرنے پر مجبور کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ اس اثر کا اندازہ لگا سکے جو مملکت اس کے امور پر ڈالتی ہے لیکن جب اس کی زمین یا آبادی کے قریب ایک سڑک بنانے کی تجویز ہو تو وہ آسانی سے اس

سڑک کے فوائد کا اندازہ کر سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ وہ سڑک اس کی اپنی بہبود اور مجموعی آبادی کی بہبود پر کیا اثر ڈال سکتی ہے۔ اور وہ نجی اور عوامی مفاد کے باہمی تعلق کو پہچان لیتا ہے۔ کسی شخص کا ایک حیرت انگیز اور عظیم کارنامہ ممکن ہے کہ لوگوں کی توجہ یک دم اپنی طرف کھینچ لے۔ لیکن لوگوں کا احترام اور محبت حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک طویل عرصہ تک ان کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں خدمت کی جائے۔ ان کے ساتھ مہربانی اور ہمدردی کی جائے ان کے نجی امور میں دلچسپی لی جائے۔ مقامی آزادی لوگوں کو اپنے ہمسایوں کی محبت اور ہمدردی کی قدر کرنا سکھاتی ہے اور لوگوں میں آپس میں اتحاد پیدا کرتی ہے۔ اور ایک دوسرے کی مدد کرنے پر مجبور کرتی ہے۔

امریکہ میں زیادہ خوشحال لوگ اس بات کا بطور خاص خیال رکھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے علیحدہ نہ رہیں۔ اس کے برعکس وہ کم تر طبقوں سے ہمیشہ اچھے تعلقات قائم رکھتے ہیں۔ وہ ان کی باتیں سنتے ہیں اور ان سے ہر روز باتیں کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جمہوریت میں امیروں کو غریبوں کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کہ غریبوں کو مادی فائدے پہنچانے سے زیادہ اپنے رکھ رکھاؤ ہی کے ذریعہ بہتر طور پر رام کیا جا سکتا ہے۔ محض انعام واکرام سے غریبوں کی ہمدردی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس کے برعکس انعام و اکرام ان کے دلوں میں ایک پوشیدہ حقارت پیدا کرتے ہیں۔ لیکن حسن سلوک اور رکھ رکھاؤ کی سادگی ناقابل مزاحمت ہوتی ہے۔ عام طور پر امیر اس بات کی تہ کو نہیں پہنچے۔ جب تک جمہوری انقلاب جاری رہتا ہے وہ عام طور پر ابتدا میں اپنے آپ کو غریبوں سے دور ہی رکھتے ہیں۔ لیکن وہ غلطی پر ہوتے ہیں۔ لوگوں پر انعام واکرام کی بارش کر دیں تو بھی بے فائدہ ہوتا ہے جب تک کہ ان کے دل میں اپنے سلوک سے محبت کی گرمی نہ پیدا کی جائے۔ عام لوگ

ان سے روپیہ پیسہ کی قربانی کے طالب نہیں ہوتے بلکہ وہ فخر کی قربانی چاہتے ہیں۔
امریکہ میں ہر شخص اپنے علم اور واقفیت کو ایسے ذرائع معلوم کرنے کے لیے وقف کرتا ہے، جس سے لوگوں کی خوشی میں اضافہ ہوتا ہو۔ ہر ضلع میں جب کوئی شخص خاص بات معلوم کرتا ہے تو اسے اپنے ہم وطنوں تک ضرور پہنچاتا ہے امریکہ میں جو لوگ حکومت کرتے ہیں اگر ان کی کمزوریوں اور برائیوں کا جائزہ لیا جائے تو اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ ملک میں اس قدر خوشحالی کیوں ہے اگرچہ یہ حیرت بے جا ہے کیونکہ بات یہ ہے کہ امریکہ میں منتخبہ مجسٹریٹ امریکی جمہوریت کو فروغ نہیں دیتے بلکہ جمہوریت اس سے نشوونما پا رہی ہے کہ مجسٹریٹ منتخب ہیں۔

یہ خیال کرنا حق بجانب نہیں ہے کہ اپنے ہم وطنوں کی بہبود کے لیے امریکی حب وطن اور جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ خلوص سے عاری ہے اگرچہ امریکہ میں انسانی سرگرمی کے پس پشت ذاتی مفادات ہی قوت محرکہ کے طور پر کام کرتے ہیں لیکن یہ مفادات تمام انسانی سرگرمیوں پر حاوی نہیں۔ میں نے امریکیوں کو اپنے اہل وطن کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں کرتے دیکھا ہے اور میں نے ایسی متعدد مثالیں پیش کی ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ امریکی ایک دوسرے کی پرخلوص طور پر مدد کرتے ہیں۔ امریکہ میں جو بے شمار آزاد ادارے ہیں اور جن سیاسی حقوق کا وہ روزمرہ استعمال کرتے ہیں امریکی شہریوں کو ہمیشہ یہ یاد دلاتے ہیں کہ وہ ایک معاشرہ میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اور یہ کہ ان کے اپنے مفادات کے ساتھ ساتھ اوروں سے متعلق کچھ فرائض بھی ہیں اور یہ بات پیش نظر رکھتا ہے کہ مفاد اور فرض دونوں کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو دوسروں کے لئے مفید بنائے۔ وہ ان سے دشمنی رکھنے کی کوئی وجہ نہیں پاتا۔ اس لئے اس کا دل ہمیشہ ہمدردی کی طرف مائل رہتا ہے لوگ عوامی امور میں اولاً ضرورت کے پیش نظر اور بعد ازاں اپنی پسند سے دلچسپی لیتے ہیں۔ جو چیز ارادتاً کی جاتی ہے بعد میں عادت بن جاتی ہے۔

۲۹۔ عوامی انجمنیں اور شہری زندگی

میں یہاں ان سیاسی انجمنوں کے بارے میں بحث نہیں کروں گا۔ جو لوگ اپنے آپ اکثریت کے استبداد یا کسی جارحیت سے محفوظ رکھنے کے لیے منظم کرتے ہیں اس مسئلہ پر میں نے پہلے ہی بحث کی ہے۔

میں یہاں صرف ان انجمنوں پر بحث کروں گا جو سیاسی مقاصد کے پیش نظر شہری زندگی میں قائم کی جاتی ہیں۔ سیاسی انجمنیں تو امریکہ کی ان بے شمار انجمنوں کا ایک حصّہ ہیں جو ملک کے چپہ چپہ میں موجود ہیں۔ امریکی باشندے خواہ کسی عمر کے ہوں یا کسی مرتبے کے مسلسل انجمنیں بناتے رہتے ہیں۔ امریکہ میں نہ صرف تجارتی اور صنعتی کمپنیاں ہیں جس میں ہر شخص حصّہ لیتا ہے بلکہ ہزارہا انجمنیں ہیں۔ مذہبی، اخلاقی۔ سنجیدہ، بیکار، عام، محدود، بڑی اور چھوٹی۔ غرض ہر قسم کی انجمنیں ملیں گی۔ امریکی تفریح طبع کے لیے انجمنیں بناتے ہیں۔ کتب خانے قائم کرنے کے لیے، سرائے بنانے کے لیے، کلیسا تعمیر کرنے کے لیے، کتابوں کی تقسیم کے لیے تبلیغ کے لیے پادریوں کو بھیجنے کے لیے انجمنیں بناتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ہسپتال، جیل اور سکول بنائے ہیں۔ انگلستان اور فرانس میں کسی بھی نئے منصوبے یا تعمیر کے پیچھے اگر حکومت ہوگی تو امریکہ میں یقیناً انجمن ہوگی۔

مجھے امریکہ میں ایسی متعدد انجمنوں سے واسطہ پڑا ہے۔ جن کا میں تصوّر تک نہ کرسکتا تھا۔ امریکہ کے باشندوں کی اس صلاحیت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ وہ کس طرح ایک مشترکہ مقصد کے لیے عام مساعی کو مجتمع کرتے ہیں اور

عوام کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ رضا کارانہ طور پر اس مقصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد کریں
میں نے انگلستان کا دورہ بھی کیا ہے۔ جہاں کے رسوم اور روایات اور قانون
امریکیوں نے اپنائے ہیں۔ مگر انگلستان میں بھی انجمن سازی کے اصول اس طرح
استعمال میں نہیں لائے جاتے۔ انگریز عام طور پر بڑے بڑے کارنامے یکہ و تنہا
انجام دیتا ہے اور اس کے برعکس امریکی چھوٹے کام کے لیے بھی انجمنیں بناتا ہے
انگریز تو انجمن کو کسی اقدام کا ایک طاقتور ترین ذریعہ تصور کرتا ہے۔ مگر امریکی اسے
عمل کا واحد ذریعہ تصوّر کرتا ہے۔

اس طرح عہد حاضر میں روئے زمین پر سب سے زیادہ جمہوری ملک وہ ہے۔ جس
میں افراد اپنی مشترکہ خواہشات کی تکمیل کے لیے مشترک عمل کے فن کو تکمیل تک
پہنچاتے ہیں اور اس فن کو زیادہ سے زیادہ اغراض کے لیے زیر عمل لاتے ہیں
سوال یہ ہے کہ یہ بات محض اتفاقی ہے یا انجمن سازی اور اصولِ مساوات کے
درمیان درحقیقت کوئی لازمی تعلق ہے۔

اشرافی معاشرہ میں ایسے لوگوں کی تعداد بے حد زیادہ ہوتی ہے جو بے اثر
اور بے طاقت ہوتے اور متمول اور طاقتور لوگ چند ہوتے ہیں۔ ان میں سے
ہر ایک اکیلا بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتا ہے۔ اشرافی معاشرے
میں افراد کو عمل کے لیے متحد ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ خود لوگ
آپس میں ایک دوسرے سے مضبوط طور پر منسلک ہوتے ہیں۔ ہر دولت مند
اور طاقتور شخص ایک مستقل اور لازمی انجمن کا صدر ہوتا ہے جو اس کے زیر کفالت
ہوتی ہیں۔ جسے وہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنے تابع کرتا ہے۔

جمہوری ملکوں میں تمام شہری آزاد اور کمزور ہوتے ہیں۔ وہ اپنے طور پر کوئی
چیز انجام نہیں دے سکتے۔ اور اپنے ہم وطنوں کو مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اس

کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ اگر وہ رضاکارانہ طور پر ایک دوسرے کی مدد کرنا نہ سیکھیں وہ بے طاقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگر جمہوری ملکوں میں لوگوں کو سیاسی اغراض کے لیے انجمنیں بنانے کا حق نہ ہو یا ان میں اس کا میلان ہی نہ ہو تو ان کی آزادی خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ ممکن ہے وہ اپنی دولت اور علم کو ایک طویل عرصہ تک برقرار رکھ سکیں۔ لیکن اگر وہ اپنی روزمرہ زندگی میں انجمن سازی کی عادت پیدا نہ کریں تو تہذیب کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ ایک ایسے معاشرہ میں جہاں لوگ اکیلے اور اپنے طور پر بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کی طاقت سے محروم ہو چکے ہیں اور جنھوں نے اجتماعی مساعی کے ذریعہ ان کاموں کی تکمیل کے طریقے معلوم نہ کیے ہوں تو وہ لوگ بہت جلد دَورِ وحشت میں چلے جائیں گے۔

بدقسمتی سے جو حالات انجمنوں کے وجود کو جمہوری اقوام کے لیے ضروری بناتے ہیں، ان کی تشکیل کے کام کو بے حد مشکل کر دیتے ہیں۔ اشرافی معاشرہ میں تو جب ارکان انجمن بنانا چاہتے ہیں تو وہ آسانی سے ایسا کرتے ہیں۔ کیونکہ ہر رکن اپنے ساتھ انجمن کے لیے ایک بڑی طاقت لاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسی انجمن کے ارکان کی تعداد کم ہو۔ اور جب ارکان کم ہوں تو ان میں باہمی ربط بھی زیادہ ہوتا ہے اور مفاہمت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن جمہوری ملکوں میں ایسے مواقع کا فقدان رہتا ہے۔ اس لیئے کہ جمہوری ملکوں میں انجمنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ بے شمار ارکان پر مشتمل ہوں کہ وہ طاقتور ہوں۔

میں اس بات سے کماحقہ واقف ہوں۔ میرے ہم وطن فرانسیسی اس وقت سے ذرہ برابر بھی پریشان نہیں ہوتے۔ ان کا ادعایہ ہے کہ شہری جس قدر کمزور ہوں اور جس قدر بھی نااہل ہوں اسی تناسب سے ایک موثر اور فعال حکومت کی ضرورت ہوتی ہے تا معاشرہ بحیثیت مجموعی وہ کام انجام دے سکے جو افراد انجام نہیں دے

سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ اس وقت کا حل اسی میں مضمر ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ غلطی پر ہیں۔

ممکن ہے کہ ایک حکومت وہ کام انجام دے سکے جو بڑی امریکی کمپنیاں انجام دیتی ہیں اور متعدد ریاستوں نے، جو امریکی وفاق کی رکن ہیں۔ اس قسم کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن کوئی سیاسی طاقت ایسے متعدد چھوٹے چھوٹے کام انجام نہیں دے سکتی جو امریکہ کے باشندے ایسی متنوع اور ہزارہا انجمنوں کی مدد سے کرتے ہیں۔ ایک ایسے وقت کی پیش قیاسی کرنا بے حد آسان ہے جبکہ انسان اکیلا اور صرف اپنے لیے اپنی زندگی کی عام ضروریات کو پیدا کرنے کے کم سے کم قابل ہو جائے گا۔ اس لیے حکمران طاقت کے کام میں مسلسل اضافہ ہوتا ہی جائے گا۔ اور اس کی مساعی بڑھتی رہیں گی۔ اور اس امر میں بہتری ہے کہ یہ طاقت انجمنوں میں ہو اور انجمنیں ہی یہ کام انجام دیں۔ اگر حکومت نے کاروبار یا زراعت اپنے ہاتھ میں لیا تو اس سے جمہوری ملک کے عوام کی اخلاقی حالت پر اس قدر کاری ضرب لگے گی۔ جتنی کہ اس کے کاروبار اور صنعت کو خطرہ لاحق ہوگا۔

انسانوں کے باہمی تعاون اور ایک دوسرے پر اثر کے ذریعہ، لوگوں کے احساسات اور جذبات بنتے ہیں۔ ان کی ہمت بندھتی اور انسانی ذہن کی نشوونما ہوتی ہے۔ میں نے اس سے پہلے یہ وضاحت کی ہے کہ جمہوری ملکوں میں اس قسم کے اثرات کا فقدان ہوتا ہے۔ اور اس لیئے یہ ضروری ہے کہ انھیں مصنوعی طور پر پیدا کیا جائے جو محض انجمن سازی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

اشرافی معاشرے کے ارکان جب ایک نیا نظریہ قبول کرتے ہیں اور یا کسی نئے خیال کو جنم دیتے ہیں تو اسے ایک اونچا مقام دیتے ہیں۔ اور اس کو عوام کی نظروں میں اس قدر نمایاں کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کے ذہن و دماغ پر مرتسم ہو جائیں

جمہوری ملکوں میں صرف حکمران طاقت ہی اس طرح عمل کر سکتی ہے۔ لیکن عام طور پر حکمران طاقت کی کارکردگی ناکافی اور خطرناک ہوتی ہے۔ ایک بڑی قوم میں کسی نظریہ کو زندہ رکھنے اور اسے عوام میں مقبول رکھنے کے لیئے کوئی حکومت قابل نہیں ہوتی۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ وہ کسی پیداوارِ صنعت کا اہتمام نہیں کر سکتی۔ جوں ہی کوئی حکومت اپنے سیاسی دائرہ سے نکل کر دوسری حدود میں داخل ہوتی ہے۔ تو وہ غیرارادی طور پر ہی مستبد ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حکومت تو صرف اپنے قانون کی سختی سے پابندی کرانا چاہتی ہے۔ وہ مشورہ اور حکم میں امتیاز نہیں کر سکتی۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب کوئی حکومت یہ تصور کرنے لگے کہ وہ لوگوں میں نظریات کی تشہیر کو روک سکتی ہے ایسی صورت میں وہ ساکت و جامد ہو جاتی ہے۔ اور اپنی ہی سستی کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے جمہوری ملکوں میں یہ ضروری ہے کہ حکومت صرف واحد فعال طاقت نہ رہے۔ انجمنوں کو ان طاقتور افراد کی جگہ لینا چاہیئے۔ جن کو مساوات کے اصول نے ختم کر دیا ہے۔

امریکہ میں متعدد شہری کسی ایک رائے کو قبول کرنے یا کسی نظریہ کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو باہمی تعاون کی کوشش کرتے ہیں اور جب انہیں یہ تعاون میسر آجاتا ہے تو پھر وہ اپنی مساعی میں اشتراک پیدا کرتے ہیں۔ اس لمحہ کے بعد وہ تنہا نہیں رہتے۔ بلکہ وہ ایک طاقت بن جاتے ہیں۔ جن کا عمل قابل تقلید ہوتا ہے۔ اور جن کی بات وقیع جاتی ہے۔ امریکہ میں مجھے جب پہلی مرتبہ یہ علم ہوا کہ ایک لاکھ افراد نے ایک جماعت بنائی ہے۔ جس کا مقصد یہ کہ اس جماعت کے ارکان نشہ آور مشروبات سے پرہیز کریں گے۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ ان لوگوں نے محض مذاق کیا ہے۔ میں اس بات کا تصور بھی نہ کر سکا کہ ان شہریوں نے

کیوں اپنے طور پر شراب ترک نہ کر دی ؟ بعد میں مجھے اندازہ ہوا ہے کہ ترکِ مسکرات کے حامی یہ شہری امریکہ میں شراب نوشی کی بڑھتی ہوئی لعنت سے خوفزدہ ہوئے تھے اور یہ فیصلہ کیا تھا کہ ترکِ مسکرات کی سرپرستی کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے اس طرح عمل کیا جس طرح ایک ذی مرتبہ شخص سادے کپڑے پہن کر غریب اور نادار لوگوں کو تعیش سے نفرت دلاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر فرانس میں یہی ایک لاکھ اشخاص ہوتے تو ان میں سے ہر ایک شخص حکومت کو یہ درخواست پیش کرتا کہ وہ ملک کے طول و عرض میں سارے شراب خانوں پر پابندی عاید کرے۔

میری رائے میں امریکہ میں جو انجمنیں ہماری سب سے زیادہ توجہ کی محتاج ہیں وہ اخلاقی اور علمی انجمنیں ہیں۔ سیاسی اور صنعتی انجمنیں تو فوراً ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ لیکن دوسری انجمنوں پر ہماری نظر نہیں پڑتی۔ یا اگر ہمیں ان کا پتہ چلتا بھی ہے تو ہم انھیں پورے طور پر نہیں سمجھ پاتے۔ کیونکہ ہم نے اس قسم کی انجمنیں پہلے نہیں دیکھی تھیں۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ یہ انجمنیں بھی امریکیوں کے لیے اس قدر اہم ہیں جتنی کہ سیاسی انجمنیں ہیں۔ جمہوری ملکوں میں انجمن سازی کا علم تمام علوم کی ماں سمجھا جاتا ہے۔ اور تمام علوم کی ترقی کا انحصار انجمن سازی کے علم پر ہوتا ہے۔

انسانی معاشروں پر جو قانون حکمرانی کرتے ہیں۔ ان میں ایک قانون سب سے زیادہ واضح اور معین ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر انسان کو مہذب رہنا ہے تو یہ ضروری ہے کہ ایک دوسرے سے اشتراک کرنے کا فن اسی تناسب سے ترقی کرے۔ جس تناسب سے کہ معاشرہ میں حالت مساوات قائم ہو۔

۳۔ عوامی انجمنوں اور اخبارات کا تعلق

کسی معاشرہ میں جب لوگوں میں مضبوط اور دائمی رشتۂ اتحاد موجود نہ ہو تو ان کا تعاون حاصل کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ تا وقتیکہ ہر شخص کو اس بات پر آمادہ نہ کیا جائے کہ اس کے اپنے مفاد کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ مشترکہ مساعی میں رضاکارانہ طور پر شرکت کرے اور یہ کام آسانی سے صرف اخبارات ہی انجام دے سکتے ہیں صرف اخبار ہی ایک خیال کو بیک وقت متعدد لوگوں تک پہنچا سکتا ہے۔ اخبار ایسا مشیر ہوتا ہے جو کسی کی دعوت کے بغیر اپنا مشورہ دیتا ہے۔ اخبار ہی واحد مشیر ہے جو آپ کو آپ کے نجی معاملات میں دخل دیے بغیر مشترکہ مقاصد کے بارے میں صلاح و مشورہ دیتا ہے۔

انسان جس رفتار سے مساویانہ درجہ حاصل کرتے ہیں اور انفرادیت جس تناسب سے خطرناک ہوتی ہے۔ اسی رفتار و تناسب سے اخبار کا وجود ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ تصور کرنا کہ اخبار صرف آزادی کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کی اہمیت کو کم کرنے کے مرادف ہے۔ اخبار تہذیب کو برقرار رکھتے ہیں۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ جمہوری معاشروں میں اخبارات بسا اوقات شہریوں کو ایسے منصوبے چلانے پر آمادہ کرتے ہیں۔ جن کو اچھی طرح سمجھا تک نہیں گیا ہے۔ لیکن اگر اخبارات نہ ہوتے تو مشترکہ عمل اور سرگرمی بھی نہ ہوتی۔ اخبارات جو برائی پیدا کرتے ہیں وہ ان برائیوں سے بے حد کم ہیں جن کا علاج اخبارات کرتے ہیں۔

اخبار کا کام محض یہ نہیں ہوتا کہ وہ متعدد لوگوں کے سامنے ایک تجویز پیش کرے

بلکہ وہ ان ذرائع کو بھی مہیا کرتے ہیں - جن سے ان تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے - اشرافی معاشرہ میں اہم شہری ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف رہتے ہیں اور جب وہ اپنی قوتوں میں اتحاد پیدا کرنا چاہتے ہیں تو وہ آسانی سے ایسا کر لیتے ہیں اور اپنے ساتھ ہزاروں لوگوں کو لے جاتے ہیں - مگر جمہوری معاشرہ میں لوگ بے اثر اور کمزور ہوتے ہیں - اس لیے وہ آپس میں تعاون نہیں پیدا کر سکتے - اس لیئے کہ وہ ایک دوسرے سے واقف نہیں ہوتے - یہاں اخبار یہ مفید کام دیتا ہے - وہ کسی خیال یا نظریہ کو جو سب لوگوں میں یکدم پیدا ہوا ہو ہر ایک تک پہنچاتا ہے - سب لوگ اس کی رہنمائی قبول کرتے ہیں - اور بالآخر سب لوگ جو اِدھر اُدھر رہتے ہیں متحد ہوتے ہیں - یہاں اخبار نے سب کو ایک جگہ جمع کیا اور پھر اس کے بعد ان کو متحد کرنے کے لیے بھی اخبار ضروری ہے -

جمہوری معاشرہ میں کسی انجمن کے طاقتور ہونے کے لیے اس کا بے شمار افراد پر مشتمل ہونا ضروری ہے - انجمن کے ارکان ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے رہتے ہیں اور ان میں شخصی ربط متعدد وجوہ کی بنا پر ممکن نہیں - اس لیے یہ ضروری ہے کہ ایسے ذرائع معلوم کیے جائیں - جن سے انجمن کے ارکان میں بغیر کسی شخصی ملاقات کے تعلق باقی رہے - اور وہ آپس میں صلاح و مشورہ کرتے رہیں اور مشترکہ قدم اٹھائیں اور یہ کام اخبار کے بغیر انجام نہیں پا سکتا -

اس طرح اخبارات اور انجمنوں میں ایک لازمی تعلق موجود ہے - اخبارات انجمنیں بناتے ہیں اور انجمن اخبارات بناتے ہیں - اگر صحیح خطوط پر کام کیا گیا تو انجمنوں کی تعداد میں اسی تناسب سے اضافہ ہوگا - جس رفتار سے کہ معاشرہ میں مساوات فروغ پائے گی اور اس طرح یہ بھی یقینی ہے کہ اخبارات میں انجمنوں کے اضافہ کے ساتھ ساتھ ترقی ہوگی اس لیئے ہم امریکہ میں زیادہ سے

زیادہ تعداد میں انجمنیں اور اخبار پاتے ہیں۔

اخبارات اور انجمنوں کے اس تعلق سے ہمیں ایک اور تعلق کا علم ہوتا ہے۔ جو جرائد کی حالت اور ملک کے نظم ونسق کی شکل میں ہے اور یہ تعلق ظاہر کرتا ہے کہ جمہوری ملکوں میں اخبارات کی تعداد میں کمی اور اضافہ کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس ملک کا نظم ونسق کم مرکزی ہے یا زیادہ۔ کیونکہ جمہوری ملکوں میں مقامی حکومت کو معاشرہ کے اہم ارکان کے سپرد نہیں کر دیا جاتا۔ جیسا کہ اشرافی معاشرہ میں ہوا کرتا ہے۔ مقامی اخبارات کو یا تو ختم کر دیا جاتا ہے یا اسے لوگوں کی بڑی تعداد کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جو دراصل ایک قانون کے تحت ایک انجمن کی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ تاکہ اس خاص علاقہ کے نظم ونسق کا اہتمام کر سکیں انجمن ایک جریدہ کی ضرورت ہے تاکہ وہ عوام کی حالت اور طرز فکر کے بارے میں انھیں باخبر رکھے۔ مقامی اخبارات جس قدر زیادہ ہوں گے۔ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ان اخبارات کی حامل ہوگی اور یہ حقیقت زیادہ سے زیادہ اخبارات کی ضرورت پیدا کرے گی۔

امریکہ میں انتظامی اخبارات کی یہ غیر معمولی تقسیم اس قدر زیادہ اخبارات کو جنم دینے کا باعث ہوتی ہے اور یہ وجہ سیاسی آزادی اور آزادیٔ صحافت سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اگر امریکہ کے تمام باشندوں کو رائے دینے کا حق ہوتا۔ لیکن اس حق کا استعمال صرف کانگریس کے نمایندوں کے انتخاب کے لیئے کیا جاتا تو امریکہ میں اتنے اخبارات نہ ہوتے۔ کیونکہ کانگریس کے نمایندے تو صرف چند دن کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں اور وہ بھی اہم مسائل پر غور کرتے ہیں۔ لیکن قوم کی اس عظیم انجمن کے اندر، ہر ملک، ہر ریاست، ہر شہر اور ہر گاؤں میں مقامی انتظام کے لیے متعدد انجمنیں قائم کی گئی ہیں۔ اس طرح امریکی قانون شہریوں

کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں کاروبار مملکت کی تمنائی بنی رہے ہم وطنوں سے تعاون کرے اور ہر شخص کو ایک اخبار کی ضرورت ہے تاکہ اسے یہ معلوم ہو کہ دوسرے شہری کیا کر رہے ہیں؟ اور کیا سوچ رہے ہیں؟

میرا خیال ہے کہ ایک ایسی جمہوری قوم میں جس کی کوئی قومی مرکزی اسمبلی نہ ہو لیکن بے شمار مقامی انجمنیں ہوں تو وہاں بے شمار اخبارات ہوں گے بہ نسبت ان ملکوں کے جہاں انتظام میں مرکزیت ہو اور صرف ایک منتخبہ مجلس قانون ساز ہو۔ اور یہی بات ہے کہ امریکہ میں اخبارات کی بے حد اشاعت ہے۔

فرانس اور انگلستان میں یہ عام تاثر ہے کہ اگر اخبارات پر سے ٹیکس ہٹا دیے جائیں تو اس کی اشاعت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہ بات مبالغہ آرائی پر مبنی ہے اخبارات کی اشاعت میں اضافہ اس کی ارزانی کی بنا پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس ضرورت کی بنا پر ہوتا ہے۔ جو لوگ آپس میں ایک دوسرے کے لیے ربط رکھنے کے لیے محسوس کرتے ہیں۔

اس طرح میں یہ عرض کروں گا کہ روزانہ اخبارات کے روز افزوں اثر کی وجہ وہ نہیں ہے جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے۔ ایک اخبار اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے۔ جب کہ وہ عام احساسات اور جذبات کی ترجمانی کرے۔ اس طرح ایک اخبار ایک انجمن کا ترجمان ہوتا ہے اور اس کے ارکان اس اخبار کو بطور عادت پڑھتے ہیں۔

۱۱۔ سیاسی اور شہری انجمنوں کے تعلقات

امریکہ ہی روئے زمین پر ایک ایسا ملک ہے۔ جہاں لوگوں کو سیاسی اغراض کے لیے انجمنیں بنانے کی غیر محدود آزادی حاصل ہے۔ اور یہی ایک ایسا ملک ہے جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں انجمن سازی کے حق کا استعمال کیا گیا ہے۔ اور عہد حاضر کی تہذیب انسان کو جو بھی فوائد مہیا کرتی ہے۔ وہ سب ان ہی انجمنوں کے ذریعہ حاصل کیے جاتے ہیں۔

جن ممالک میں سیاسی انجمن سازی پر پابندی ہے۔ شہری انجمنوں کا بھی فقدان ہے، ممکن ہے شہری انجمنوں کی عدم موجودگی اول الذکر پابندی کا نتیجہ نہ ہو۔ لیکن یہ نتیجہ ضرور اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان دونوں میں فطری، اور ایک قسم کا لازمی تعلق ہے۔

بعض لوگوں کو ایک خاص معاملہ میں مشترکہ دلچسپی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی کاروبار کا اہتمام کرنا ہو یا صنعت میں کسی خاص تجویز کو عملی جامہ پہنانا ہو۔ تو وہ لوگ آپس میں مل بیٹھیں گے۔ اپنی مساعی میں اشتراک پیدا کریں گے اور بتدریج وہ انجمن سازی کے اصول سے آشنا ہوں گے۔ چھوٹے چھوٹے معاملہ میں جس قدر زیادہ پیچیدگیاں ہوں گی۔ لوگوں میں اس کام کو باہمی تعاون سے انجام دینے کی زیادہ عادت پیدا ہوگی۔

اس لیے یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ شہری انجمنیں سیاسی انجمنوں کے لیے راہ ہموار کرتی ہیں۔ اس کے برعکس سیاسی انجمنیں شہری انجمنوں کو طاقت دیتی ہیں اور ترقی دیتی ہیں۔ شہری زندگی میں تو ہر شخص کے ذہن میں یہ سودا سما

سکتا ہے کہ وہ بذات خود اپنی تمام ضروریات کی تکمیل کرنے پر قادر ہے۔ لیکن سیاسی زندگی میں کوئی شخص یہ خیال تک ذہن میں نہیں لا سکتا۔ اس طرح سیاسی زندگی انجمن سازی اور باہمی اشتراک کی محبت کو عام کرتی ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اتحاد کی خواہش پیدا کرتی ہے اور لوگوں کو متحد ہونے کے ذرائع سکھاتی ہے۔

سیاسیات نے نہ صرف متعدد انجمنوں کو پیدا کیا ہے۔ بلکہ بڑی بڑی انجمنیں بھی بنائی ہیں۔ شہری زندگی میں شاید و باید ہی کوئی خاص معاملہ یا کاروبار متعدد لوگوں کی دلچسپی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ اس قسم کی دلچسپی پیدا کرنے کے لیے ایک خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر سیاسی زندگی میں روزمرہ اس قسم کے مواقع آتے رہتے ہیں۔ بڑی بڑی انجمنوں ہی سے انجمن سازی کے اصولوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شہری جو انفرادی طور پر بے اثر ہوتے ہیں۔ آسانی سے ان فوائد کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ جو ان کے باہمی اتحاد سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور انھیں اس قسم کا اندازہ کرنے کا اہل بنانے کے لیے عملی ثبوت مہیا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سیاسی زندگی میں لوگ بڑے بڑے کاموں کے انجام دینے کے لیے اشتراک کرتے ہیں اور اس اشتراک سے انھیں علم ہو جاتا ہے کہ اتحادِ عمل میں ان ہی کا اپنا فائدہ مضمر ہے۔

اکثر شہری شراکتوں میں لوگ اپنی جائداد کے کسی حصہ کو خطرے میں ڈالے بغیر حصہ لے سکتے ہیں اور صنعتی اور تجارتی کمپنیاں اس کی بہترین مثال ہیں مگر جب تک لوگ اس قسم کی شہری انجمنوں، ان کے اصول اور قواعد سے ناآشنا رہتے ہیں وہ عام طور پر ان میں شرکت سے خوف کھاتے ہیں۔ مگر سیاسی انجمنوں میں شرکت کرنے سے وہ ذرا برابر نہیں ہچکچاتے۔ کیونکہ ایسی انجمنیں انھیں خطرناک نہیں معلوم ہوتیں۔ کیونکہ اس میں انھیں سرمایہ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان

انجمنوں سے تعلق رکھنے کی بنا پر یہ ضروری ہے کہ وہ ان اصولوں سے واقف ہو جائیں۔ جن کے ذریعہ بڑی بڑی انجمنوں میں نظم و نسق برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے کاموں میں باقاعدگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ غرض یہ کہ بڑی بڑی سیاسی انجمنیں دراصل لوگوں کے لیے ایک مکتب کا کام دیتی ہیں۔ جہاں وہ انجمن سازی کے اولین اور ضروری اصول سیکھتے ہیں۔

اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ سیاسی انجمنیں، شہری انجمنوں کی ترقی میں بالراست حصہ نہیں لیتیں۔ یہ حقیقت ہے کہ سیاسی انجمنوں کو تباہ کر دیا جائے۔ تو شہری انجمنوں کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ہے۔ جب لوگوں کو ہر قسم کی انجمنیں بنانے کی آزادی ہو۔ تو پھر لوگ آزادی سے ہر معاملہ میں اشتراک کرتے ہیں اور انجمن سازی کا اصول ہر شعبہ میں کارفرما ہوتا ہے۔

لیکن جب بعض خاص قسم کی انجمنوں پر پابندی ہو اور بعض انجمنوں کو آزادی ہو تو لوگوں کے لیے دونوں قسم کی انجمنوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اور اس شک و شبہ کی فضا میں وہ کسی قسم کی اجتماعی سرگرمی میں حصہ لینے سے احتراز کرتے ہیں۔

میرا ادعا یہ نہیں ہے کہ سیاسی انجمنوں کی عدم موجودگی میں شہری انجمنیں قائم ہی نہیں ہو سکتیں۔ بات یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر رہتے ہوئے انسان کسی نہ کسی معاملہ میں اشتراک کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ ایسے ملکوں میں شہری انجمنوں کی تعداد بے حد کم ہوگی اور ان کی تنظیم کمزور ہوگی۔ یہاں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ سیاسی دور میں انجمنیں بنانے کا حق امن عامہ کے لیے اس قدر خطرناک نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر فرض کیا جاتا ہے۔ چند دن تک معاشرے کو ہیجان میں رکھنے کے بعد بالآخر مملکت کو مستحکم ہی کرتا ہے۔

ہم جب امریکیوں کو مسلسل اور آزادی کے ساتھ مختلف قسم کی اور مختلف اغراض کے لیے انجمنیں بناتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یہ سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے کہ لوگ اس بارے میں اپنی آزادی کا غلط استعمال کیوں نہیں کرتے۔ اس کے برعکس اگر آپ اپنے گردوپیش پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ امریکہ کے باشندے بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کے لیے تجارتی کمپنیاں اور ادارے قائم کر رہے ہیں اور ان امور میں ان کا اس قدر سرمایہ لگا ہوتا ہے کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے جس سے ملک کے اندر کوئی ہیجان یا انقلاب برپا ہو۔

۳۲۔ امریکہ میں جسمانی راحتوں کا مذاق

امریکہ میں جسمانی راحت کا مذاق کسی ایک خاص طبقہ میں محدود نہیں ہے بلکہ یہ عام ہے۔ ہر شخص ایسی باتوں کے حصول میں سرگرداں رہتا ہے۔ جو اس کی زندگی کو پُر راحت بنائیں۔ تقریباً یہی صورتِ حال یورپ میں ہے۔ دونوں براعظموں میں یکساں قسم کے رجحانات میں ایک خاص تعلق ہے۔ جس کا ذکر بے محل نہیں ہوگا۔

جب تمول موروثی طور پر خاندانوں میں ہو تو زیادہ سے زیادہ لوگ ان آسائشوں کا مذاق رکھے بغیر ہی ان سے مستفید ہوتے ہیں اور لوگوں میں آسائشیں بالکلیہ قدرتی ہوتی ہیں۔ انھیں اس بات کا خوف نہیں رہتا ہے کہ کہیں وہ ان سے محروم نہ ہو جائیں۔ اشرافی معاشروں میں دولت مند لوگ، ان حالات سے بالکل ناآشنا ہوتے ہیں۔ جو ان کے حالات سے مختلف نہ ہوں تعیش اور راحتیں ان کا طرزِ زندگی ہوتا ہے نہ کہ زندگی کا مدعا۔

اس بنا پر اشرافی معاشروں کے متمول لوگ ان آسائشوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور انھوں نے ان آسائشوں سے محرومی کے بعد بھی غیر معمولی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مختلف انقلابات نے مقتدر امرا کے خاندانوں کو دولت اور آسائش سے محروم کر دیا۔ لیکن انھوں نے آسانی سے ان کے حالات کو قبول کر لیا۔ مگر جو لوگ خود اپنی محنت اور مشقت کے بعد اس قسم کی آسائشیں حاصل کرتے ہیں اگر ان سے محروم ہو جائیں تو بمشکل ہی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

اونچے طبقہ کے بعد اگر نچلے طبقہ کا مطالعہ کیا جائے۔ تو اندازہ ہوگا کہ بالکلیہ مختلف عوامل کی بنا پر وہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ جس کا تذکرہ متمول طبقہ کے سلسلے میں کیا گیا۔ اس معاشرہ میں جہاں اشرافیہ کا غلبہ ہو۔ حالات یکساں قسم کے رہتے ہیں اور جس طرح امیر اپنی امارت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ غریب بھی اپنی غربت پر قانع رہنے کے عادی بن جاتے ہیں۔ امیر اپنی آسائشوں کی فکر اس لئے نہیں کرتے کہ وہ انھیں بغیر کسی محنت کے حاصل رہتی ہیں اور غریب اس لئے فکر نہیں کرتے کہ وہ ان آسائشوں کے حصول کو امرِ ناممکن تصور کرتے ہیں۔ اس قسم کے معاشروں میں غریب اس خیال میں مگن رہتے ہیں کہ دوسری دنیا میں انھیں یہ مسرتیں حاصل ہوں گی۔

مگر ایسے معاشرہ جہاں درجہ بندیاں اور مراتب قائم نہ رہیں' موروثی جائداد کی تقسیم در تقسیم ہوتی رہے اور تعلیم و آزادی عام ہو' غریب لوگوں کو بھی دنیاوی آسائشوں کا خیال ستاتا رہتا ہے اور مالدار ان کے محروم ہونے کے خیال سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے متمول طبقے اُبھرتے ہیں اور جو لوگ مالدار ہو جاتے ہیں۔ ان کے پاس بس اس قدر آسائشیں ہوتی ہیں کہ انھیں ان کی مسرتوں کا اندازہ تو ہوتا ہے۔ لیکن وہ آسائشیں اتنی زیادہ نہیں ہوتیں کہ ان سے مکمل تسکین ہو سکے۔ یہ آسائشیں انھیں بغیر محنت و مشقت کے حاصل نہیں ہوتیں۔ غرض یہ کہ ان معاشروں میں ہر ایک شخص کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ نئی نئی آسائشیں حاصل کریں اور جو آسائشیں ہیں انھیں برقرار رکھے۔

اگر مجھ سے دریافت کیا جائے۔ ایسے لوگوں کے لئے جو بہ اعتبار پیدائش معروف نہ ہوں اور زیادہ متمول نہ ہوں۔ تو ان کا سب سے زیادہ فطری جذبہ اور خواہش کیا ہوگی۔ تو میں بلا تامل کہوں گا کہ وہ خوش حالی اور

جسمانی آسائشوں کی محبت ہے ۔ جسمانی آسائش کی محبت دراصل متوسط طبقہ کی ممتاز خصوصیت ہے اور اس طبقہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس محبت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔ یہ جذبہ متوسط طبقہ سے معاشرہ کے اونچے طبقوں میں منتقل ہوتا ہے اور نچلے طبقات میں اترتا ہے۔

میں امریکہ میں کسی ایسے شہری سے نہ ملا جو اس قدر غریب ہو کہ وہ متمول لوگوں کی مسرتوں پر رشک کی نگاہ ہی نہ ڈالے یا جس کے ذہن کی دنیا میں وہ تمام حسرتیں موجود نہ ہوں جو قسمت نے ابھی تک اسے مہیا نہ کی ہوں۔

اس کے برعکس امریکہ کے مالداروں میں مجھے کوئی شخص ایسا نہ ملا جو اشرافی معاشرہ کے امرا کی طرح دولت اور آسائش کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے۔

ان میں سے اکثر لوگ ایک زمانے میں غریب ہی تھے ۔ انھوں نے احتیاج اور تنگدستی کا مزہ چکھا تھا اور ایک زمانہ تک بدقسمتی کا شکار رہے اور اب جب کہ انھوں نے احتیاج اور تنگدستی پر فتح حاصل کر لی ہے تو ان میں وہ جذبات اب بھی باقی ہیں جنھوں نے ان کو فتحیاب کیا تھا اور ان کے دل ان مسرتوں کے نشہ میں چور ہیں ۔ جس کے لئے انھوں نے چالیس برس محنت کی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ امریکہ میں ایسے دولت مند لوگ ہیں جنھوں نے ورثہ میں دولت حاصل کی اور عیش و عشرت کو بغیر کسی محنت کے پایا ۔ لیکن یہ لوگ بھی جسمانی آسائشوں سے اسی طرح وابستہ ہیں جس طرح کہ دوسرے نو امیر ۔ عیش اور جسمانی آسائشوں سے محبت امریکی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت بن چکی ہے ۔ امریکی باشندوں کے اس رجحان کی بنا پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جسمانی راحتوں کی خواہش امریکی شہریوں کی اخلاقی حالت کو متاثر کرتی ہوگی اور وہ بداخلاقیوں کے مرتکب ہوں گے ۔ جس کی وجہ سے

خاندانوں کا امن و سکون برہم ہوتا ہوگا۔ اور اس طرح معاشرہ کی سلامتی بھی متاثر ہوتی ہوگی۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ جمہوری ملکوں میں جسمانی راحتوں کی خواہش اس سے بالکل برعکس اثرات اور نتائج پیدا کرتی ہے۔ جو اشرافی معاشروں میں پیدا ہوتے ہیں۔

اشرافی معاشروں میں ہو سکتا ہے کہ مذہبی عقاید کی تباہی اور مملکت کے تنزل کے ماحول میں کاروبار سلطنت یا سرکاری امور سے تنگ آکر اور دولت عیش سے اکتا کر، امرا اپنی زندگیوں کو نفسانی خواہشات میں الجھا دیں۔ بعض اوقات بادشاہوں کی طاقت، عوام کی کمزوری، دولت مندوں کو ان کی دولت سے محروم کیے بغیر، نظامِ مملکت سے دُور رکھتی ہیں۔ کیونکہ انھیں دوسرے میدانوں میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ چنانچہ وہ اپنی اس بے بسی کے احساس کو بھلانے کی خاطر نفسانی مسرتوں میں گم ہو جاتے ہیں۔

اور جب اشرافی معاشرہ کے یہ ارکان اس قسم کی جسمانی راحتوں کو اپنا مقصود بنا لیتے ہیں۔ تو اس میں انتہا کر دیتے ہیں۔ وہ محض معمولی تعیش پر قانع نہیں ہوتے۔ وہ بد اخلاقی اور بدکرداری کی انتہا کو پہنچ جاتے ہیں۔

اس کے برعکس جمہوری قوموں میں جسمانی راحتوں کی خواہش سے یہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی۔ اگرچہ ان میں آسائشوں سے محبت مستقل اور ہمہ گیر ہوتی ہے لیکن اس کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔

۳۳۔ امریکیوں کی صنعت و حرفت سے وابستگی

زراعت ایسا واحد پیشہ ہے جو جمہوری ملکوں میں انتہائی سست رفتاری سے ترقی کرتا ہے۔ بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زراعت اپنی ہی جگہ قائم ہے۔ کیونکہ دوسرے پیشے بڑی تیزی سے ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس لوگوں کے تمام رجحانات، جو مساوات کا نتیجہ ہیں، فطری طور پر صنعت و حرفت کی طرف ہوتے ہیں۔

بحث کی خاطر ایک ایسے شخص کی مثال لیجیے جو فعال ہے۔ تعلیم یافتہ اور قابل ہے۔ لیکن اس کی امنگیں لامحدود ہیں۔ وہ اتنا غریب ہے کہ بے کار رہ نہیں سکتا۔ اس کے پاس اتنی دولت ہے کہ اسے کسی فوری تنگدستی کا خطرہ نہیں۔ اس شخص کو ان جسمانی راحتوں کا بھی مزہ معلوم ہے۔ جس سے اس کے ہم وطن لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ اسے خود ایسی تھوڑی بہت راحتیں حاصل ہیں۔ لیکن وہ ان میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ زندگی اتنی طویل نہیں ہے اور وقت نکلا جا رہا ہے۔ کاشت کاری سے یقینی نتائج حاصل ہو سکتے ہیں لیکن دیر سے۔ اور اس سے آدمی امیر تو ہو سکتا ہے لیکن محنت اور مشقت کے بعد۔ لہٰذا زراعت ان ہی لوگوں کے لئے موزوں ہوتی ہے۔ جن کے پاس فالتو دولت کی کمی نہیں ہوتی۔ یا ان لوگوں کے لیے جو صرف اساسی ضروریاتِ زندگی پر قناعت کرنے پر مجبور رہتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں ہمارے اس مفروضہ شخص کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ

وہ اپنی زمین فروخت کردے اور کسی زیادہ منفعت بخش کاروبار کی طرف توجہ کرے۔
جمہوری معاشروں میں اس قسم کے آدمیوں کی کثرت ہوتی ہے اور ان کی تعداد میں اضافہ کا تناسب وہی رہتا ہے جو مساوات کے فروغ پانے سے ہوتا ہے پس جمہوریت نہ صرف محنت کشوں کی تعداد میں اضافہ کرتی ہے۔ بلکہ لوگوں میں خاص کاموں کی پسند اور ناپسند پیدا کرتی ہے۔ جہاں وہ لوگوں کی توجہات کو زراعت سے ہٹاتی ہے، وہیں ان میں تجارت اور صنعت کے ذوق کی ہمت افزائی کرتی ہے۔

یہ رجحان معاشرہ کے دولت مند ارکان میں بھی نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ جمہوری معاشروں میں دولت مند شخص ہمیشہ اپنی دولت سے غیر مطمئن رہتا ہے۔ کیونکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے آباد اجداد سے کم دولت مند ہے اور اسے خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں اس کی اولاد اس سے بھی کم امیر نہ ہو۔ چنانچہ اسی لیے جمہوری معاشروں میں دولت مند لوگ زیادہ سے زیادہ دولت کے حصول کے لیئے ایسے پیشوں کی طرف توجہ کرتے ہیں جو زیادہ منفعت بخش ہوں۔ اور اس طرح وہ اس سلسلے میں غریبوں ہی کے احساسات کے حصہ دار ہوتے ہیں۔

جمہوری ملکوں میں لوگوں کو دولت کی بنا پر سیاسی طاقت حاصل نہیں ہوتی بلکہ دولت انھیں سیاسی طاقت سے دور ہی کر دیتی ہے اور دولت مند یہ نہیں جانتے کہ وہ دولت کو کس مصرف میں لائیں۔ تجارت میں واحد راستہ ان کے لیئے کھلا رہتا ہے۔ جمہوری معاشروں میں تجارت اور صنعت میں سب سے زیادہ کشش ہوتی ہے۔ ان کے اپنے تعصبات یا اور کسی کے تعصبات دولت مندوں کو تجارت اور صنعت میں داخل ہونے سے روک نہیں سکتے۔ جمہوری

ملکوں میں دولت مندوں کا کوئی باقاعدہ طبقہ نہیں ہوتا۔ اس طرح کسی طبقہ کے خاص تعصّبات بھی ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتے۔

جیسا کہ میں نے کہا کہ دولت مندوں کو سیاسیات جن حدود میں مقید رکھتی ہے۔ اس کی بنا پر وہ کاروبار کو اپنی جولاں گاہ بناتے ہیں۔ اس میدان میں وہ اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہیں اور تقریباً یہی بات جمہوری ملکوں میں رہنے والے تمام لوگوں پر صادق آتی ہے۔ چونکہ جمہوریت میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور لوگوں کی آنکھیں اتفاق اور غیر یقینی سے آشنا ہوتی ہیں۔ اور نتیجۃً وہ ہر چیز کو پسند کرنے لگتے ہیں جس میں اتفاق کا عنصر ہو۔ اس طرح وہ تجارت میں نہ صرف منفعت کی خاطر حصہ لیتے ہیں بلکہ وہ اس مسرت کی خاطر بھی تجارت میں حصہ لیتے ہیں جو "اتفاق کے عنصر" کی بنا پر انھیں حاصل ہوتا ہے۔

امریکہ نے صرف ۵۰ سال پہلے برطانوی شہنشاہیت کی غلامی کا جوا اتار پھینکا۔ لیکن دنیا کے کسی ملک نے تجارت اور صنعت کے میدان میں اتنی ترقی نہیں کی ہے جتنی کہ امریکہ والوں نے کی ہے۔ تجارتی جہاز رانی کے لحاظ سے امریکہ دنیا کی اب دوسری بڑی جماعت ہے۔ اگرچہ ان کی صنعت کو بے شمار مصائب سے دوچار ہونا پڑا لیکن ترقی رکی نہیں۔

امریکہ میں بڑے بڑے کاروبار اور صنعتیں بغیر کسی دقت کے چلائی جاتی ہیں کیونکہ امریکہ کی ساری آبادی پیداوار صنعت میں حصہ لیتی ہے۔ اور بڑے بڑے حیرت انگیز کارنامے انجام دیے جاتے ہیں۔ اجنبیوں کے لیے یہ بات انتہائی حیرت انگیز رہی کہ وہ امریکی جنھوں نے کل ہی امریکہ کی سرزمین پر قدم رکھا ہے۔ کس طرح اپنے علاقہ کی صورت حال بدل دی۔ انھوں نے دریائے ہڈسن کو دریائے مسسیپی سے جوڑ دیا۔ بحر اوقیانوس کو خلیج میکسکو سے ملا دیا

دنیا کی سب سے بڑی ریلوے لائن امریکہ میں ہے۔

مگر امریکہ میں جو چیز سب سے زیادہ مجھے حیرت میں ڈالتی ہے۔ وہ وہاں کے بڑے بڑے تجارتی یا صنعتی کارخانے نہیں ہیں۔ بلکہ چھوٹے چھوٹے تجارتی ادارے ہیں۔ امریکہ کے تمام کاشتکار زراعت اور تجارت کو ملاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر نے زراعت کو تجارت بنالیا ہے۔

اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کاشتکار اس زمین پر ہمیشہ کے لیے آباد نہیں ہوتا جہاں کہ وہ زراعت کرتا ہے۔ بسا اوقات اور خاص طور پر مغرب کی ریاستوں میں کاشتکار زمین اس لیے خریدتے ہیں کہ چند دن ان پہ کاشت کرکے اسے فروخت کردیں۔ وہ اپنے کھیت پر مکان اس خیال کے تحت بناتا ہے کہ جب یہ علاقہ آباد ہوجائے گا۔ تو اس کی زمین کی قیمت میں اضافہ ہو جائے گا۔

ہر سال امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں بے شمار کاشتکار آتے ہیں اور ان علاقوں میں آباد ہوجاتے ہیں۔ جہاں کپاس اور گنے کی کاشت ہوتی ہے۔ چند دنوں تک یہ لوگ یہاں کاشتکاری کرتے ہیں اور جب کافی کما لیتے ہیں تو پھر وہ شمال کو چلے جاتے ہیں تاکہ وہاں آسودگی کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اس طرح امریکیوں نے زراعت میں بھی کاروبارانہ اصول رائج کردیے ہیں۔

۳۴۔ کیا صنعت امریکہ میں اشرافیہ پیدا کرے گی؟

میں نے یہ بتایا کہ جمہوریت کس طرح صنعت کی ہمت افزائی کرتی ہے اور کس طرح صنعت کاروں کے طبقہ میں اضافہ کرتی ہے۔ اب میں اس سوال پر بحث کروں گا کہ آیا اس کا امکان ہے کہ چور دروازہ سے یہ صنعت کار طبقہ اشرافیہ پیدا کرے۔

یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ جب ایک کاریگر ہر روز ایک ہی کام کرتا ہے۔ تو تمام اشیا انتہائی آسانی اور ارزاں طور پر تیار ہوتی ہیں اور یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بڑے بڑے کارخانوں کے قیام اور اس میں سرمایہ کی مقدار کی زیادتی کی بنا پر مصنوعات کی لاگت کم ہوتی ہے۔ یہ حقیقتیں پہلے ہی سے سب کو نامکمل طور پر معلوم تھیں۔ لیکن ہمارے زمانے میں ان کا پہلی مرتبہ مظاہرہ کیا گیا ہے اور ان اصولوں کا اطلاق بڑی بڑی صنعتوں پر کیا جا چکا ہے اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں پر بھی بہت جلد کیا جائے گا۔

جب ایک کاریگر یا صنّاع مسلسل اور انتھک ایک ہی کام کی تکمیل میں مصروف ہو۔ تو وہ بالآخر اپنے کام میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے کام میں اس طرح دلچسپی کھو دیتا ہے کہ وہ اپنے کام میں دھیان نہیں دیتا ہے۔ وہ روز بروز زیادہ چابکدست اور کم محنتی ہو جاتا ہے اور جس تناسب سے وہ بحیثیت کاریگر ترقی کرتا ہے بحیثیت انسان تنزل پذیر رہتا ہے ایک ایسے آدمی سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ جس کی زندگی کے بیس سال پن کا

سر انجام دینے میں گزری ہو۔ جب ایک شخص اپنی زندگی کا بڑا حصّہ اس طرح بسر کرتا ہے تو اس کا ذہن ہمیشہ اپنی زندگی کے روزمرہ مسائل پر مرتکز رہتا ہے ۔ اس کا جسم چند عادتیں اختیار کر لیتا ہے ۔ جس سے وہ چھٹکارا نہیں پا سکتا ۔ بالفاظ دیگر اس کا اپنے آپ سے اور اپنی ذات سے تعلق باقی نہیں رہتا ۔ بلکہ اس کی زندگی اس کے پیشہ سے لگ کر رہ جاتی ہے ۔ قانون تو اس کے لیئے زندگی کے مختلف پیشوں کی راہیں کھولتا ہے ۔ لیکن یہ سب اس کے لیے بے کار ہے ۔ اس لیے صنعت کا قانون ملک کے آئین، رسوم اور قانون سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے ۔ وہ نہ صرف ایک ہی پیشہ سے منسلک ہو کر رہ جاتا ہے بلکہ ایک ہی جگہ پر رہنے پر مجبور رہتا ہے ۔ پیشہ کی وجہ سے معاشرہ میں ایک مقام تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن وہ اس سے آگے بڑھ نہیں سکتا ۔

تقسیمِ کار کا اصول جس تناسب سے وسیع پیمانہ پر روبہ عمل لایا جائے گا ۔ اسی تناسب سے صناع اور کاریگر کمزور، کوتاہ نظر اور دوسروں پر اس کی محتاجی بڑھتی جائے گی ۔ صنعت ترقی کرتی ہے ۔ لیکن خود فن کار تنزل کی طرف مائل رہتا ہے ۔ دوسری طرف جوں ہی یہ حقیقت عیاں ہوتی جاتی ہے کہ مصنوعات اس وقت زیادہ سے زیادہ بہتر اور ارزاں ہوں گی ۔ جب کہ ان میں زیادہ سرمایہ لگایا جائے تو دولت مند اور تعلیم یافتہ لوگ ان صنعتوں کی طرف بھی توجہ دیں گے جو اس سے پہلے غریب صناعوں اور غیر تعلیم یافتہ صنعت کاروں کے ہاتھ میں تھیں ۔ غرض اس طرح علم صنعت جو صناعوں کی حیثیت کو گھٹاتا ہے آقاؤں کا ایک طبقہ پیدا کرتا ہے ۔

صناع اور کاریگر کی توجہ تو صرف ایک کام کے ایک خاص حصہ پر مبذول رہتی ہے ۔ عین اس وقت آقا کی نظر اپنی صنعت کے ہر شعبہ پر رہتی ہے ۔ اس

طرح جس رفتار سے کاریگر کی نظر میں وسعت کم ہوتی ہے۔ اسی رفتار سے آقا وسیع النظر ہوجاتا ہے۔ تھوڑی مدت میں کاریگر تو صرف جسمانی طاقت کے سوا کچھ حاصل نہیں کرتا۔ تو دوسرا علم اور سائنس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کامیابی کو یقینی بناتا ہے اور اس کی حیثیت ایک بڑی مملکت کے ظالم و جابر حکمران اور منتظم کی ہوجاتی ہے۔

آقا اور ملازم کے درمیان کوئی یکسانیت باقی نہیں رہتی اور دونوں کے درمیان فرق بڑھتا ہی جاتا ہے۔ دونوں کی حیثیت ایک ایسی طویل زنجیر کی دو کڑیوں کی ہوتی ہے جو انتہائی سروں پر ہوتی ہیں۔ ہر شخص اس جگہ کو پُر کرتا ہے جو اس کے لیے بنائی گئی ہے اور وہ اس جگہ کو نہیں چھوڑتا ہے۔ اس میں ایک تو دوسرے کا ہر لمحہ اور مسلسل محتاج رہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک کا کام مسلسل اطاعت اور دوسرے کا حکم چلاتا ہے یہ اشرافیہ نہیں تو اور کیا ہے؟

ملک میں معاشرتی مساوات میں جس رفتار سے اضافہ ہوتا ہے۔ اسی تناسب سے ملک میں ارزاں مصنوعات کی مانگ بڑھتی ہے اور ان اشیا کی ارزانی جو ان اشیا کو ہر شخص کے لیے قابل حصول بناتی ہے۔ صنعت کاروں کی کامیابی کا معیار بن جاتی ہے۔ اس لیے ایسے معاشرہ میں ہر روز دولت مند لوگ بڑے بڑے کارخانے قائم کرتے ہیں تاکہ روزافزوں مانگ کو پورا کیا جائے۔ لوگ جوں جوں جمہوریت کو اپنانے جائیں گے۔ تو وہ خاص طبقہ جو صنعت و حرفت کا مالک ہے اشرافی بنتا جائے گا۔ ایک طبقہ میں تو لوگ یکساں طور پر ترقی کریں گے اور دوسرے میں مختلف طور پر، اور کم تعداد والے طبقہ میں عدم مساوات بڑھے گی اس تجزیہ سے ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جمہوریت کی تہ سے اشرافیہ کا ابھرنا یقینی ہے۔

لیکن یہ اشرافیہ سابق اشرافیہ سے مختلف ہوگا۔ جیساکہ ظاہر ہے۔ کہ اس نظریہ اور تجزیہ کا اطلاق صرف صنعت کار طبقہ پر ہوتا ہے اور عام معاشرہ میں اس کی استثنائی حیثیت ہوگی۔ صنعت کار اس جمہوری دور میں جو چھوٹے چھوٹے اشرافی پیدا کریں گے۔ ان میں بعض لوگ ایسے ہوں گے جو بے حد متمول ہوں گے اور بعض بے حد غریب ہوں گے۔ غریب تو خیر اپنی حالت کو بہتر بنا نہ سکیں گے لیکن امیر اور متمول مسلسل غریب ہوتے رہیں گے یا وہ کافی دولت مند ہونے کے بعد کاروبار ہی کو ترک کردیں گے۔ غرض کہ یہ وہ عناصر ہیں جن پر غریب طبقات مشتمل ہونے میں معین ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے عناصر جو امیر طبقات پر مشتمل ہوتے ہیں غیر معین۔ کیونکہ ان متمول افراد میں کوئی باہمی مشترک مفادات نہیں ہوں گے۔ اور نہ مشترک روایات اور امیدیں۔

نہ صرف یہ کہ مالداروں میں ہی کوئی جامع اتحاد نہیں ہے بلکہ خود ان میں اور غریب طبقات میں کوئی حقیقی رشتہ نہیں ہے۔ ان کی افعالی حیثیت متصل نہیں ہے۔ ان میں مفادات کے تحت اتحاد اور افتراق پیدا ہوتا ہے۔ کاریگر اس میں شک نہیں کہ مستقل طور پر اپنے آقا کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن کسی ایک آقا کا نہیں یہ دونوں کارخانے میں تو ملتے ہیں۔ لیکن دوسری جگہ وہ ایک دوسرے سے آشنا بھی نہیں ہوتے۔ وہ ایک نقطہ پر تو جمع ہوتے ہیں۔ لیکن دوسرے امور میں دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔ صنعت کار اپنے کاریگر سے سوائے محنت کے کسی اور چیز کا مطالبہ نہیں کرتا۔ کاریگر اپنے آقا سے اجرت کے سوا اور کوئی چیز نہیں چاہتا۔ نہ ایک دوسرے کی حفاظت کا ذمہ دار ہے اور نہ دوسرا پہلے کی مدافعت کا۔ اور ان میں عادت یا فرض کی اساس پر کوئی مستقل رشتہ نہیں ہوتا ہے۔ کاروبار سے جو اشرافی طبقہ پیدا ہوتا ہے وہ صناعوں اور کاریگروں کی آبادی پر

کسی قسم کی حکمرانی نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کا مقصد ان پر حکومت کرنا نہیں بلکہ ان کو استعمال کرنا ہوتا ہے۔ ایسے اشرافی طبقہ کا ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا جنھیں وہ نوکر رکھتے ہیں۔ اور اگر کسی وقت ایسا اثر قائم کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے تو دوسرے لمحہ یہ اثر زائل ہو سکتا ہے۔

پرانے زمانہ کا علاقائی اشرافیہ چند قوانین کا پابند ہوتا تھا یا اپنے آپ کو رسوم اور روایات کا پابند تصور کرتا اور اس لحاظ سے وہ اپنے زیر حفاظت ملازموں کی مدد کو ضروری تصور کرتا اور ان کی تکالیف اور مصیبت میں دلجوئی کرتا لیکن صنعتی اشرافیہ اولاً اس شخص کو غریب اور ذلیل کرتا ہے جسے وہ نوکر رکھتا ہے اور بعد میں اسے لوگوں کے رحم اور کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ الغرض کاریگر اور صنعت کار طبقہ میں کوئی حقیقی قسم کا تعلق اور یگانگت نہیں ہوتی۔

میری بحیثیتِ مجموعی یہ رائے ہے کہ ہمارے اس دَور میں جو صنعتی اشرافیہ پیدا ہو رہا ہے وہ طبعاً تو انتہائی سخت گیر ہے۔ لیکن محدود اور کم خطرناک ہے۔ بہر حال جمہوریت کے حامیوں کو چاہیئے کہ وہ اس پر مسلسل نگاہ رکھیں۔ کیونکہ اگر کبھی دنیا میں مستقل طور پر عدم مساوات پیدا ہوں اور اشرافیہ نے قدم جمائے تو یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ یہی دروازہ ہے جس سے عدم مساوات اور اشرافیہ داخل ہوں گے۔

جزو سوم

۳۵- جمہوریت کا اثر افراد کے باہمی روابط پر

جمہوریت انسانوں میں ایک دوسرے سے گہری وابستگی پیدا نہیں کرتی۔ لیکن ان کے روزمرہ باہمی روابط میں ایک بے تکلفی پیدا کرتی ہے۔

کسی ایسی اجنبی جگہ جو اجنبیوں سے آباد ہو اور جن کی زبان اور رسوم وروایات بالکلیہ مختلف ہوں، اگر دو انگریز پہلی مرتبہ ایک دوسرے سے ملیں تو سب سے پہلے وہ حیرت و استعجاب کے جذبات کے ساتھ ایک دوسرے کو گھوریں گے اور ایک پوشیدہ احساسِ بے چینی کے ساتھ ایک دوسرے سے منہ موڑ لیں گے۔ اور اگر ان میں سے کسی ایک نے دوسرے کو مخاطب کر بھی لیا تو پھر وہ انتہائی تکلف کے ساتھ غیر اہم موضوعات پر بات چیت کریں گے حالانکہ ان دونوں کے درمیان کوئی دشمنی نہیں ہو گی۔ کیونکہ انھوں نے اس سے پہلے زندگی بھر میں ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ تھا۔ اور دونوں ایک دوسرے کو قابلِ احترام شخصیت تصور کرتے ہوں گے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں نے اس قدر احتیاط سے یہ بُعد کیوں قائم رکھا ہے؟ اس امر کے مطالعہ کے لیے ہمیں خود انگلستان کی معاشرت کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

اگر معاملہ دولت سے قطع نظر، جو معاشرہ کو مختلف مدارج میں تقسیم کرتی ہے، صرف پیدائش کا ہو تو ہر شخص اس بات سے واقف رہتا ہے کہ معاشرہ میں اس کا کیا مقام ہے۔ وہ اس مقام سے نہ بلند ہونے کی کوشش کرتا ہے اور نہ اسے اس مقام سے گرنے کا خوف لاحق رہتا ہے۔ اس قسم کے معاشروں میں مختلف طبقات کے لوگوں میں باہمی ربط کم ہی رہتا ہے۔ لیکن اتفاق انھیں یکجا کر دے تو وہ ایک دوسرے

سے اپنے مخصوص مقام کے کھوئے جانے کے ڈر کے بغیر، باہمی تعلق قائم کرتے ہیں۔ ان کے درمیان ربط مساویانہ اساس پر نہیں ہوتا۔ لیکن اس میں کوئی خاص تکلف بھی نہیں ہوتا۔

لیکن جب متمول اشرافیہ، پیدائشی اشرافیہ کی جگہ لیتا ہے تو صورت حال بدل جاتی ہے۔ اس قسم کے معاشرہ میں بعض لوگوں کے حقوق، مفادات اور مراعات بے حد زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے حصول کے مواقع سب کے لیئے کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس یہ حقوق اور مراعات ہوتی ہیں۔ وہ ہمیشہ ان کے کھوئے جانے کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں یا انھیں یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں دوسرے لوگ ان چیزوں میں ان کے شریک نہ ہو جائیں۔ جو لوگ ان حقوق سے محروم رہتے ہیں ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ بہر قیمت ان چیزوں کو حاصل کریں۔ چونکہ انسانوں کی سماجی حیثیت مستقل طور پہ متعین نہیں ہوتی اور دولت مندی اور تمول میں فرق کے لحاظ سے لوگوں کی باہمی درجہ بندی میں بھی فرق رہتا ہے۔ لیکن ایک نظر میں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون کس درجہ سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ معاشرہ میں ایک پوشیدہ بغض و عناد رہتا ہے۔ لوگوں کا ایک گروہ، دوسرے ایسے گروہ کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے جو اول الذکر کے نزدیک زیادہ سے زیادہ بلند مرتبہ کا حامل ہے۔ ثانی الذکر گروہ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان "غاصبوں" کو اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کا موقع نہ ملے اور بسا اوقات تو یہ بھی ہوتا ہے۔ ایک گروہ چوتھی منزل میں رہتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اپنے مقام کو بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو دوسری طرف وہ اپنے مقام کی حفاظت کے لیئے دوسروں سے نبرد آزما رہتا ہے۔

بحالت موجودہ انگلستان کی یہی حالت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دو انگریز ایک دور دراز اجنبی مقام میں ایک دوسرے سے ملنے کے باوجود آپس میں بے تکلف

نہیں ہوتے۔ چونکہ انگلستان میں اشرافی فخر بے حد زیادہ ہوتا ہے، اور چونکہ اشرافیہ کے حدود غیر متعین ہیں اس لیے ہر شخص کو یہ خدشہ رہتا ہے کہیں وہ ایک دوسرے سے بے تکلفی اور گہرے تعلق کی بنا پر یہ فائدہ نہ کھو دیں۔ جب ایک انگریز کسی دوسرے انگریز سے ملتا ہے تو چونکہ وہ دوسرے کے سماجی رتبہ کو فوری طور پر شناخت نہیں کرسکتا۔ اس لیئے اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ اس سے ربط پیدا کرنے میں احتراز کرے۔ لوگ اس بات سے ڈرتے ہیں کہ کسی شخص کی تھوڑی بہت بھی خدمت کہیں ان کے لیے ایک ناموزوں اور انمل اور بے جوڑ دوستی پیدا نہ کردے۔ وہ اخلاق، مروت اور شائستگی سے ڈرتے ہیں۔ اور وہ کسی اجنبی کے جذبات تشکر کو بھی قبول کرنے سے اسی طرح احتراز کرتے ہیں جس طرح وہ اس کی نفرت سے ڈرتے ہیں۔

عام طور پر لوگ انگریزوں کے کردار کی اس "غیر سماجی" خصوصیت اور اس کی کم گوئی اور بے تعلقی کو ان کے طبعی حالات سے محمول کرتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ ان خصوصیات میں ان کی نسل کا بھی تعلق ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ انگلستان کے سماجی حالات اس کے زیادہ ذمہ دار ہیں اور اس کا ثبوت امریکہ کے حالات کے موازنہ سے مل سکتا ہے۔

امریکہ میں جہاں پیدائشی حقوق اور مراعات کبھی بھی نہ تھے، اور جہاں تمول دولت مندوں کو کوئی خاص سماجی مقام نہیں دیتا۔ لوگ جب آپس میں ملتے ہیں تو وہ کسی قسم کے خوف و خدشات میں مبتلا نہیں رہتے۔ جب وہ کہیں اتفاق سے ملتے ہیں تو وہ باہمی ربط پیدا کرنے میں نہ نقصان محسوس کرتے ہیں اور نہ فائدہ۔ اس لیئے ان کی عادات بالکل فطری ہوتی ہیں۔ ان میں بے باکی، صاف گوئی ہوتی ہے۔ اور کھلے دل سے ملتے ہیں۔ وہ دوسروں سے نہ کسی بات کی توقع رکھتے ہیں اور نہ خوف کھاتے ہیں۔ اور وہ اپنی سماجی حیثیت کو ظاہر کرنے میں ذرا برابر نہیں ڈرتے۔

غیر ممالک میں دو امریکی فوراً دوست بن جاتے ہیں۔ اس لیئے کہ وہ امریکی ہیں۔ ان کی

راہ میں کوئی تعصب رکاوٹ نہیں بنتا۔ ان کی واحد قومیت ہی ایک دوسرے کے لئے بڑی کشش بن جاتی ہے۔

دو انگریزوں کے لیے ہم نسل ہونا کافی نہیں ہوتا۔ ان میں اتحاد صرف اس بات پر ہوسکتا ہے کہ وہ ایک ہی سماجی رتبہ سے متعلق ہوں۔ انگریزوں کے اس سماجی رجحان اور کیفیت پر امریکی بھی فرانسیسیوں ہی کی طرح حیرت زدہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ امریکی اپنے آغاز، نسل، مذہب، زبان اور کچھ حد تک عادات اور رسوم میں انگریزوں سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ امریکی صرف سماجی حالات میں انگریزوں سے مختلف ہیں اور اسی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے کردار کی ہر خصوصیت کا تعلق ان کے اپنے ملک کے آئین اور سماج کی ہیئتِ ترکیبی سے ہے نہ کہ وہاں کے طبعی حالات سے۔

۳۶۔ امریکی، ممالکِ غیر میں زیادہ حسّاس کیوں ہو جاتے ہیں؟

امریکی، تمام سنجیدہ، اور غور و فکر کرنے والی قوموں کی طرح بڑے منتقم المزاج ہوتے ہیں۔ وہ اپنے خلاف کسی زیادتی کو عمر بھر فراموش نہیں کرتے۔ لیکن ان کو صدمہ پہنچانا آسان نہیں ہوتا۔ وہ ناراض کم ہوتے ہیں۔ لیکن جب ناراض ہوتے ہیں تو ان کے غصہ کو ٹھنڈا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

اشرافی معاشروں میں جہاں چند افراد سارے امورِ مملکت کے ذمہ دار ہوتے ہیں، لوگوں ظاہری رکھ رکھاؤ، بعض معین اور مسلمہ قاعدوں کا پابند ہوتا ہے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسے دوسروں کے بارے میں کس قسم کے احترام کے جذبات کا اظہار کرنا چاہیئے اور آداب و شائستگی کے اصولوں سے کوئی شخص اپنی عدم واقفیت ظاہر نہیں کر سکتا۔ اعلیٰ طبقات کے رسوم اور طریقِ معاشرت دوسروں کے لیے نمونہ کا کام دیتے ہیں۔ اور علاوہ ازیں ہر طبقہ اپنے خاص آداب اور قواعد معیّن کرتا ہے اور اس کی پابندی کرتا ہے۔

لیکن جب سماجی مرتبے اور درجہ بندیاں قائم نہیں رہتیں اور مختلف مدارج اور مختلف الطبع اور مختلف قابلیتوں کے لوگ آپس میں آرام اور تفریح کی جگہوں پر ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو عام طور پر اچھے عادات و اطوار کے اصولوں پر اتفاقِ رائے مشکل ہوتا ہے۔ چونکہ قوانین غیر قطعی ہوتے ہیں۔ ان کی عدم تعمیل کو جرم قرار نہیں دیا جاتا ہے اور جو لوگ۔ ان قوانین سے واقف بھی ہوتے ہیں۔ وہ ظاہری رکھ رکھاؤ سے زیادہ نیت کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس طرح وہ کم مہذب تو ہو جاتے ہیں لیکن اس کے ساتھ کم جھگڑالو بھی ہوتے ہیں۔

آداب و معاشرت کے سلسلے میں ایسی بے شمار باتیں ہیں جن کو امریکی لائقِ توجہ

نہیں سمجھتے، وہ سمجھتا ہے کہ وہ اس کے لیئے لائق توجہ ہی نہیں ہیں۔ اور نہ وہ ان کا اپنے آپ کو پابند تصور کرتا ہے۔ اس لیے وہ یا تو درشتگی کو محسوس ہی نہیں کرتا یا اگر کرتا بھی ہے تو معاف کر دیتا ہے۔ اس کے طرز آداب میں کم شائستگی ہوتی ہے لیکن اس کے کردار میں سادگی اور مردانگی ہوتی ہے۔

امریکی باہمی تعلقات میں جس شفقت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور جس مردانہ اعتماد کے ساتھ وہ ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اس کی ایک اور وجہ بھی ہے جس کا میں نے اس سے پہلے کے باب میں ذکر کیا۔ امریکہ میں، شہری زندگی میں درجہ بندیاں نہ ہونے کے برابر ہیں اور سیاسی زندگی میں تو ہیں ہی نہیں۔ اس لیے امریکی اپنے آپ کو اپنے ہم وطنوں کے بارے میں کسی قسم کے سلوک بارد یہ کا اظہار کر کے کسی طریقہ کا پابند تصور نہیں کرتا اور نہ ہی وہ دوسروں سے اس قسم کے سلوک کا متوقع ہوتا ہے۔ چونکہ وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ اسے اپنے مفادات کے لیے اور کسی دوسرے کی دوستی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے وہ بھی محسوس نہیں کرتا کہ کوئی شخص ارادتاً اس کی دوستی سے احتراز کر رہا ہے۔ اسی طرح وہ کسی شخص کو اس کے سماجی مرتبہ کی بنا پر لائق نفرت تصور نہیں کرتا۔ اس لیے وہ خیال بھی ذہن میں نہیں لاتا کہ کوئی شخص اس سے اس لیے نفرت کرتا ہے کہ وہ سماجی اعتبار سے کم تر ہے اور جب تک وہ واضح طور پر یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس کی بے عزتی کی جا رہی ہے وہ کسی چیز کو توجہ کے لائق نہیں تصور کرتا۔ امریکہ کے سماجی حالات، امریکیوں کو اس بات کا عادی بنا دیتے ہیں کہ وہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں اپنی سبکی محسوس نہ کریں اور دوسری طرف انھیں جو جمہوری آزادی حاصل ہے وہ طبیعت کی اس نرمی کو قوم کے کردار کا جزو بنا دیتی ہے۔

ملک کے سیاسی ادارے تمام شہریوں کو ہر وقت ایک دوسرے سے ربط میں

رکھتے ہیں اور ہمیشہ مشترکہ مقاصد کے لیے اشتراکِ عمل پر مجبور کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے پاس جو ہمہ تن مصروف ہوتے ہیں، آداب معاشرت کی الجھنوں میں ضائع کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ان کی توجہ زیادہ اس بات پر ہوتی ہے کہ مل جل کر زندگی بسر کریں۔ اس لیے وہ رفتہ رفتہ لوگوں کے افکار و آرا کو ان کے عادات اور اطوار سے زیادہ اہمیت دینے کے عادی ہو جاتے ہیں اور معمولی معمولی باتیں انھیں ناگوارِ خاطر نہیں ہوتیں۔

میں نے اکثر اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ امریکہ میں کسی شخص کو یہ سمجھانا بے حد مشکل ہوتا ہے کہ اس کی کسی محفل میں موجودگی غیر ضروری ہو گئی ہے۔ اشاروں اور کنایوں سے اکثر کام نہیں چل سکتا۔ اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں نے کسی امریکی کی ہر بات کو اس غرض سے جھٹلانا شروع کیا کہ اس کی موجودگی اور اس سے بحث میرے مزاج میں تکدر پیدا کر رہی ہے اور میں اس سے جلد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ امریکی فوراً دوسرے حربوں اور دلیلوں سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرے گا تنگ آکر میں خاموشی اختیار کر لیتا ہوں اور اپنا دھیان کسی دوسری طرف منتقل کر دیتا ہوں۔ تو وہ امریکی یہ سمجھنے لگتا ہے۔ میں اس کے پیش کردہ حقائق پر غور و فکر کر رہا ہوں اور میں بالآخر تنگ آکر خود اس سے پیچھا چھڑا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔ تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں کسی فوری اور اہم کام کی بنا پر دوسری جگہ چلا جا رہا ہوں۔ یہ شخص کبھی یہ نہ سمجھ سکے گا کہ وہ مجھ سے کس حد تک اکتا چکا ہے۔ سوائے اس کے کہ میں اسے صاف صاف کہہ دوں۔ لیکن اگر ایسا کروں تو وہ زندگی بھر کے لیے میرا بدترین دشمن بن جائے گا۔

اب یہ بات تعجب خیز معلوم ہوگی کہ یہی شخص جب یورپ جائے گا تو اس قدر حساس اور نکتہ چین ہو جائے گا کہ شاید ہی کوئی بات ایسی ہو جو اسے گراں نہ

گزرے۔ ان دونوں متضاد خصوصیات کا اصل منبع ایک ہی ہے۔ جمہوری ادارے لوگوں میں اپنے بارے میں اور اپنے ملک کے بارے میں بلند تر تصورات پیدا کرتے ہیں۔ امریکی شہری جب اپنے ملک سے رخصت ہوتا ہے تو اس کا دل جذبات فخر اور غرور سے معمور ہوتا ہے۔ اور وہ جب یورپ کی سرزمین پر قدم رکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ یورپ کے لوگ امریکہ اور اس کے عظیم لوگوں میں اس قدر منہمک نہیں ہیں جیسا کہ اس نے فرض کر رکھا تھا۔ اور یہیں سے اس کے مزاج میں تکدر پیدا ہوتا ہے۔ امریکہ سے چلنے سے پہلے ہی اسے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ یورپ کے معاشرہ میں فسادات نہیں ہیں اور وہ خود اس بات کا مشاہدہ کرتا ہے کہ یورپ میں درجہ بندیاں اور مراتب بالکلیہ ۔۔ ختم نہیں کر دیے گئے ہیں۔ اور یہ کہ پیدائش اور دولت دونوں لوگوں کو غیر متعین مراعات عطا کرتی ہیں۔ اب وہ اس بات سے بے خبر رہتا ہے کہ یورپ کے ان مختلف طبقات میں اپنا مقام کہاں سے متعین کرے یہ طبقات جو ایک دوسرے سے متنفر ہوتے ہیں۔ لیکن امریکی ان میں کوئی امتیاز پیدا نہیں کر سکتا۔ اپنا مقام متعین کرنے کے سلسلے میں اسے ایک طرف تو ہمیشہ یہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں وہ ضرورت سے زیادہ اونچا مقام نہ دے دے۔ دوسری طرف وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ وہ کوئی گرا ہوا مقام حاصل کرے۔ یہ دوگونہ ذہنی کشمکش اسے ہمیشہ کرب میں رکھتی ہے اور اس کے تمام افعال اور اقوال پر حاوی ہو جاتی ہے۔

روایات سے اسے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یورپ میں رسوم، اطوار، معاشرہ کے ہر طبقہ میں مختلف ہیں۔ ماضی کی یہ یادیں اس کی حیرانگی کو انتہا تک پہنچا دیتی ہیں۔ اور اسے یہ ڈر ہونے لگتا ہے۔ کہ اسے وہ عزت اور احترام نہیں دیا جا رہا ہے۔ جس کا وہ مستحق ہے۔ لیکن وہ نہیں چاہتا کہ اس عزت و احترام کا اظہار کن چیزوں میں ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسے شخص کے مانند ہوتی ہے۔ جس

کے چاروں طرف جال ہی جال ہوں - معاشرہ اس کے لیے باعث تسکین نہیں رہتا - بلکہ باعثِ مشقت - وہ اس عالم میں آپ کے ہر فعل کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے - آپ کی نظروں کو پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور آپ کی ہر بات کو پرکھتا اور تولتا ہے - کہ کہیں اس میں ایسی پوشیدہ بات تو نہیں ہے جس کا مقصد اس کی توہین ہو - وہ ہر مروجہ رسم اور طریق معاشرت کی پابندی کرنے کی کوشش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ ہر شخص اس کے ساتھ بھی کسی بات کو نظر انداز نہ کرے - وہ پورے طور پر اصولوں کا پابند ہو جاتا ہے - اور زیادہ سے زیادہ نمود و نمائش کرنا چاہتا ہے - لیکن وہ ڈرتا بھی ہے کہ کہیں اس میں غلو تو نہیں کر رہا ہے - کیونکہ وہ خود ان کے حدود سے ناآشنا ہوتا ہے - اس لیے وہ اس ذہنی کشمکش کی حالت میں کم گو اور اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کرتا ہے -

مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی - اسے ایک اور فطری مشکل بھی پیش آتی ہے - امریکی کی عادت ہے کہ وہ اس قابل ستائش مساوات کا ہر طرف چرچا کرے جو امریکہ میں رائج ہے - بظاہر اور بڑی زور شور سے وہ امریکہ کی اس خصوصیت پر ناز و فخر کرتا ہے لیکن دل ہی دل میں وہ جہاں تک اپنی ذات کا تعلق ہے - اس کو قابل نفرت تصور کرتا ہے اس لیے کہ وہ لوگوں پر یہ رعب قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی ذات امریکہ کی عام حالت سے مستثنیٰ ہے - آپ کو شاید و باید ہی کوئی امریکی ایسا ملے جو بہ اعتبار نسل اپنا تعلق ان اولین زائرین سے نہ رکھتا ہو جنھوں نے امریکہ کی سرزمین پر یہ نوآبادی قائم کی تھی - اس طرح وہ اپنا رشتہ انگلستان کے شرفا سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے - امریکہ میں ایسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد ہے - یورپ میں جب کوئی متمول امریکی آتا ہے تو سب سے پہلے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے گرد زندگی کی ساری عیش و عشرتوں کو جمع کرے - اس ڈر سے کہ کہیں لوگ اسے ایک جمہوری

ملک کا سادہ سیدھا شہری نہ سمجھ لیں۔ وہ ہر روز اپنی دولت کی نمود و نمائش کے لیے ہزار ہا اور نت نئے طریقے استعمال کرتا ہے۔ اس کا گھر شہر کے انتہائی فیشن ایبل علاقہ میں ہوگا۔ اور اس کے ارد گرد بے شمار نوکر اور خادم ہوں گے۔ میں نے ایک امریکی کو یہ شکایت کرتے سنا ہے کہ پیرس کے شہر میں گھروں میں بھی معاشرہ ملا جلا ہے۔ اور وہاں جو ذوق رائج ہے وہ خالص نوعیت کا نہیں ہے۔ یہ امریکی اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے کہ پیرس کے ان گھروں کی طرز معاشرت میں شان و شوکت کا فقدان ہے۔

امریکیوں کی طبیعت میں یہ تضاد ہمارے لئے حیران کن نہیں ہونا چاہیے۔ اگر امریکہ میں اشرافی مدارج کو مکمل طور پر ختم نہ کر دیا جاتا تو امریکی اپنے ملک میں کم سادہ، کم روادار اور کم بردبار ہوتے۔ مگر یورپ میں آ کر انھیں مستعار عادات اور طریق معاشرت اختیار کرنے کی خواہش بھی نہ ہوتی۔

۳۷۔ جمہوریت کا اثر اجرتوں پر

سماجی مراتب اور درجہ بندیوں میں جوں جوں کمی ہوتی ہے اور غربت اور امارت موروثی نہیں رہتی تو وہ حقیقی مراتب کا فاصلہ جو کاریگر کو اس کے آقا سے جدا رکھتا ہے روز بروز کم ہوتا جاتا ہے۔ محنت کش اپنے حقوق، مستقبل اور خود اپنے بارے میں بلند بانگ تصورات کا حامل ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں نئی امنگیں اور نئے جذبات اور تمنائیں ابھرتی ہیں اور اس کی ضروریات میں اضافہ ہوتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اپنے آقا کے منافع پر حریصانہ نگاہیں ڈالتا ہے اور اس منافع میں حصہ دار ہونے کے لیے اپنی محنت کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر فروخت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

جمہوری ملکوں میں، اور ممالک ہی کی طرح، پیداوار صنعت کی اکثر شاخیں کم لاگت ہی میں چلائی جاتی ہیں۔ اور ان کے چلانے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو بہ اعتبار تعلیم یا دولت ان لوگوں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے جنھیں وہ نوکر رکھتے ہیں۔ اس قسم کے صنعت کار بے شمار ہوتے ہیں۔ ان کے مفادات مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ آپس میں آسانی سے اتحاد و اشتراک نہیں کر سکتے۔ اس کے برعکس محنت کش عام طور پر ہمیشہ چند ایسے یقینی ذرائع کے مالک ہوتے ہیں۔ جو مزدوروں کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ اگر یہ محسوس کریں کہ ان کی محنت کا مناسب معاوضہ نہیں مل رہا ہے۔ تو کام کرنے سے انکار کر دیں۔ اجرتوں میں اضافہ کی مسلسل کشمکش میں جو ان دو طبقات میں جاری ہے۔ ان کی طاقت منقسم رہتی ہے۔ اور کامیابی کبھی ایک فریق کو اور کبھی

دوسرے فریق کو حاصل ہوتی ہے۔

عین ممکن ہے کہ بالآخر محنت کش طبقہ کے مفادات کو فتح حاصل ہو۔ کیونکہ محنت کشوں نے جو اجرتیں حاصل کر لی ہیں ان سے ان کا اپنے آقاؤں پر انحصار کم ہوتا جا رہا ہے۔ اور جوں جوں وہ زیادہ آزاد ہوتے جائیں گے وہ اپنی اجرتوں میں مزید اضافہ کرانے کے قابل ہو سکیں گے۔

میں مثال کے طور پر پیداآور صنعت کے اس شعبہ کو لوں گا جس میں فرانس اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں زیادہ حصہ لیا جاتا ہے۔ اس سے میری مراد زراعت ہے۔ فرانس میں جو لوگ کاشتکاری کے لیے نوکر رکھے جاتے ہیں عام طور پر خود چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ اور ان کھیتوں سے ان کی کم از کم ضروریات کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ جب یہ لوگ اپنی خدمات اپنے کسی ہمسایہ زمیندار یا کاشتکار کو پیش کرتے ہیں اور اگر زمیندار یا کاشتکار ان کی خدمات کا مناسب معاوضہ نہ دے تو وہ اپنی چھوٹی سی جائیداد پر انحصار کرتے ہیں۔ اور کسی اور موقع کے متلاشی رہتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ایک قاعدہ کے طور پر جمہوری معاشروں کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اجرتیں بتدریج اضافہ پذیر ہی رہتی ہیں۔ جس رفتار سے سماجی فرق مٹیں گے اسی رفتار سے اُجرتوں میں اضافہ ہوگا۔ اور جوں جوں اُجرتوں میں اضافہ ہوگا ویسے ہی مساویانہ حالات پیدا ہوں گے۔

لیکن ہمارے اس دور میں ایک مایوس کن استثنائی حالت وقوع پذیر ہوئی ہے جیسا کہ میں نے کسی پچھلے باب میں بتایا ہے کہ سیاسی زندگی سے جبری اخراج کے بعد اشرافیہ نے صنعت کے بعض شعبوں میں پناہ لی ہے۔ اور ایک اور شکل میں اپنی حکمرانی قائم کی ہے۔ اور یہی عامل اجرتوں پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔

بڑی بڑی صنعتوں کے قیام کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت ہوتی

ہے ۔ چنانچہ ایسی صنعتوں میں داخل ہونے والوں کی تعداد بھی محدود ہوتی ہے ۔ چونکہ ان کی تعداد کم ہوتی ہے ۔ اس لیے ان میں اتحاد بھی ہو سکتا ہے ۔ اور وہ اپنی مرضی کے مطابق اجرتیں مقرر کرتے ہیں ۔

اس کے برعکس ان صنعتوں میں مزدوروں کی تعداد بھی غیر معمولی طور پر زیادہ ہوتی ہے اور اس تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔ کیونکہ وقتاً فوقتاً اشیا کی طلب میں اضافہ کے ساتھ ساتھ کاروبار میں زبردست اضافہ ہوتا ہے ۔ کاروبار کے اس اضافہ کے دوران میں اجرتیں بھی عام حالت سے زیادہ ہوتی ہیں اور یہ زائد اجرتیں آس پاس کی آبادی کو کارخانوں تک کھینچ لاتی ہیں ۔ لیکن جب لوگ ایک پیشہ اختیار کر لیتے ہیں تو وہ انھیں آسانی سے چھوڑ نہیں سکتے ۔ کیونکہ وہ اس پیشہ کے دوران ایسی مخصوص جسمانی اور ذہنی عادات اختیار کرتے ہیں جو انھیں کسی اور کام کے لیے موزوں نہیں رکھتیں ۔ یہ لوگ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوتے اور ان کے وسائل محدود ہوتے ہیں ۔ اس لیئے وہ تقریباً اپنے آقاؤں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں ۔

جب تجارتی مسابقت یا اور کوئی نقصان دہ حالات منافع میں کمی کر دیتے ہیں تو آقا اپنے مزدوروں کی اُجرتوں میں اپنی مرضی سے کمی کر سکتا ہے ۔ اور اس نقصان کو پورا کر سکتا ہے جو اسے کاروبار کی غیر یقینی حالت سے اٹھانا پڑا ۔ اگر مزدور ہڑتال کر دیں تو آجر جو متمول ہوتا ہے ایک عرصۂ دراز تک انتظار کر سکتا ہے اور ضرورتیں بالآخر مزدوروں کو مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ کام پر رجوع ہو جائیں ۔ کیونکہ اگر مزدور روز کام نہ کریں تو پھر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے ۔ مزدوروں کا اثاثہ خود ان کی محنت ہوتا ہے ۔ اور اس کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا ۔ وہ اپنے آقاؤں کی زیادتی اور استبداد سے پہلے ہی مفلوک الحال ہو چکے ہوتے ہیں ۔ اور وہ جس قدر زیادہ فلاکت زدہ ہوں گے آقا اسی قدر زیادہ ان پر زبردستی کر سکے گا ۔ وہ اسباب و علل

کے اس بھیانک چکّر سے کبھی بھی نہ نکل سکیں گے۔

اس لیے یہ بات باعثِ حیرت نہیں ہے کہ صنعت کے اس مخصوص شعبہ میں اجرتیں، جو ایک مرحلہ پر یکایک زیادہ ہو گئی تھیں مستقل طور پر بعد میں کم ہو گئیں اور اس کے برعکس دوسرے شعبوں میں، جہاں اجرتیں بڑھتی تو ہیں لیکن کم، اجرتوں میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا ہے۔

ہمارے اس دور میں صنعتی آبادی کا ایک حصّہ اپنے آپ کو جس محتاجی اور فلاکت زدگی کی حالت میں پاتا ہے وہ ایک استثنائی شکل کی حیثیت رکھتا ہے اور معاشرہ کی عام حالت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

۳۸۔ جمہوریت کے اثرات خاندان پر

میں نے پچھلے ابواب میں ان تبدیلیوں کا تجزیہ کیا ہے جو مساوات نے جمہوری ملکوں میں اور خاص طور پر امریکہ میں معاشرہ کے افراد کے باہمی تعلقات میں پیدا کیے ہیں۔ اب میں آپ کو اس مسئلہ کو مزید گہری طور پر مطالعہ کرنے کی دعوت دوں گا تاکہ یہ اندازہ کیا جا سکے کہ جمہوریت' خاندانی رشتوں پر کس طرح اثرانداز ہوتی ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہمارے اس جمہوری دور میں خاندان کے متعدد افراد کے باہمی تعلق کی ایک بالکلیہ نئی اساس قائم ہو چکی ہے اور یہ کہ اس سے قبل جو فاصلہ باپ کو اس کے بیٹے سے جدا کرتا تھا وہ کم کر دیا جا چکا ہے اور یہ کہ پدرانہ برتری کو اگر تباہ نہیں کیا گیا ہے تو اس کو کمزور کر دیا گیا ہے۔

امریکہ کی صورت حال بھی کچھ اس قسم کی ہے بلکہ اس سے زیادہ حیران کن ہے۔ امریکہ میں اس خاندان کا وجود نہیں ہے جو رومن اور اشرافی تصور کا خاندان ہے۔ اس خاندان کے جو کچھ رہے سہے اثرات ہیں وہ بچے کی اوائل زندگی میں نظر آتے ہیں۔ جب کہ باپ' بلا کسی مزاحمت' و مخالفت کے مطلق کل ہوتا ہے اور اور یہ بات بچے کی اپنی کمزوری کی وجہ سے ضروری بھی ہوتی ہے۔ لیکن امریکی جیسے جیسے سن بلوغ میں داخل ہوتا ہے تو اس کی فرزندی کے رشتے کمزور سے کمزور تر ہوتے جاتے ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو امریکہ میں بچپن اور جوانی کے درمیان کوئی زمانہ ہی نہیں ہوتا۔ جوں ہی لڑکپن ختم ہوا امریکی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے اور اپنی راہ آپ بناتا ہے۔

یہ فرض نہیں کرنا چاہیے کہ لڑکے کی علیحدگی ایک گھریلو جھگڑے کے بعد عمل میں آتی ہے جس میں لڑکا ایک اخلاقی تشدد کے ذریعہ اپنے باپ سے وہ آزادی حاصل کرتا ہے جس سے اس کے باپ نے محروم کر رکھا تھا۔ بات یہ ہے کہ یہاں وہی عادات اور وہی اصول کام کرتے ہیں جو کسی شخص کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے آزادی کے حق کا ادعا کرے اور دوسرے کو یہ حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور کرے کہ اس آزادی کا استعمال اس شخص کا حق ہے۔ پہلا شخص نہ تو بغض و عناد کے ان جذبات کا اظہار کرتا ہے جو عام طور پر مسلمہ برتری کے اس تعلق کو توڑنے کے بعد لوگوں کے ذہنوں میں عرصۂ دراز تک رہتے ہیں۔ اور نہ تو دوسرا شخص کسی تلخی یا نفرت کا اظہار کرتا ہے جسے اس قسم کی برتری حاصل تھی۔ باپ اپنے اختیار اور حکمرانی کی حدود کو بہت پہلے ہی متعین کر لیتا ہے اور جب وقت آتا ہے تو وہ خوشی خوشی اس اختیار سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ لڑکا اس وقت کا منتظر رہتا ہے جب کہ وہ اپنے قول و فعل کا آپ مالک ہو جائے گا۔ اور آزادی کے دور میں کسی خوف و اندیشے اور کسی مساعی کے بغیر داخل ہوتا ہے۔

یہاں اس بات کا مطالعہ کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کہ خاندانی تعلقات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان کا تعلق ان سیاسی اور سماجی انقلابات سے کس قدر گہرا ہے جو ہمارے اس دور میں پایۂ تکمیل کو پہنچ رہے ہیں۔

بعض سماجی اصول ایسے ہیں جنھیں لوگ یا تو ہر طرف رائج کرتے ہیں یا انھیں کسی جگہ برداشت نہیں کرتے۔ اشرافی ملکوں میں جہاں درجہ بندیاں اور سماجی مراتب کی حکمرانی ہوتی ہے۔ حکومت کبھی اپنے زیر حکومت عوام سے راست اپیل نہیں کرتے۔ چونکہ لوگ آپس میں متحد ہوتے ہیں۔ اس لیے چند لوگوں کی رہنمائی کافی تصور کی جاتی ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ باقی سب لوگ ان کی پیروی کریں گے۔ اس اصول کا اطلاق خاندانوں

پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح اشرافی معاشروں پر جن کا ایک صدر ہوتا ہے۔ اشرافی اقوام میں سماجی ادارے خاندان میں سوائے باپ کے کسی اور کو تسلیم نہیں کرتے۔ بچوں کو باپ ہی کی وساطت سے معاشرہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ سوسائٹی باپ پر حکومت کرتی ہے اور باپ بچوں پر۔ اس طرح باپ کو نہ صرف فطری طور پر بالکل سیاسی طور پر بھی بچے پر حکومت کا حق ہوتا ہے بلکہ وہ خاندان کا بانی اور مددگار ہے اور ساتھ ہی حاکم بھی۔

جمہوریتوں میں جہاں حکومت افراد کو الگ الگ طور پر معاشرہ کے قوانین کا پابند بناتی ہے۔ اس قسم کے درمیانی شخص کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قانون کی نظر میں باپ محض معاشرہ کا ایک رکن ہے جو اپنے بچوں سے زیادہ صاحبِ عمر اور صاحبِ دولت ہے۔

معاشرہ میں جب مساوات نہ ہو اور عدم مساوات معاشرہ کی مستقل کیفیت ہو تو لوگوں کے اذہان میں ایک برتر شخصیت کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اکثر قانون ایسے شخص کو کوئی مراعات یا حقوق نہ بھی دے تو روایات، رسوم اور رائے عامہ ایسا اختیار دے دیتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس جب لوگوں کی سماجی حالت میں زیادہ فرق نہ ہو اور لوگوں کی سماجی حیثیت میں تبدیلی آتی رہتی ہو تو برتر شخصیت کا تصور بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ کسی قسم کی قانون سازی اس رجحان کو روک نہیں سکتی۔ وقت کی رفتار ان دونوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے۔

اشرافی اقوام کے قوانین صدرِ خاندان کو کوئی خاص اختیارات نہیں دیتے۔ لیکن جمہوری ملکوں کی بہ نسبت صدرِ خاندان کا زیادہ احترام کیا جاتا ہے۔ قانون کچھ بھی ہوں۔ اشرافی ملکوں میں بڑوں کا مرتبہ اونچا ہی ہوتا ہے۔

ایسے معاشروں میں جہاں لوگ جب اپنے اسلاف کی عظمت کا احترام کرتے ہوں اور اپنے ماضی کو اپنے حال سے زیادہ قدر اور فخر کی نگاہ سے دیکھتے ہوں تو باپ ہی ان کے لیے ان کے ماضی اور حال کے درمیان ایک فطری کڑی کا کام دیتا ہے۔

اس طرح اشرافی معاشروں میں باپ نہ صرف معاشرتی طور پر خاندان کا صدر ہوتا ہے بلکہ وہ روایات کا ترجمان، پرانی رسوم کا شارح اور معاشرہ کے رسوم کے سلسلہ میں حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی باتیں احترام کے ساتھ سنی جاتی ہیں۔ اور اسے عزت سے مخاطب کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ جو محبت محسوس کی جاتی ہے۔ اس میں خوف بھی شامل رہتا ہے۔

لیکن جمہوری معاشروں میں لوگ مختلف آرا اور نظریات کو اپنے طور پر قبول کرتے ہیں۔ قدیم باتوں کو بطور مذہب یا عقیدہ قبول نہیں کرتے بلکہ انھیں صرف ایک ذریعہ معلومات تصوّر کرتے ہیں۔ ان حالات میں باپ کے فکر و عمل کا اثر اپنے لڑکوں پر کم ہو جاتا ہے اور اس طرح اس کے قانونی اختیار میں بھی کمی آجاتی ہے۔

جمہوری ملکوں میں جائدادوں کی تقسیم در تقسیم باپ اور بچوں کے تعلقات پر سب باتوں سے زیادہ اثر ڈالتی ہے۔ باپ کی جائداد مختصر ہو تو باپ اور اس کے بچے ایک ہی جگہ رہتے ہیں اور ایک قسم کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی عادات اور ضروریات ایک ہی جگہ رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ اور ان میں مسلسل تعلق قائم رہتا ہے۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باپ اور خاندان کے دیگر افراد میں گہری وابستگی پیدا ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے برتری کا تصور باقی نہیں رہتا۔

جمہوری ملکوں میں جس طبقہ کے پاس کچھ دولت اور خوش حالی ہوتی ہے۔ وہ ایسا ہوتا ہے جو معاشرہ کے آداب اور اطوار میں رہنمائی کرتا ہے۔ یہ طبقہ اپنی آرا کو زیادہ سے زیادہ مقبول اور غالب بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جو لوگ اس طبقہ کی ہدایت اور نگرانی قبول کرتے ہیں مزاحمت بھی کرتے ہیں وہ بالآخر اس کے پیش کردہ نمونوں کو قبول کرتے ہیں۔ میں جمہوریت کے ایسے مخالفوں سے بھی واقف ہوں جنھوں نے اپنی اولاد کو یہ اجازت دی کہ انھیں مساویانہ اساس پر مخاطب کریں۔

غرض یہ کہ جوں جوں اشرافیہ کی طاقت ختم ہو رہی ہے۔ پدری برتری کے قانونی، روایاتی اور سنجیدہ عناصر غائب ہو رہے ہیں اور گھریلو زندگی کے اندر بھی مساوات کی ایک خاص نوع پروان چڑھ رہی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس تبدیلی سے معاشرہ کو کیا نقصان ہو رہا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ انسان، انفرادی طور پر اس سے فائدہ میں ہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آداب معاشرت اور قوانین جس قدر زیادہ جمہوری ہوتے جائیں گے باپ اور بیٹے کے رشتہ میں زیادہ محبت اور شفقت ہو گی۔ اور تعلقات زیادہ گہرے ہوں گے۔ فرمانبرداری اور حاکمیت کم ہو گی۔ لیکن ان میں محبت اور بھروسہ بڑھے گا اور سماجی بندھنوں کے ڈھیلے ہونے کے ساتھ ساتھ قدرتی بندھنیں مضبوط ہوں گی۔

جمہوری خاندان میں باپ اپنی اولاد پر اس سے زیادہ حکم نہیں چلاتا جتنا کہ پدری محبت اور تجربہ عمر مقتضی ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس کی عدول حکمی کی جائے۔ لیکن اس کے مشوروں کو ہمیشہ مستند سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے احترام میں روایاتی رسوم کی پابندی کی جاتی۔ لیکن اس کی اولاد اس پر بھروسہ اور اعتماد کرتی ہے۔ باپ کو مخاطب کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی مسلّمہ طریقے نہیں ہوں گے۔ لیکن وہ ہر روز اپنے باپ سے مشورہ طلب کریں گے۔ باپ، آقا اور حکمران تو باقی نہیں رہا لیکن اولاد کے لیے وہ اب بھی باپ ہی ہے۔

معاشرہ کی ان دونوں حالتوں کا فرق سمجھنے کے لیے میرے خیال میں اشرافی دور کے خاندانوں کی باہمی مراسلت کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہوگا۔ اشرافی دور میں باپ اور بیٹے کی خط وکتابت میں، طرز تحریر اور اسلوب درست ہوگا۔ اس میں تکلف ہوگا عبارت میں اس قدر خشکی اور اس قدر سرد مہری ہو گی کہ اس زبان میں دل کی محبت کی فطری گرمی کا بمشکل اظہار ہو سکتا ہے۔ جمہوری ملکوں میں بیٹا اپنے باپ کے نام جو خط لکھے گا اس کی تحریر میں آزادی، اپنائیت اور محبت ہو گی جو یکدم یہ بات ظاہر کرے گی

کہ خاندان کی تہ میں ایک نئے قسم کے رشتے ابھر آئے ہیں۔

بچوں کے باہمی تعلقات میں بھی اس قسم کا انقلاب آتا ہے۔ اشرافی معاشروں کی طرح اشرافی خاندانوں میں ہر شخص کا مقام پہلے ہی سے متعین ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ باپ کا ایک الگ مخصوص مقام ہوتا ہے بلکہ خود بچے بھی آپس میں ہم مرتبہ نہیں ہوتے۔ ہر بچے کی عمر اور جنس ان کا درجہ مقرر کرتی ہے اور ان کو مخصوص مراعات دیتی ہے۔ جمہوریت میں ایسے مختلف اختیارات ڈھا دیے جاتے ہیں۔

اشرافی خاندانوں میں سب سے بڑا لڑکا، جو باپ کی جائیداد کا بڑا حصہ ورثہ میں حاصل کرتا ہے اور خاندان کے سارے حقوق حاصل کرتا ہے اپنے بھائیوں کا سردار بلکہ بڑی حد تک ان کا آقا بن جاتا ہے۔ بڑے لڑکے کے لیے طاقت اور نرمی مخصوص ہو جاتی ہے اور باقی سبھوں کے مقدر میں محتاجی اور معمولی حیثیت لکھی ہوتی ہے، لیکن جہاں یہ فرق نہیں کرنا چاہتے کہ اشرافی معاشروں میں بڑے لڑکوں کو جو فائدے ہوتے ہیں وہ صرف اپنے ہی لیے استعمال کرنا چاہتے۔ اس کے برعکس بڑا لڑکا اپنے بھائیوں کے لیے دولت اور طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے گھر کی عظمت اور بڑائی کا اندازہ ان ہی لوگوں سے ہو سکتا ہے۔ جو اس کے زیر سرپرستی ہوں اور چھوٹے لڑکے اپنے بڑے بھائی کی ان تمام مساعی میں ہاتھ بٹاتے ہیں جو ان کے خاندان کی عظمت اور خوشحالی میں اضافہ کا باعث ہو سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ اشرافی خاندان کے افراد ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہوتے ہیں۔ ان کے مفادات یکساں ہوتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں اتحاد ہوتا ہے۔ لیکن ان کے دل شاید ہی ملتے ہوں۔

جمہوریت بھی بھائیوں میں ایک مضبوط بندھن قائم رکھتی ہے۔ لیکن دوسرے ذرائع سے۔ جمہوری قوانین کے مطابق تمام بچے مساوی حیثیت کے حامل ہوتے

ہیں۔ اور نتیجتہً آزاد ہوتے ہیں۔ کوئی چیز ان کو مجبوراً ایک دوسرے سے متعلق نہیں رکھتی۔ لیکن کوئی شے انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ بھی نہیں رکھتی۔ چونکہ ان کا اصل ایک ہی ہے۔ ان کی تربیت ایک چھت ہی کے نیچے ہوتی ہے۔ انھیں ایک قسم کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ اور ان میں کوئی چیز ایک دوسرے کو ایک دوسرے پر ترجیح نہیں عطا کرتی۔ اس لیے اوائل زندگی کی محبت اور یارانہ ان میں ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ کوئی چیز اس رشتے کو نہیں توڑ سکتی جو زندگی کی ابتدائی منزلوں میں قائم ہو گیا تھا۔ ان میں رشتۂ محبت مفادات کی اساس پر استوار نہیں ہوتا۔ جمہوریت ان کا ورثہ تقسیم تو کر دیتی ہے۔ لیکن ان کے ذہن اور دلوں میں اتحاد پیدا کرتی ہے۔

جمہوری آداب معاشرت کی یہ کشش اس قدر طاقتور ہوتی ہے کہ اس سے اشرافیہ کے حامی بھی اس کی طرف کھنچے آتے ہیں اور چند دن تک ان آداب کا تجربہ کرنے کے بعد اشرافی خاندانوں کے سخت گیرانہ اور رسمی آداب کی طرف رجوع ہونے کا خیال تک ذہن میں نہیں لاتے۔ ممکن ہے کہ وہ جمہوری سماجی حالات اور قوانین کو ترک کر دیں۔ لیکن وہ جمہوری خاندانی زندگی کی روایات کو بخوشی برقرار رکھیں گے۔ لیکن یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے ناقابل علیحدگی ہیں۔ جمہوری سماجی حالات اور قوانین کے بغیر جمہوری خاندانی زندگی کی برکتوں سے لطف اٹھایا نہیں جا سکتا۔

پدرانہ محبت اور برادرانہ شفقت کے بارے میں جو باتیں کہی گئی ہیں ان کا اطلاق ان تمام جذبات پر ہوتا ہے جن کا مآخذ انسانی فطرت ہے۔

اگر کوئی طرز تخیل یا احساس زندگی کے چند مخصوص حالات کا نتیجہ ہے تو حالات میں تبدیلی کے ساتھ ہی وہ خیال یا احساس ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح ایک قانون خاندان کے دو ارکان کو آپس میں ایک دوسرے سے متعلق رکھ سکتا ہے۔ لیکن جب

وہ قانون بھی ختم ہوجائے تو پھر وہ دونوں علیحدہ علیحدہ سروں پر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ایک زمانہ ایسا تھا جب کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاگیردارانہ نظام کے تحت امرا اور رعایا میں جو رشتہ ہے اس سے زیادہ مضبوط اور سخت کوئی تعلق نہیں ہے۔ آج کے دور میں یہ دونوں ایک دوسرے سے واقف تک نہیں ہیں۔ خوف اور ڈر، وہ جذبۂ احسان مندی اور وابستگی جو جاگیردار اور اس کی رعایا کے درمیان تعلق قائم رکھتے ہیں۔ ختم ہوچکے ہیں اور ان تعلقات کے آثار تک باقی نہیں رہے۔

لیکن انسانوں کی فطری احساسات اور جذبات کی یہ صورت حال نہیں ہوتی۔ اگر کوئی قانون ان احساسات اور جذبات کو ایک خاص طریقہ پر موڑنے کی کوشش کرے تو یہ جذبات ہی کمزور ہوجاتے ہیں اور ان جذبات کی شدت میں اضافہ کرنے کی کوشش میں وہ ان کو اساس عناصر ہی سے محروم کردیتا ہے۔ کیونکہ یہ عناصر اس وقت زیادہ طاقتور ہوتے ہیں جب کہ وہ آزاد ہوں۔

جمہوریت، جو معاشرہ کے پرانے رسوم اور قانون کو توڑ دیتی ہے اور جو انسانوں کو نئے قوانین آسانی سے قبول کرنے سے روکتی ہے، ایسے متعدد جذبات و احساسات کو مٹا دیتی ہے جسے پرانے قاعدوں نے پیدا کیا تھا۔ بعضوں میں ترمیم کرتی ہے اور بعض احساسات میں ایک خاص قسم کی توانائی اور شیرینی پیدا کرتی ہے غرض کہ جمہوریت سماجی بندھنوں کو ڈھیلا کرتی ہے تو فطری رشتوں کو مضبوط بناتی ہے۔ یہ قرابت داری کو اور مستحکم کرتی ہے مگر۔۔ شہریوں کو ایک دوسرے سے زیادہ دور کرتی ہے۔

۳۹- جمہوریت میں عورتوں کی حیثیت

ہر آزاد معاشرہ کے کچھ نہ کچھ اخلاقی قانون ہوتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں کہا ہے کہ اخلاق کا سنوارنا عورتوں کا کام ہے۔ چنانچہ میں ہر اس شے کو سیاسی طور پر اہم تصور کرتا ہوں جو عورتوں کی حالت، عادات اور افکار پر اثر ڈالتی ہو پروٹسٹنٹ ملکوں میں کیتھولک ممالک کے برعکس، عورت محض اپنے افعال اور اقوال کی مالک ہی نہیں ہوتی۔ انگلستان جیسے پروٹسٹنٹ ملکوں میں جہاں حکومت خود اختیاری کے حقوق حاصل ہیں عورت کو بہت زیادہ آزادی ہوتی ہے۔ سیاسی عادات اور مذہبی عقائد کی بنا پر آزادی گھریلو زندگی میں سرایت ہو چکی ہوتی ہے۔ امریکہ میں پروٹسٹنٹ مذہب کے عقائد اور سیاسی آزادی کے اصولوں میں ایک امتزاج پیدا کیا گیا ہے اور دنیا کے کسی ملک میں عورت کو اس قدر جلدی اور اس قدر مکمل طور پر اپنی تقدیر آپ بنانے کے لئے آزاد نہیں چھوڑا جاتا۔

امریکی لڑکی کو اس کی شادی کی عمر تک پہنچنے سے قبل ہی مادرانہ نگرانی سے نجات حاصل ہو جاتی ہے۔ ابھی وہ عالم شباب میں داخل ہی نہیں ہونے پاتی کہ اپنے بارے میں آپ سوچنا شروع کر دیتی ہے۔ آزادی سے بات چیت کرتی ہے اور اپنے خیالات کے مطابق عمل کرتی ہے۔ دنیا کی یہ عظیم بازی گاہ ہمیشہ اس کی نظر میں رہتی ہے۔ اور اسے اس کی نظروں سے چھپانے کی بجائے اس کے سامنے واضح سے واضح تر کیا جاتا ہے۔ اور اسے سکھایا جاتا ہے کہ وہ خاموشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ گرد و پیش کا جائزہ لیتی رہے۔ اس طرح معاشرہ کی خرابیاں اور خطرات

زندگی کے ابتدائی دور میں اس پر منکشف ہو جاتے ہیں چونکہ وہ ان سب باتوں کو واضح طور پر دیکھتی ہے۔ اس لئے اسے کسی غلط فہمی کا امکان نہیں رہتا۔ اور ان سب کا بلا خوف و خطر مقابلہ کرتی ہے۔ کیونکہ اسے اپنی طاقت پر بھروسہ ہوتا ہے۔ اور اس کے اس بھروسے میں سب کے سب حصہ دار ہوتے ہیں۔

امریکی لڑکی اپنی نوجوان آرزوؤں اور تمناؤں کے ہجوم میں شاید ہی اس دوشیزگی کی نرمی یا اس معصومانہ اور سادہ دلربائی کا مظاہرہ کرتی ہے جو یورپ کی لڑکیاں اپنے زمانۂ طفولیت سے عنفوانِ شباب میں داخل ہونے کے عبوری دور میں کرتی ہیں۔ اسی طرح امریکی عورت خواہ وہ کسی عمر کی ہو کبھی بھی طفلانہ حماقت یا جہالت کا مظاہرہ نہ کرے گی۔ یورپ کی عورتوں ہی کی طرح وہ خوش کرنا چاہتی ہے۔ لیکن وہ اچھی طرح سے واقف ہوتی ہے کہ اسے خوش کرنے کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ اگر وہ اپنے آپ کو برائی کے حوالے نہیں بھی کرتی تو وہ کم از کم یہ جانتی ہے کہ برائی کا وجود ہے اور اس کی طرزِ بود و باش اس کی عصمت ذہنی سے زیادہ پاک ہے۔

مجھے لبا اوقات یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ امریکی عورتیں انتہائی بے باکی اور صفائی کے ساتھ اپنے خیالات انتہائی ستھری زبان میں پیش کرتی ہیں۔ اور ایسے مسائل پر بھی بے تکلفی سے اظہار رائے کرتی ہیں جن میں ایک فلسفی کی زبان بھی لڑکھڑا جاتی ہے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ امریکی عورتیں اپنی نوجوانی کی آزادی کے دوران اپنے افعال کی آپ مالک ہوتی ہیں۔ اور اس بات کی مختار ہوتی ہیں کہ وہ تمام جائز مسرتوں میں اپنے آپ کو ان مسرتوں کے سپرد کئے بغیر اپنا لیں۔ اور ان کی عقل دانش انہیں ہمیشہ اپنی آپ قیادت کی عنان کو چھوڑنے نہیں دیتی۔

فرانس میں جہاں مختلف زمانوں کے رسوم اور روایات لوگوں کے مزاج اور ذوق میں گھل مل گئے ہیں۔ عورتیں عام طور پر اشرافی طبقوں کے مانند محتاط اور رسمی سی تعلیم

حاصل کرتی ہیں۔ اور اس کے بعد انہیں ان تمام بے قاعدگیوں کے درمیان جو جمہوریت کا ناقابلِ علیحدگی حصہ ہیں۔ بغیر کسی رہنمائی اور امداد کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

اس بارے میں امریکی زیادہ باقاعدہ نہیں۔ انہوں نے یہ بات جان لی ہے کہ جمہوریت میں مرد کی آزادی کی حدیں بے حد وسیع ہو سکتی ہیں۔ نوجوانی میں شعور کا فقدان ہوتا ہے۔ مذاق بے ہنگم ہوتے ہیں۔ رسوم اور رواج سیلانی ہوتے ہیں۔ رائے عامہ اکثر غیر متعین اور بے اثر ہوتی ہے۔ پدرانہ اختیار کمزور ہو جاتا ہے اور شوہرانہ اختیار زیادہ طاقتور نہیں ہوتا۔ ان حالات میں انہوں نے اس خیال کے ماتحت کہ عورت کے اندر موجزن ان طاقتور فطری جذبات کو دبانا مشکل ہے یہ ضروری سمجھا کہ اس کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ خود عورت کو یہ سکھا دیا جائے کہ وہ اپنے ان جذبات کا خود کس طرح مقابلہ کر سکتی ہے۔ چونکہ وہ عورت کی عصمت اور پاکبازی کو ہر وقت خطرات میں مبتلا ہونے کے امکان کو روک نہ سکتے تھے، انہوں نے یہ طے کیا کہ عورت کو یہ بتا دیا جائے کہ وہ اپنی آپ مدافعت کر سکتی ہے اور اس سلسلہ میں عورت کی آزاد مرضی کی طاقت پر زیادہ انحصار کیا گیا۔ بہ نسبت ان روایاتی پابندیوں کے جس کی کمزوری ایک سے زیادہ مرتبہ عیاں ہو چکی ہے عورت میں اپنے آپ کے بے اعتمادی بڑھانے کی بجائے انہوں نے اس کی خود اعتمادی میں اضافہ کیا اور اسے اپنے کردار کی طاقت پر بھروسہ کرنا سکھایا۔ چونکہ ایک عورت کو مستقل طور پر اور دائمی جہالت میں رکھنا نہ تو ممکن ہے اور نہ پسندیدہ اس لئے وہ عورت کو ہر موضوع کے بارے میں قبل از وقت ہی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ دنیا کی بدعنوانیوں اور بدکرداریوں کو چھپانے کی بجائے وہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ عورت خود اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھے اور ان سے بچنے کی اپنے آپ کو تربیت دے۔ اور وہ اس بات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں کہ اس کے کردار کی حفاظت کریں۔ بہ نسبت اس کے خیالات کو معصوم رکھنے

کے لئے غیر ضروری طور پر سختی کا اظہار کریں۔

اگرچہ امریکی بے حد مذہبی لوگ ہیں۔ لیکن عورت کی عفت کی حفاظت کے لئے وہ محض مذہب ہی پر تکیہ نہیں کرتے وہ اس کو ذہنی طور پر بھی مسلح بھی کرتے ہیں۔ اور اس شعبے میں بھی وہ وہی طریقہ کار اختیار کرتے ہیں جو انہوں نے زندگی کے اور شعبوں میں آزمایا ہے اور وہ یہ کہ پہلے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ انفرادی آزادی اپنے آپ پر کنٹرول کرنے کی تربیت حاصل کرلے۔ وہ اس بارے میں مذہب کی امداد اس وقت تک طلب نہیں کرتے جب تک وہ انسانی طاقت کی انتہائی حدود تک نہیں پہنچ جاتے۔

مجھے احساس ہے کہ اس قسم کی تعلیم خطرات سے خالی نہیں ہے۔ مجھے احساس ہے کہ یہ طرزِ تعلیم فیصلہ کی قوت میں تو اضافہ کرتی ہے لیکن قوت تخیّل کو کمزور کردیتی ہے۔ اور عورت کو بے جان، سرد اور پارسا تو بنا دیتی ہے مگر اسے محبّت کرنے والی بیوی اور مرد کا پسندیدہ رفیق نہیں بناتی معاشرہ زیادہ پرسکون اور پرامن اور باقاعدہ ہوسکتا ہے لیکن گھریلو زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ مگر یہ تمام ثانوی نوعیّت کی برائیاں ہیں جنہیں اعلےٰ مقاصد کے لئے برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تاریخ کے جس موڑ پر ہم پہونچ چکے ہیں ہمارے لئے کوئی اور چارہ کار نہیں رہا ہے۔ عورتوں کے لئے جمہوری تعلیم اسلئے ضروری ہے کہ اسے جمہوریت کے جلو میں آنے والی خرابیوں اور بے قاعدگیوں سے بچانے کے قابل بنایا جائے۔

امریکہ میں عورت شادی کے بعد اپنی آزادی سے بالکلیہ محروم ہوجاتی ہے۔ اگر غیر شادی شدہ عورت دوسرے ملکوں کی بہ نسبت امریکہ میں زیادہ غیر جانبدار اور آزاد ہے تو شادی شدہ عورت سخت ترین ذمہ داریوں کی پابند ہے۔ غیر شادی شدہ عورت اپنے باپ کے گھر کو آزادی اور مسرّت کا گہوارہ بناتی ہے تو شادی شدہ عورت اپنے شوہر کے گھر میں اسی طرح رہتی ہے جیسے کہ وہ عزلت نشینی کی زندگی بسر کررہی ہے

مگراس کے باوجود زندگی کی یہ دو مختلف حالتیں ایک دوسرے سے اس قدر زیادہ متضاد نہیں ہیں جیسا کہ سمجھا جاتا ہے۔ اور امریکی عورت کے لئے ایک دوسری حالت میں آنے کے لئے پہلی حالت سے گزرنا ضروری ہے۔

مذہبی معاشرے اور تجارتی اقوام شادی کے بارے میں انتہائی سنجیدہ قسم کے تصوّرات رکھتے ہیں۔ مذہبی معاشرے عورت کی زندگی میں باقاعدگی کو اس کے کردار کی پاکیزگی کی بہترین اور یقینی علامت تصوّر کرتے ہیں۔ امریکی بہ یک وقت کٹر مذہبی اور تجارتی قوم ہیں۔ چنانچہ ان کے مذہبی نظریات اور ان کے تجارتی عادات عورت سے ضبط نفس کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ عورت مستقل طور پر اپنی مسرّتوں کو اپنے فرائض پر قربان کر دے۔ اس طرح امریکہ کی بے رحم رائے عامہ انتہائی احتیاط سے عورت کو گھریلو زندگی کی دلچسپی اور فرائض کے دائرہ میں مقید کر دیتی ہے۔ اور اس دائرہ سے باہر قدم رکھنے کی اسے اجازت نہیں دیتی۔

عملی زندگی کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد نوجوان امریکی عورت ہر طرف ان تصوّرات کو کارفرما دیکھتی ہے۔ وہ ان قوانین کو دیکھتی ہے جو ان تصوّرات کا ماخذ ہیں۔ اور اس بات کا فوراً اندازہ کر لیتی ہے کہ وہ اپنے ذہنی سکون، اپنی عزّت اور یہاں تک کہ اپنے سماجی وجود کو خطرہ میں ڈالے بغیر اپنے ہمعصروں کے رسوم اور طریق زندگی سے سر مو انحراف نہیں کر سکتی۔ اور اپنی قوت تفہیم اور اپنی تعلیم کی عطا کردہ جاندار عادات سے وہ اس قسم کی اطاعت کرنے کی قابلیت اپنے آپ میں پیدا کر لیتی ہے۔ اس نے اپنی آزادی کے استعمال کے ذریعہ بغیر کسی کشمکش اور بلا کسی صدائے احتجاج بلند کرنے کے وقت پڑنے پر اس قسم کی اطاعت قبول کرنا سیکھا ہے۔

مگر کوئی امریکی عورت شادی کی بندھنوں میں ایسے گرفتار نہیں ہوتی جیسے کہ اس کی سادگی اور کم علمی سے فائدہ اٹھا کر کسی نے جال میں پھانس لیا ہو۔ اسے پہلے

ہی اس بات کی تربیت دی جاتی ہے کہ اس سے کس بات کی توقع کی جاتی ہے اور رضاکارانہ طور پر اپنی مرضی سے ان قیود کو قبول کرتی ہے۔ وہ اپنے نئے حالات کا ہمت سے مقابلہ کرتی ہے۔ کیونکہ خود اس نے ان کا انتخاب کیا ہے۔ امریکہ میں چونکہ پدرانہ نظم ونسق ڈھیلا ہوتا ہے اور ازدواجی رشتے سخت ہوتے ہیں اس لئے امریکی عورت ازدواجی زندگی کو انتہائی احتیاط اور خوف وخدشات کے ساتھ قبول کرتی ہے۔ امریکہ میں قبل از وقت شادیاں شاذ ونادر ہی ہوتی ہیں۔ امریکی عورتیں اس وقت تک شادی نہیں کرتیں جب تک کہ ان کی سوجھ بوجھ میں پختگی نہ پیدا ہو جائے اس کے برعکس دوسرے ملکوں میں عورت اپنی سمجھ بوجھ میں پختگی شادی کے بعد پیدا کرتی ہے۔

امریکی عورت کی عادات وافعال میں یہ تبدیلیاں محض رائے عامہ کے اثر کا نتیجہ نہیں ہوتیں یہ تبدیلیاں بسا اوقات خود وہ اپنی مرضی اور اپنی کوشش ہی سے لاتی ہے۔ جب شوہر کے انتخاب کرنے کا وقت آتا ہے تو اس کی ابتدائی تعلیم اور اس کی غور وفکر کی عادت امریکی عورت کو یہ سکھاتی ہے کہ آزادی اور آزادروی شادی کی بندھنوں میں ہمیشہ پریشانی کا باعث ہوگی۔ نہ کہ مسرتوں کا۔ اس کی تعلیم اسے سکھاتی ہے کہ لڑکپن کی خوشیاں بیوی کی حیثیت سے باعثِ تفریح نہیں بن سکتیں اور یہ کہ بیوی کی مسرت کا سرچشمہ اس کے شوہر کا گھر ہوتا ہے۔ چونکہ وہ پہلے ہی سے اس شاہراہ سے واقف ہوتی ہے جو کامیاب گھریلو زندگی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اس لئے وہ فوراً اس شاہراہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ اور مڑنے کی خواہش کے بغیر آگے ہی آگے چل جاتی ہے۔

امریکہ کی جواں سال بیویاں اپنے نئے حالات اور سخت فرائض کو بغیر کسی جھنجلاہٹ کے قبول کرنے میں جس قوت اور استقامت کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ وہ اس کی تمام

زندگی میں حاوی رہتی ہے۔ امریکہ میں افراد کی خوشحالی جس قدر آنی جانی چیز ہے۔ اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ لبا اوقات ایک شخص امارت سے غربت کی انتہا یئوں تک پہنچ جاتا ہے۔ امریکی عورت اپنے شوہر کے ان تمام انقلابات اور تغیرات میں خاموشی سے اور نہ ختم ہونے والی توانائی سے ساتھ دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان خواہشوں میں دولت کی کمی کے ساتھ ویسے ہی کمی آجاتی ہے جیسے دولت کی فراوانی میں ان کا پھیلاؤ آتا ہے۔

امریکہ کے مغرب کے گھنے بیابانوں میں نئی زندگی کی تلاش کے لئے ہر سال جو جرأت آزما رخت سفر باندھتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر شمالی اور مشرقی علاقوں میں آباد انگلو امریکی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ مزید دولت اور تموّل کی تلاش میں آگے جاتے ہیں۔ اپنے گھروں میں پہلے ہی آسودہ حال ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بیویوں کو بھی لے جاتے ہیں۔ اور بیویوں کو ان مصیبتوں اور تکلیفوں میں حصّہ دار بناتے ہیں جو اس قسم کی مہموں میں لازمی طور پر پیش آتی ہیں۔ میں لق ودق صحراؤں میں ایسی متعدد نوجوان خواتین سے مل چکا ہوں جن کی نیو انگلینڈ کے شہروں میں اپنے والدین کے گھروں میں عیش اور راحت میں پرورش ہوئی تھی۔ اور جو اپنے دولت کدوں سے سیدھی جنگلوں میں پہنچا دی گئیں۔ بخار اور بیماری تنہائی اور بے زنگ تھکا دینے والی زندگی نے انکی ہمّت کو شکست نہیں دی تھی۔ انکا حسن وجمال سخت کوشی کی زندگی سے متاثر تو ہوا تھا لیکن ان کی نظروں سے عزم واستقلال ٹپکتا تھا۔ وہ بیک وقت غم زدہ اور آہنی ارادے کی مالک نظر آتی تھیں۔ مجھے اس بات میں ذرّہ برابر شبہ نہیں کہ امریکی عورتوں نے یہ غیر معمولی قوّت اور استقامت اپنی جوانی کی تعلیم وتربیّت کے دوران حاصل کی تھی۔ شادی کے بعد بھی امریکی عورت کے ابتدائی دور کے کردار کے اثرات نمایاں رہتے ہیں۔ زندگی میں اس کے کام کی نوعیت بدل گئی ہے۔ اس کی عادات مختلف ہیں۔ لیکن اس کا کردار وہی ہے!

۴۰۔ مساوات اور اخلاقِ عامہ

بعض فلسفیوں اور مورخوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ کسی ملک کی عورتوں کی اخلاقی حالت کی بہتری اور خرابی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ ملک خطِ استوا سے کس قدر قریب یا دور ہے۔ اس مشکل مسئلہ کا حل سب سے زیادہ آسان ہے۔ اور اس کے حل کرنے کیلئے ایک کروی نقشہ (گلوب) اور ایک کمپاس کی ضرورت ہے۔ تاکہ انسانیت کے اس پیچیدہ ترین مسئلہ کو حل کیا جائے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ مادہ پرستوں کا یہ اصول حقیقت سے دور ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں ایک ہی قوم ایک وقت باعصمت اور ایک وقت بدکار رہی ہے۔ ان کے اخلاق میں پاکیزگی اور سختی یا بے راہ روی کا ظاہر ہی انحصار کسی تغیر پذیر امر پر ہوگا۔ محض موسم اور جغرافیائی حالات پر نہیں ہے جو غیر تغیّر پذیر ہوتے ہیں۔ میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ بعض خاص موسمی حالات ایسے ہوتے ہیں جہاں متضاد جنسوں کے افراد کا میل جول ہیجان خیز ہوتا ہے لیکن میری یہ بھی رائے ہے کہ جذبات کی فطری شدّت میں، معاشرتی حالات اور سیاسی اداروں کی وجہ سے کمی یا زیادتی پیدا کی جا سکتی ہے۔

جن لوگوں نے شمالی امریکہ کی سیاحت کی ہے وہ مختلف باتوں میں مختلف الرائے ہو سکتے ہیں۔ لیکن سبھوں کو اس بات پر اتفاق ہے کہ شمالی امریکہ میں بے حد سخت اخلاقی اصول مروّج ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں امریکی اپنے اسلاف یعنی انگریزوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ دونوں ملکوں پر ایک سرسری تقابلی مطالعہ سے اس بات کی حقیقت ثابت ہو سکتی ہے۔

انگلستان میں، یورپ کے اور ملکوں ہی کے مانند، رائے عامہ عورتوں کو ہمیشہ ہدفِ

ملامت بناتی رہتی ہے۔ ملک کے فلسفی اور سیاست دان یہ شکایت کرتے سنائی دیتے ہیں کہ اخلاقی حالت بہتر نہیں ہے۔ اور ملک کے مختلف رسائل، جرائد اور مطبوعات سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ میں تمام کتابیں بشمول ناول، عورت کو ہمیشہ پاکدامن اور عفت مآب تصور کرتی ہیں۔ اور کوئی شخص بہادری اور جرائت کے قصوں کا ذکر ہی نہیں کرتا۔

امریکیوں کی اخلاقی حالت اس کی باقاعدگی میں بلا شبہ اس ملک کی عام خصوصیاتِ نسل اور مذہب کا دخل ہے۔ لیکن یہی عوامل دوسرے ملکوں میں یہی اثر پیدا نہیں کرتے۔ اس لئے اس کی کوئی اور وجہ تلاش کرنا پڑے گی۔ اور میرے خیال میں یہ وجہ مساوات کا اصول ہے۔ اور وہ ادارے ہیں جو اس اصول کی پیداوار ہیں۔ مساوات کے حالات اپنے طور پر اخلاقی حالت کو نہیں سنوارتے۔ لیکن وہ اخلاق کو بہتر بنانے میں مدد دیتے ہیں

اشرافی اقوام میں تموّل اور پیدائش عورت اور مرد کو دو مخصوص حیثیتیں عطا کر دیتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے سے کبھی متحد نہیں ہو سکتے۔ ان کے جذبات دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں۔ لیکن معاشرہ کے حالات اور اس کے پیدا کردہ تصوّرات، ان میں ایک مستقل اور ظاہر رشتہ قائم کرنے کی راہ میں مانع ہوتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اشرافی معاشروں میں عبوری اور پوشیدہ ناجائز تعلقات کی کثرت ہوتی ہے۔ فطرت ان پابندیوں کا خفیہ طور پر انتقام لے لیتی ہے۔ جو انسان کے قوانین نے اس پر عائد کر رکھی ہیں۔

یہ حالت ان معاشروں میں نہیں پیدا ہوتی جہاں مساوات نے انسان کی قائم کردہ ان تمام فصیلوں اور رکاوٹوں کو مسمار کر دیا ہے۔ جو عورت اور مرد کے درمیان حائل ہیں۔ کوئی لڑکی یہ تصوّر نہیں کرتی ہے کہ وہ اس شخص کی بیوی نہیں بن سکے گی جو اسے چاہتا ہے۔ اور اسی بنا پر شادی سے پہلے اخلاقی حدود کو توڑنے

کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی ہے۔ کیونکہ اس کے جذبات خواہ کتنے ہی ناپختہ ہوں وہ مشکل اپنے آپ کو کسی ایسے شخص کا محبوب سمجھنے پر آمادہ ہوگی جو اس سے شادی کرنے پر قادر ہو مختار ہو مگر شادی نہ کرتا ہو۔

ایک ایسے ملک میں جہاں عورت کو اپنی پسند کا حق استعمال کرنے کی آزادی ہو۔ اور جہاں اس کی تعلیم نے اسے صحیح انتخاب کی تربیت بھی دی ہو رائے عامہ کسی عورت کی کسی غلطی کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ اور وہ بڑی بے رحم ہوتی ہے۔ امریکیوں کی سخت گیری جزوی طور پر اسی سبب میں مضمر ہے۔ وہ شادی کو ایک ایسا معاہدہ تصوّر کرتے ہیں جو بے حد مضبوط ہے لیکن جس کی ہر شرط کی تعمیل ہر فریق کے لئے لازمی اور فرض کے مانند ہے۔ کیونکہ فریقین ان شرائط سے پہلے ہی واقف تھے۔ اور انہیں اس بات کی آزادی تھی کہ وہ ایسا معاہدہ نہ کریں۔

اس طرح وہ حالات جو ازدواجی وفاداری کو زیادہ لازمی بناتے ہیں اس وفاداری کو آسان بھی بناتے ہیں۔

اشرافی ملکوں میں شادی کا بڑا مقصد اشخاص کے اتحاد سے زیادہ جائیدادوں کا اتحاد ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ بھی ہوتا ہے کہ شوہر ابھی سکول میں زیر تعلیم ہے اور بیوی آیا کی گود میں ہے لیکن دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیئے جاتے ہیں ۔۔۔ اس قسم کے ازدواجی رشتوں میں جس میں جائیدادیں متحد ہو جاتی ہیں اگر میاں بیوی کے دل متحد نہ ہوں اور ان دونوں کے دل اپنی اپنی الگ راہیں تلاش کریں تو کسی کو حیرت نہ ہونی چاہیئے۔ یہ تو اس "معاہدہ" کی نوعیت کا نتیجہ ہے۔ اور اس کے برعکس اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا انتخاب اپنی مرضی سے کرے۔ اور اسمیں کسی جبر و اکراہ کا دخل نہ ہو تو یہ عام طور پر اتحاد ذوق اور رائے کی یگانگت کا مظہر ہوتا ہے جو عورت اور مرد کو ایک دوسرے کے قریب کرتا ہے۔ اور یہی یکسانیت دونوں کو قریب رکھتی ہے

ہمارے آباؤ اجداد نے شادی کے موضوع پر عجیب و غریب نظریئے قائم کئے تھے۔ انہوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ان کے زمانے میں محبت کی جو چند شادیاں ہوتی تھیں۔ ان کا انجام برا ہوتا تھا۔ اور اس بنا پر انہوں نے یہ نظریہ اخذ کیا کہ شادی کے معاملے میں دل کی آواز سننا غلطی ہے۔ اور انہوں نے حادثہ یا اتفاق کو پسند سے زیادہ بہتر رہنما تصور کیا۔

بہر حال یہ کہ انہوں نے جن مثالوں کو اپنے استدلال کا سہارا بنایا ان سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ کیونکہ جمہوری ممالک اگر عورتوں کو اپنے شوہر کا انتخاب کرنے کی آزادی دیتے ہیں تو وہ عورتوں کو بھی ذہنی طور پر کافی تربیت دیتے ہیں۔ اور ان کی قوتِ ارادی کو مضبوط کر دیتے ہیں تاکہ وہ صحیح انتخاب کر سکیں۔ اس کے برعکس اشرافی معاشروں میں نوجوان عورتیں اپنے باپ کی سرپرستی سے خفیہ طور پر بھاگ کر اپنے آپ ایسے مردوں کے آغوش میں چلی جاتی ہیں۔ جن کو اچھی طرح سے سمجھنے اور پہچاننے کا انہیں نہ موقع ملا اور نہ وہ اس صلاحیت کی حامل تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی عورتیں ان ضمانتوں سے محروم ہوتی ہیں جو جمہوری ملکوں کی عورتوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ یہ امر حیرت انگیز ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی آزادی کو اس وقت غلط استعمال کرتی ہیں جب ان کو پہلی مرتبہ اس کا موقع ملتا ہے۔ اور یہ کہ وہ ایسی بھیانک غلطی کا ارتکاب کرتی ہیں اور جمہوری ملکوں کی عورتوں کی سی تعلیم و تربیت حاصل کئے بغیر وہ جمہوری ملکوں کی عورتوں کے رسم کے مطابق شادیاں رچاتی ہیں۔

اشرافی معاشرہ کے مختلف مدارج اور اختلافات کے باوجود جب کوئی مرد اور عورت شادی کا تہیہ کرتے ہیں تو انہیں بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلے خاندانی وفاداریوں کو توڑنا پڑتا ہے۔ اور اس کے بعد انہیں مروجہ رسوم و رواج اور رائے عامہ کے خلاف بغاوت کرنا پڑتی ہے اور بالفرض محال وہ ان رکاوٹوں پر قابو پا گئے تو وہ اپنے آپ کو اپنے دوستوں،

رشتہ داروں اور اقارب سے بالکل علحدہ یکہ وتنہا پائیں گے۔ اور حالات ان کو ایسے مقام پر پہنچادیں گے جہاں ان کی ہمت و قوت جواب دے جائے گی۔

اب اگر یہ جوڑا جس نے اس طرح شادی کی ہو۔ ابتدا میں ناشاد اور بعد میں مجرمانہ زندگی بسر کرے تو اس بدقسمتی کو آزادیٔ انتخاب پر محمول نہ کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس کی وجہ تو معاشرہ کے ان حالات میں تلاش کرنا چاہیئے۔ جس نے آزادیٔ انتخاب کی اجازت نہیں ہے۔

جمہوری ملکوں میں تمام مرد کسی نہ کسی پیشہ یا کاروبار میں منہمک رہتے ہیں۔ اور اس کے برعکس شوہروں کی محدود آمدنی بیویوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ گھروں کے اندر رہیں اور گھریلو زندگی کے ہر شعبہ کی نگرانی کریں۔ یہ تمام واضح اور لازمی قسم کی مصروفیات ایسی قدرتی رکاوٹیں ہیں جو دونوں جنسوں کو علحدہ علحدہ کرکے، ایک عنفس کو ابھارنے کے مواقع کم کردیتی ہیں۔ اور دوسروں کی مزاحمت کو آسان بناتی ہیں۔

مساوات کے حالات اس میں شک نہیں کہ لوگوں کو ہمیشہ پاک نہیں رکھ سکتے۔ لیکن وہ اخلاق شکنی کو کم خطرناک بناتے ہیں۔ چونکہ اس معاشرہ میں کسی کے پاس نہ اتنا وقت ہوتا ہے اور نہ موقع کہ وہ کسی نیکی پر حملہ آور ہو تو اس کے ساتھ ساتھ پاک باز مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد بھی ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال بعض افراد کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہے۔ لیکن معاشرہ کے ایک بڑے گروہ کو طاقت ور اور چوکس رہنے سے روک نہیں سکتی۔ یہ خاندانی رشتوں کو نہیں توڑ سکتی۔ اور نہ ہی قوم کے کردار اور اخلاق کو کمزور کرتی ہے۔ معاشرہ کو چند لوگوں کی بدکرداری سے خطرہ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اکثریت کے اخلاقی قواعد سے بے اعتنائی کرنے سے قوموں کو خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ قانون ساز کی نگاہ میں قحبہ گری کم خطرناک ہے۔ بہ نسبت سازش اور مکر وفریب کے۔

مساویانہ حالات میں انسان جس قسم کی ہنگامہ خیز اور منہمک زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے وہ نہ صرف جذباتِ محبت سے انسانوں کی توجہ ہٹاتے ہیں بلکہ ایک اور خفیہ لیکن یقینی راہ کے ذریعہ ان کی توجہ نفسیاتی جذبات سے دُور رکھتے ہیں۔ جمہوری معاشرہ میں رہنے والے کم ذہین لوگ صنعتی اور تجارتی طبقات کے طرزِ فکر کو اپناتے ہیں۔ ان کا ذہن ہمیشہ ایسی چیزوں کا متلاشی رہتا ہے جو ٹھوس اور حقیقی ہوں۔ وہ کسی قریبی اور نظر آنے والے مقصد کے لئے کسی نظریہ سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔ اس طرح مساوات کا اصول قوتِ تخیّل کو تباہ نہیں کرتا بلکہ اس کی پرواز کو زمین کی سطح کے قریب کر دیتا ہے۔

جمہوری ملکوں کے شہری خیالی پلاؤ پکانے کے مطلق عادی نہیں ہوتے اور بعض لوگ تو مطلق غور و فکر ہی نہیں کرتے اور نہ وہ دل کی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ لوگ ایسی چیزوں کے حصُول کو بہت اہمیّت دیتے ہیں جو ان کی زندگی کی مسرّت میں اضافہ کریں اور محفوظ کریں۔ لیکن وہ ان باتوں کے پیچھے ہرگز نہیں دوڑیں گے۔ جو ان کی زندگی میں بحران پیدا کریں، اور ان کی مسرّتوں کو کم کریں۔

مجھے احساس ہے کہ یہ تمام باتیں صرف امریکہ پر بھی صادق آتی ہیں۔ یورپ میں پچھلی نصف صدی کے دوران جمہورتیں قائم ہوئیں لیکن جمہوریت نے عورتوں اور مردوں کو پہلے کی بہ نسبت زیادہ پاک باز نہیں بنایا۔ بعض جگہوں میں معاملہ اس کے بالکل برعکس نظر آیا۔ جمہوریت کی ابتداء نے بعض معاشروں کے قدیم اخلاقی قواعد کو پارہ پارہ کر دیا۔

مگر یہاں بھی اس بات کا ذکر ضروری تصوّر کرتا ہوں کہ لوگوں کے اخلاق پر جمہوریت کا اثر اور رجحانات ایک عرصہ کے بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جہاں مساواتی حالات اخلاق کی پاکیزگی پیدا کرنے کے لئے انتہائی سازگار ہوتے ہیں وہیں وہ ہیجان اور ہنگامے جن کے ذریعہ مساوات قائم ہوتی ہے، اخلاق کے لئے نقصان دہ

ہوتے ہیں۔ پچھلی نصف صدی کے دوران فرانس ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ اور اس میں آزادی کم رہی ہے۔ اور ہنگامے زیادہ۔ اس عبوری اور ہنگامی دور میں جبکہ فضا میں ایک ہیجان اور تلاطم ہے اور ہر نظریہ اور اخلاقی اصول کے بارے میں شک و شبہ کا ماحول ہے۔ نیکی اور بدی کا تصور متاثر ہوا ہے۔ مگر ہر انقلاب ابتداء میں یہی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ فرانس میں اخلاقی بگاڑ کی جو اب حالت نظر آتی ہے وہ الگ مستقل کیفیت نہیں ہے۔ اور اس کے آثار ابھی سے دکھائی دینے لگے۔

اشرافی طبقات سے طاقت چھن جانے کے بعد اس کے پاس دولت رہ جائے۔ تو اس سے زیادہ بدکردار طبقات اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ چونکہ ان کے پاس دولت اور وقت بے حد ہوتا ہے۔ اس لئے وہ مکروہ مشاغل میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ پچھلی صدی کا فرانسیسی اشرافیہ انتہائی بدکار تھا لیکن مسلّمہ عادات اور قدیم رسوم نے معاشرہ کے دوسرے طبقات میں اخلاق کا احترام باقی رکھا تھا۔ اور نہ ہی کوئی اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ اس اشرافیہ کے بچے کھچے لوگ موجودہ زمانے میں سخت اخلاقی اصولوں کے پابند ہیں اور اخلاق کی باگیں متوسط طبقہ اور ادنیٰ طبقہ میں ڈھیلی ہیں۔ ایسے خاندان جو پچاس برس پہلے آوارہ اور بدقماش تھے آج اعلیٰ کردار کا نمونہ بنے ہوئے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت نے ان کے کردار کو مستحکم بنا دیا ہے۔ انقلابِ فرانس نے امراء کی جائیداد کو تقسیم کر کے امراء کی توجہات کو صرف اپنے خاندان کے مسائل پر مرتکز کر کے اور انہیں اپنے بال بچوں کے ساتھ ایک ہی چھت کے تلے رہنے پر مجبور کر کے اور ان کے ذہنوں کو سنجیدہ تر بنا کر ان میں ایک مذہبیت پیدا کی اور امن و سکون و نظم و ضبط سے وابستگی پیدا کی ہے۔ اس کے برعکس ساری قوم جس نے اشرافیہ کا تختہ الٹنے کے لئے کامیابی سے جدوجہد کی اپنی کامیابی کے نشہ میں مغلوب ہو گئی۔

۴۱- امریکی اور جنسی مساوات

میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جمہوریت کس طرح اس عدم مساوات کو تباہ کرتی ہے یا نرم کرتی ہے جو معاشرہ میں پیدا ہوتی ہے۔ مگر بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی سوال یہ ہے کہ امریکیوں کی یہ کوشش عورت اور مرد کے اس فطری فرق کو بھی ختم کر دے گی جو صدہا سال سے قائم ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ سماجی تبدیلیاں جو باپ بیٹے کو، آقا اور ملازم اور برتر و کمتر کو ایک سطح پر لاتی ہیں عورت کے مرتبہ کو اوپر لے جائیں گی اور اسے مرد کے قریب کر دیں گی۔ لیکن یہاں میں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں تاکہ کسی قسم کی غلطی کا احتمال نہ رہے۔

یورپ میں اکثر لوگ ایسے ملیں گے جو عورت اور مرد کی مختلف خصوصیات میں امتیاز نہ کر سکنے کی بنا پر . . . . عورت اور مرد کو نہ صرف مساوی بلکہ ایک جیسا تصوّر کریں گے۔ ان کے تصوّر میں دونوں کے ایک ہی قسم کے فرائض ہوں گے دونوں کے ایک ہی قسم کے حقوق ہوں گے۔ دونوں کو ہر جگہ گڈ مڈ کر دیں گے۔ اس قسم کی کوشش سے دونوں جنسوں کی توہین ہوتی ہے۔ اور فطرت کے کام میں اس طرح دخل اندازی کرنے سے اس کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا کہ کمزور مرد اور غیر منظم عورتیں پیدا ہوں گی۔

امریکی کے نزدیک عورت اور مرد کے مساوات کا یہ تصوّر نہیں ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ چونکہ فطرت نے مرد اور عورت کے درمیان طبعی اور اخلاقی طور پر زبردست فرق رکھا ہے اس لئے فطرت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عورت کی مختلف

صلاحیتوں کا بہترین طور پر استعمال کیا جائے۔ اور ان کا یہ ادعا ہے کہ ترقی کے معنے یہ نہیں کہ مختلف النوع چیزوں کو یکساں قسم کے کام کرنے پر مجبور کیا جائے۔ بلکہ ترقی کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو اس کے اپنے متعینہ طریقوں کے مطابق بہترین طریقے پر انجام دینے کا موقع دیا جائے۔ امریکیوں نے دونوں جنسوں میں اس عظیم معیشی نظریہ کا اطلاق کیا ہے۔ جو ہمارے دور کی صنعتوں میں رائج ہے یعنی یہ کہ انہوں نے عورتوں اور مردوں کے فرائض احتیاط سے تقسیم کر دیئے ہیں۔ تاکہ معاشرہ کا کام بہتر طور پر انجام پا سکے۔

دنیا کے کسی ملک میں امریکہ کی طرح مردوں اور عورتوں کے عمل کے لئے علیحدہ علیحدہ اور واضح رستے مقرر نہیں کئے گئے۔ تاکہ دونوں مختلف راہوں پر شانہ بشانہ ترقی کر سکیں۔ امریکی عورت خاندان کے بیرونی معاملات میں مطلق حصّہ نہیں لیتی۔ نہ وہ کاروبار کرتی ہے اور نہ سیاسی زندگی میں حصّہ لیتی ہے۔ نہ ہی اسے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ کھیتوں میں سخت کام کرے۔ امریکہ میں کوئی خاندان ایسا غریب نہیں ہے کہ وہ عورت کو اس قسم کی مشقت پر مجبور کرے۔ اگر امریکی عورت اپنی گھریلو زندگی کے خاموش دائرہ سے فرار حاصل نہیں کر سکتی تو دوسری طرف اس کو اس دائرہ سے باہر نکلنے پر مجبور نہیں کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی عورت جو بسا اوقات سمجھ بوجھ اور توانائی میں مردانہ طاقت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ نسوانی نزاکت کو برقرار رکھتی ہے اور ہمیشہ نسوانی آداب کو قائم رکھتی ہے۔ اگرچہ بعض وقت وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ان کا دل اور دماغ مردوں کا سا ہے۔

اور نہ ہی امریکیوں نے کبھی یہ فرض کیا ہے کہ جمہوری اصولوں کا نتیجہ ازدواجی طاقت کے انتشار میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ یا خاندان کی فطری حاکمیت کو ختم کرتا ہے ان کا نظریہ ہے کہ ہر انجمن کا ایک صدر ہوتا ہے۔ اور ازدواجی اتحاد کا فطری صدر

شوہر ہوتا ہے۔ اس لئے وہ مرد کو اپنے رفیق حیات کی ہدایت اور نگرانی کے حق سے محروم نہیں کرتے۔ اور ان کا یہ بھی استدلال ہے کہ شوہر اور بیوی کی چھوٹی انجمن میں اور ساتھ ہی معاشرہ میں، جمہوریت کا مقصد ان طاقتوں کو قانون کا پابند بنانا ہوتا ہے جو ضروری ہوتے ہیں۔ اور جمہوریت کا مقصد طاقت کو ہی ختم کرنا نہیں ہوتا۔

یہ رائے صرف ایک جنس کی ہی نہیں ہے۔ میں نے امریکہ میں کسی عورت کو یہ کہتے نہیں سنا کہ ازدواجی حاکمیت سے ان کے حقوق غصب ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی وہ شوہر کی حاکمیت قبول کرنے پر ذلت محسوس کرتی ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں مرد عورتوں کی جس فیاضی سے تعریفیں کیا کرتے ہیں ان میں ایک تضحیک اور حقارت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگرچہ ایک یورپی بظاہر عورت کا غلام دکھائی دیتا ہے لیکن وہ کبھی عورت کو اپنے مساوی تصوّر نہیں کرتا۔ امریکہ میں مرد شاید ہی عورت کی تعریف کریں۔ لیکن وہ اپنی روزمرہ زندگی میں یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ وہ عورت کو کس قدر عزّت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ عام طور پر عورت کی سمجھ بوجھ میں اپنے کامل اتحاد کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کی آزادی کا احترام کرتے ہیں۔ اور وہ سمجھتے ہیں کہ عورت کا ذہن بھی حقیقت کو تلاش کرنے کے لئے مرد ہی کی طرح موزوں ہے اور انہوں نے اس کی نیکی کو کبھی بھی تعصب، جہالت یا خوف کے تابع کرنے کی کوشش نہیں کی۔

یورپ میں جہاں مرد آسانی سے عورت کی مستبدانہ حکمرانی کے آگے سر تسلیم خم کرتے نظر آتے ہیں، عورتیں بعض ایسے انسانی اوصاف سے محروم ہیں۔ جو ان کا سرمایہ افتخار بن سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ دلکش تصوّر کی جاتی ہیں لیکن انہیں ناقص العقل تصوّر کیا جاتا ہے اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ خود عورتیں بھی اپنے آپ کو اسی نظر سے دیکھتی ہیں۔ اور اسی بات کو قابلِ فخر تصوّر کرتی ہیں کہ وہ کمزور، احمق، بےکار محض دکھائی دیں۔ امریکہ میں کوئی

عورت اس قسم کی مراعات کی طلبگار نہیں ہوگی۔

دوسری بات یہ کہ یورپی معاشرہ میں ہم نے مردوں کے لئے بعض عجیب وغریب قانونی رعائتیں دے رکھی ہیں۔ ایک خاص قسم کی نیکی مرد کے اپنے استعمال کے لئے ہوتی ہے اور ان کی رفیقۂ حیات کے لئے نیکی کا الگ پیمانہ ہوتا ہے۔ اور رائے عامہ کے مطابق ایک قسم کا فعل کسی کے لئے جرم کے طور پر قابل سزا ہوتا تو دوسرے کے لئے محض ایک معمولی سی خطا قرار دیا جاتا ہے۔ امریکی اس قسم کی تفریق کے قائل نہیں۔ اغوا کرنے والا اسی قدر قابلِ نفرت و ملامت ہوتا ہے جیسی کہ مغویہ۔

یہ درست ہے کہ امریکی عورتوں پر وہ فیاضانہ توجہ نہیں دیتے جس کا مظاہرہ یورپ کے مرد کرتے ہیں۔ مگر ان کے طرز عمل میں یہ بات مضمر ہوتی ہے کہ وہ عورتوں کو نیک پارسا اور مہذب تصوّر کرتے ہیں۔ عورت کی اخلاقی آزادی کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے عورتوں کی موجودگی میں انتہائی محتاط زبان استعمال کرتے ہیں، کہیں کوئی بات اس کے ناگوار خاطر نہ گزرے۔ امریکہ میں ایک غیر شادی شدہ عورت تن تنہا بلا کسی خوف کے بڑے سے بڑے سفر پر جا سکتی ہے۔

امریکہ کے قانون سازوں نے جنہوں نے تمام جرائم کی سزا کم کر دی ہے زنا بالجبر کی سزا موت رکھی ہے اور کسی اور جرائم کو رائے عامہ اس قدر بے رحمی سے نہیں دیکھتی، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکی عورت کی عزّت سے زیادہ کسی اور شے کو قیمتی تصوّر نہیں کرتے، اور ہر اس شے کو مقدم سمجھتے ہیں جس سے اس کی آزادی کا احترام ہوتا ہو۔ اور اس لئے وہ ایسے جرم کو بھیانک ترین جرم سمجھتے ہیں جو عورت کی آزادی اور عزّت پر اس کی مرضی کے بغیر حملہ آور ہو۔ فرانس میں جہاں اس جرم کی سزا امریکہ سے کہیں زیادہ نرم ہے، مجرم کے خلاف جیوری کا فیصلہ حاصل کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ آیا یہ شائستگی کی توہین ہے یا عورت کی؟ میرا خیال ہے دونوں کی۔

غرض یہ کہ امریکی عورتوں اور مردوں کے فرائض اور ذمہ داریوں میں فرق کرتے ہیں لیکن وہ دونوں کے فرائض کا مساویانہ احترام کرتے ہیں۔ اور دونوں کو مساوی طور پر اہم تصور کرتے ہیں۔ وہ عورت کی ہمت اور شجاعت کو وہ شکل نہیں دیتے جو مردوں کے لئے مخصوص ہے لیکن وہ عورت کی شجاعت پر شبہ نہیں کریں گے۔ غرض یہ کہ انہوں نے جہاں عورتوں کے سماجی احساسِ کمتری کو کم کیا ہے۔ وہیں انہوں نے عورت کو اخلاقی اور ذہنی طور پر مرد کی سطح پر لانے کے لئے ہر ممکن مساعی انجام دی ہیں۔ اور اس بارے میں انہوں نے جمہوری ترقی کے اصولوں کو اچھی طرح پر سمجھا ہے۔

میں یہ بانگِ دہل اعلان کرنے میں ذرہ برابر نہیں ہچکچاؤں گا کہ اگرچہ امریکہ میں عورت کی زندگی اس کے گھریلو دائرہ میں محدود ہے اور بڑی حد تک مرد کی محتاج ہے لیکن میں نے دنیا کے کسی خطہ میں عورت کے مقام کو اس قدر بلند نہیں پایا۔ اور اگر مجھ سے کوئی دریافت کرے کہ امریکہ کی خوشحالی اور ترقی پذیری کی کوئی واحد وجہ کیا ہوسکتی ہے تو میں جواب دوں گا۔ یہ عورت کی برتری ہے۔

۴۲- اصول مساوات اور گروہ بندیاں

یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ جمہوری اداروں کا لازمی اور آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کے تمام لوگ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ اور ہر ایک شخص یکساں طریقہ پر زندگی بسر کرے۔ مساوات کو اس کی انتہائی، بھونڈی اور مستبدانہ شکل میں پیش کرنے کے مترادف ہے۔ معاشرہ کا کوئی قانون یا معاشرہ کی حالت لوگوں کی حالت کو یکساں نہیں بنا سکتی، کیونکہ تعلیم دولت، پیشہ اور مذاق ان میں کچھ نہ کچھ فرق پیدا کر دیں گے اگرچہ وقتاً فوقتاً کچھ لوگ ایک ہی غرض کی خاطر اپنی مساعی میں اشتراک کرنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن وہ اس قسم کے اشتراک کو اپنے لئے باعث تفریح نہیں بنائیں گے۔ ان کا رجحان ہمیشہ یہی رہے گا کہ قانون کے اثر سے بچ نکلیں، اور ان حدود سے باہر نکلنے کی کوشش کریں جن میں قانون ساز انہیں مقید رکھنا چاہتا ہے چنانچہ بڑے سیاسی معاشرہ کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی نجی سوسائٹیاں قائم کریں گے۔

امریکہ میں کوئی شہری کسی دوسرے شہری پر امتیاز یا تفوق نہیں رکھتا۔ کوئی کسی کا نہ تو اطاعت شعار ہے اور نہ کسی کا کسی کو احترام لازم ہے۔ وہ سب انصاف رسانی کے لئے، کاروبارِ مملکت چلانے کے لئے، اور مشترکہ بہبود کے مسائل کو نمٹانے کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے کسی کو یہ کوشش کرتے نہیں دیکھا کہ سب لوگوں کو ایک ہی راہ پر چلایا جائے۔ اور اس بات پر مجبور کیا جائے کہ سب لوگ ایک ہی قسم کی تفریح سے لطف اندوز ہوں۔

امریکی سیاسی محفلوں اور عدالت ہائے انصاف میں تو ایک دوسرے سے آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ ملتے جلتے ہیں، لیکن اپنی نجی زندگی کی مسرتوں سے لطف اٹھانے کے لئے وہ بڑی احتیاط سے اپنی حلقہ بندی کر لیتے ہیں۔ ہر شخص اپنے ہم وطنوں کو اپنا مساوی تصور کرتا ہے لیکن وہ لوگوں کی بے حد مختصر تعداد کو اپنا دوست بناتا اور مہمان کی حیثیت سے قبول کرتا ہے

مجھے یہ بات فطری معلوم ہوتی ہے۔ جس تناسب سے اجتماعی زندگی میں وسعت پیدا ہوگی، نجی زندگی اور انفرادی روابط کا دائرہ سکڑے گا۔ اسلئے یہ تصوّر کرنا غلطی ہے کہ جدید معاشرے بالکلیہ مشترکہ زندگی بسر کریں گے۔ اسکے برعکس میرا تو خیال ہے کہ بالآخر جمہوری معاشروں میں چھوٹے چھوٹے گروہ بنجائیں گے۔

اشرافی اقوام میں مختلف طبقات بڑے بڑے دائروں کے مانند ہوتے ہیں جن سے باہر نکلنا اور جن میں داخل ہونا ناممکن ہوتا ہے۔ ان طبقات میں باہمی ربط نہیں ہوتا۔ لیکن ہر طبقہ کے اندر لوگوں میں باہمی ربط قائم رہتا ہے۔

مگر جب قانون اور رسوم لوگوں کے درمیان باہمی تعلقات کے بارے میں کوئی طریقہ کار مقرر نہیں کرتے تو ان میں باہمی ربط ان کے حالات میں اتفاقی یکسانیت یا ذوق اور خیال کی ہم آہنگی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے نجی سوسائٹیاں مختلف النوع ہوتی ہیں۔ جمہوری معاشروں میں جہاں افراد کے درمیان سماجی فرق زیادہ نہیں ہوتا، مصنوعی حدِ فاصل قائم کئے جاتے ہیں جن کے ذریعہ ایک فرد اپنے آپ کو علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کہیں اس بڑے دھارے میں بہتا چلا نہ جائے۔

اور اس بات کا وقوع پذیر ہونا فطری اور لازمی ہے۔ کیونکہ انسانی ادارے تو بدل دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن انسان کی فطرت کو نہیں بدلا جا سکتا۔ معاشرہ کے عام قوانین افراد کو مساوی بنانے اور یکساں سطح پر لانے کی خواہ کتنی کوشش کیوں نہ کریں۔ فرد کا ذاتی تفخر اسے ہمیشہ عام سطح سے بلند رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اور کسی نہ کسی جگہ وہ اپنے فائدہ کے مطابق عدم مساوات قائم کرے گا۔

اشرافی ملکوں میں لوگوں کے درمیان اونچی اونچی اور مستقل فصیلیں قائم رہتی ہیں۔ جمہوری ملکوں میں لوگ غیر مرئی اور کمزور دھاگوں سے بندھے ہوتے ہیں جو وقتاً فوقتاً ٹوٹتے رہتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ مساوات نے خواہ کسی قدر ترقی کی ہو جمہوری ملکوں میں متعدد نجی انجمنیں قائم ہوتی رہیں گی۔ لیکن ان میں سے کوئی انجمن اشرافی ملکوں کے اعلےٰ طبقات کے مشابہ نہیں ہوگی۔

۴۴- امریکیوں کے طرزِ معاشرت کے بارے میں چند تاثرات

بنظرِ ظاہر انسانوں کے عمل و فعل کی ظاہر شکل کوئی زیادہ اہمیت کی حامل بات نہیں معلوم ہوتی لیکن انسان سب سے زیادہ اسی چیز کو اہمیت دیتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو ایسے معاشرہ میں رہنا پڑے جس کے آداب اور اطوار مختلف ہوں تو ایسا شخص ہر چیز کا عادی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس معاشرہ کے آداب اور اطوار کا عادی نہیں بن سکتا۔ اس لئے اس بات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے کہ کسی ملک کے سماجی اور سیاسی حالات اس ملک کے باشندوں کے طرزِ معاشرت پر کیا اثر ڈالتے ہیں۔

آداب اور طرزِ معاشرت عام طور پر کردار کی پیداوار ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی وہ چند لوگوں کے مقرر کردہ رسوم اور قوانین کا بھی نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ فطری بھی ہیں اور اکتسابی بھی۔

جب چند لوگ بزعمِ خود یہ تصوّر کر لیں کہ وہ معاشرہ کی بلند ترین شخصیتیں ہیں۔ اور جب ایسے لوگ بڑے بڑے مقاصد کے حصول کی تگ و دو میں ہوں اور چھوٹی باتوں کے لئے دوسروں کو چھوڑ دیں ۔۔۔ اور جب وہ ایسی دولت، دتمول میں کھیل رہے ہیں جسے نہ انہوں نے جمع کیا اور نہ جس کے کھوئے جانے کا ڈر ہے تو یہ بات لازمی ہے کہ زندگی کی عملی الجھنوں اور چھوٹی چھوٹی دقتوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھیں اور نتیجتاً ان کا تخیّل بھی فطری طور پر بلند ہوتا ہے۔ جسے ان کی زبان اور طرزِ معاشرت اور بلند کر دیتی ہے۔

جمہوری ملکوں میں طرزِ معاشرت میں وقار اور دبدبہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ لوگوں کی انفرادی زندگیاں معمولی ہوتی ہیں اور فکر کی سطح بھی نیچی ہوتی ہے۔ کیونکہ انسانی ذہن کو اپنی گھریلو

زندگی کی فکروں اور الجھنوں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔

طرزِ معاشرت میں حقیقی عظمت اس بات میں مضمر ہوتی ہے کہ کسی شخص کی موزوں اور ٹھیک ٹھیک حیثیت متعین کی جائے۔ جو نہ تو بہت بلند ہو اور نہ ہی نیچے۔ اور اس طرح اس تک شاہ اور رعایا دونوں کی رسائی ہو سکتی ہو۔ جمہوری ملکوں میں مراتبہ اور مقام حالتِ شک میں رہتا ہے۔ اس لئے جمہوری ملکوں کے لوگوں کے آداب، جن میں بعض اوقات غرور اور تمکنت تو ہوتا ہے عظمت سے خالی ہوتے ہیں۔

جمہوریت میں رہنے والے لوگوں کی قسمتیں آئے دن تغیر پذیر رہتی ہیں۔ اس لئے ان میں ایسے مستقل لوگوں کی معتد بہ تعداد نہیں رہتی جو طرزِ معاشرت اور آدابِ زندگی کے قاعدے مقرر کرے۔ اور لوگوں کو ان کی تعمیل پر مجبور کرے۔ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتا ہے اور کسی ایک دور میں بھی متعدد لوگوں کے آداب میں کوئی ربط اور تسلسل نہیں رہتا ہے۔ کیونکہ آزاد سماجی رویہ اور آداب ان کے شخصی جذبات اور تصورات پر مبنی ہوتا ہے۔ اور یہ صورت حال بطورِ خاص اس وقت نمایاں رہتی ہے جب کہ اشرافی معاشرہ کا تختہ ابھی ابھی الٹ دیا گیا ہو۔۔۔۔ نئے نئے سیاسی ادارے اور سماجی تبدیلیاں تمام لوگوں کو تفریح کے ایک قسم کے مقامات پر اکٹھا کرتی ہیں اور اکثر اوقات ایسے لوگوں کو جن کی تعلیم اور عادات بالکلیہ مختلف ہیں یکجا رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ایسی صورت حال میں معاشرہ کی بے رنگی کیفیت بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو یہ یاد تو رہتا ہے کہ اچھے آداب کا ایک ضابطہ پہلے موجود تھا۔ لیکن لوگ یہ بھلا دیتے ہیں کہ اس ضابطہ میں کیا تھا۔ اور کہاں سے مل سکتا ہے، آدابِ زندگی کو فراموش کر دینے کے بعد وہ طے کر نہیں پاتے کہ اس کے بغیر کیا کیا جائے۔ چنانچہ ہر شخص بچے کھچے پرانے رسوم کو لے کر اپنے طور پر من مانے اور ہر لمحہ تغیر پذیر قاعدے بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ ان آدابِ معاشرت میں نہ وہ باقاعدگی ہوتی ہے اور

نہ وقار جو اشرافی معاشروں کی خصوصیت ہے۔ اور نہ ان میں آزادی ہوتی ہے اور نہ سادگی جو جمہوری ملکوں کا طرزِ معاشرت اختیار کرتا ہے۔

لیکن یہ صورتِ حال مستقل نہیں ہوتی۔ جب مساوات پورے طور پر قائم ہو جاتی ہے اور اس کی حکمرانی کو ایک طویل عرصہ گزر جاتا ہے اور جب لوگوں کے تصورات میں قریب قریب یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر لوگوں کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ ہر مسئلہ پر ایک دوسرے سے اختلاف کریں۔ یا ایک دوسرے کی نقالی کریں۔ ایسی صورتِ حال میں ان کے طرزِ معاشرت میں اوپر اوپر معمولی فرق تو باقی رہتا ہے۔ لیکن یہ فرق زیادہ نہیں ہوتا۔ ان کے آداب یکساں نہیں ہوتے اس لئے کہ وہ ایک نمونے کی نقل نہیں ہوتے۔ لیکن ان میں بے حد بُعد بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ان کے سماجی حالات یکساں ہوتے ہیں۔ پہلی نظر میں امریکیوں کا طرزِ معاشرت یکساں ہی دکھائی دے گا۔ لیکن جب اس کا قریب سے مطالعہ کیا جائے تو ان خصوصیات کا پتہ چلے گا جو مختلف امریکیوں کے طرزِ معاشرت میں امتیاز پیدا کرتی ہیں۔

انگریز امریکیوں کے طرزِ معاشرت کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن جن انگریز ادیبوں نے امریکیوں کے طرزِ معاشرت کا مذاق اُڑایا ہے۔ انگلستان کے متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور انگلستان کے متوسط طبقہ کی بھی وہی حالت ہے جس کا ذکر انہوں نے امریکیوں کے طرزِ معاشرت میں کیا ہے۔ اس طرح امریکن طرزِ معاشرت کے ان بے رحم نقادوں نے امریکی طرزِ معاشرت کو موضوعِ مذاق بناتے ہوئے خود اپنے معاشرے کی تصویر اتار دی ہے۔ انہیں اس کا خیال تک نہ آیا کہ وہ اپنے آپ کو ہدفِ تمسخر بنا کر اپنے ملک کے اشرافی طبقوں کے لئے سامانِ تفریح مہیا کر رہے ہیں۔

میں یہ تسلیم نہیں کروں گا کہ جمہوری قوموں کے آداب میں کوئی بات قابلِ ستائش

نہیں ہے۔

اشرافی اقوام میں اعلیٰ طبقات کے قریب تر جو لوگ رہتے ہیں وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو اعلیٰ طبقات کے مشابہہ ہی ظاہر کریں۔ جس کی وجہ سے لبسا اوقات مضحکہ خیز صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ جمہوری ملکوں میں لوگوں کے لئے طرز معاشرت کے اعلےٰ نمونے نہیں ہوتے۔ لیکن روزمرّہ زندگی میں انہیں ان کی مسخ شدہ نقالی کو بھی دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ جمہوری ملکوں میں آداب میں اشرافی ملکوں کی سی شائستگی نہیں ہوتی۔ لیکن ان کے آداب بھونڈے اور ناشائستہ بھی نہیں ہوتے۔ جمہوری ملکوں میں نہ تو عوام کی گالی گلوچ والی زبان سنائی دے گی اور نہ امراد کے پرشکوہ فقرے۔ جمہوری ملکوں کے آداب عام طور پر عامیانہ ہوتے ہیں لیکن ان میں درندگی نہیں ہوتی۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ جمہوری ملکوں میں اچھے آداب اور طرزِ معاشرت کے کوئی مستقل ضابطے نہیں ہوا کرتے۔ اس کے کچھ نقصانات بھی ہیں اور کچھ فائدے بھی۔ اشرافی ملکوں میں برتر طبقہ کے قانون اور اطوارِ معاشرت ہر ایک پر مسلّط کئے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ کے تمام افراد اپنے نجی رجحانات کے باوجود ایک ہی جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ اشرافی آداب اصل آدمی کو چھپا کر اس کی تزئین کرتے ہیں۔ جمہوری ملکوں میں نہ آداب کی ایسی تزئین ہوتی ہے اور نہ ان میں یکسانیت۔ لیکن وہ خلوص پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان ملکوں میں آداب ایک ایسے مہین اور ڈھیلے نقاب کے مانند ہوتے ہیں جن کے اندر سے کسی فرد کے ذاتی جذبات و احساسات کو آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے جمہوریت کا مقصد لوگوں کو کوئی خاص آداب معاشرت دینا نہیں ہے بلکہ انہیں اس قسم کے آداب اختیار کرنے سے روکنا ہے۔

اشرافی معاشرہ کے احساسات، جذبات، نیکیاں، برائیاں بعض اوقات جمہوری معاشرہ میں بھی ظاہر ہو سکتی ہیں لیکن اس کے آداب نہیں ظاہر ہو سکتے۔ وہ جمہوری انقلاب کی تکمیل کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح جمہوری قوم میں نہ صرف یہ کہ اشرافی آداب نشوونما ہی نہیں پا سکتے بلکہ جمہوری لوگ اشرافی آداب کو نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کی خواہش کرتے ہیں۔

مجھے یہ احساس ہے کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اچھے خاندانوں اور بہترین طرزِ معاشرت کے حامل لوگوں نے کمینگی کے جذبات کا مظاہرہ کیا ہے۔ درباروں کی شان و شوکت اور ریاکاریوں نے ثابت کر دیا ہے کہ ذلالت اور کمینگی کو کس طرح چھپایا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اشرافیہ کے آداب بذاتِ خود "نیکی مجسم" نہیں ہیں۔ لیکن وہ بسا اوقات "نیکی" کیلئے باعثِ زینت ہوتے ہیں۔

۴۴ - امریکنوں کا قومی غرور

تمام آزاد قومیں مغرور اور خود نما ہوتی ہیں - لیکن ہر قوم اپنے قومی فخر کا مظاہرہ یکساں انداز میں نہیں کرتی - اجنبیوں سے بات چیت کے دوران ایک امریکی معمولی معمولی سی تنقید پر بے چینی کا اظہار کرے گا اور جتنی بھی تعریف کی جائے اس کے جذبہ کی تسکین نہ ہوگی - وہ معمولی سی مدح و ثنا کو پسند تو کرے گا لیکن جتنی بھی تعریف کی جائے اس سے مطمئن نہ ہوگا - وہ آپ سے اپنے ملک کی تعریف اگلوانے کے لیے انتھک کوشش کرے گا - اور اگر آپ نے اس کی مزاحمت کی تو وہ اپنی تعریف آپ کرنے لگے گا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں ہے - جس کی بنا پر وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے کارنامے لوگوں کی آنکھوں میں رہیں اور داد تحسین حاصل کریں - اس کی خود نمائی میں نہ صرف حرص ہے بلکہ وہ بے چین اور حاسد بھی ہے امریکی کا جذبۂ خود نمائی اس قدر زیادہ ہے کہ وہ خود تو اوروں کو کچھ نہیں دیتا لیکن اوروں سے ہر چیز کا مطالبہ کرتا ہے - نہ صرف مطالبہ کرتا ہے بلکہ وہ اس کے لیے بعض وقت التجا بھی کرتا ہے اور لڑنے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے -

اگر میں کسی امریکی سے یہ کہوں کہ اس کا ملک بڑا اچھا ہے - تو وہ فوری جواب دے گا - "ہاں دنیا میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے" اگر میں اس آزادی کی تعریف کروں - جس سے امریکہ کے باشندے لطف اندوز ہوتے ہیں تو وہ کہہ اٹھے گا - "آزادی اچھی شے تو ہے - لیکن دنیا میں چند ہی اقوام اس سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہیں" اگر میں امریکہ میں قابل ستائش اخلاقی حالت کا

ذکر کروں گا۔ تو وہ بول اٹھے گا ۔" ہاں میں ایک ایسے اجنبی کے حیرت و استعجاب کو سمجھ سکتا ہوں ۔ جس نے دوسرے ملکوں میں بداخلاقی اور بدکرداری کا مشاہدہ کیا ہے ۔ اسے امریکہ کی حالت کو دیکھ کر متعجب ہونا چاہیئے ۔" اب اگر میں تنگ آکر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دوں تو وہ میرا پیچھا نہ چھوڑے گا ۔ اور وہ خود حملہ آور ہوگا اور وہی باتیں دہرائے گا ۔ جن کا میں نے ذکر کیا ہے ۔ امریکیوں سے زیادہ کسی قوم کا حب وطن اس قدر جھگڑالو اور کٹ حجت نہیں ہے ۔ یہ ان لوگوں کو بھی اکتا دیتا ہے جو امریکہ کے ثنا خواں ہیں ۔

انگریز کا معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ انگریز خاموشی سے اپنے حقیقی یا خیالی فائدوں سے لطف اندوز ہوتا ہے ۔ جو اس کے نقطہ نظر سے اس کے ملک میں موجود ہیں ۔ اگر وہ کسی دوسری قوم کو کچھ نہیں دیتا ۔ تو وہ کسی سے کسی شے کا مطالبہ بھی نہیں کرتا ہے ۔ غیر ملکیوں کی تنقید اسے متاثر نہیں کرتی اور نہ ان کی تعریف سے وہ خوش ہوتا ہے ۔ وہ باقی دنیا پر ایک متکبرانہ نظر ڈالتا ہے ۔ اس کے قومی تفاخر کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے ۔ وہ خودبخود پرورش اور نشوونما پاتا ہے ۔ یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے کہ ان دونوں قوموں کے احساسات میں کس قدر تضاد ہے ، حالانکہ دونوں کا تعلق ایک ہی نسل سے ہے

اشرافی معاشروں میں ، بڑوں کے پاس بے پناہ اختیارات اور مراعات ہوتے ہیں جو ان کے جذبۂ تفخر کی اساس ہوتے ہیں ۔ انھیں چھوٹے چھوٹے فائدوں کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ چونکہ یہ اختیارات اور حقوق انھیں ورثہ میں حاصل ہوتے ہیں اس لیے وہ انھیں اپنی ذات ہی کا ایک حصہ تصور کرتے ہیں اور اسی لیے وہ ایک خاموش احساس برتری کے حامل ہوتے ہیں ۔ وہ خودنمائی پر مبنی اختیارات اور حقوق کا خواب نہیں دیکھتے ۔ کیونکہ ان کے اپنے معاشرہ میں ہر شخص

ان کے اس اختیار کو تسلیم کرتا ہے۔ ان کی عظمت میں کوئی شریک نہیں ہوتا اور انھیں یقین رہتا ہے کہ ان کی کوشش کے بغیر دنیا کی نظروں میں اور کوئی شخص انھیں ان کے مقام سے ہٹانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اشرافیہ جب امورِ مملکت سرانجام دیتا ہے۔ تو اس کے قومی تفخّر میں بھی وہی لاتعلقی اور شانِ بے نیازی پیدا ہوتی ہے اور ساری قوم اس کی نقّالی کرتی ہے۔

اس کے برعکس جب سماجی حالات میں یکسانیت سی ہو تو معمولی معمولی حقوق اور مراعات کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر شخص جب یہ دیکھتا ہے کہ اس کے اِردگرد لاکھوں لوگ ایک ہی قسم کی آسائشوں اور فائدوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں تو اس کے جذبۂ خود نمائی کو دھکا لگتا ہے۔ اور رشک کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ وہ معمولی معمولی چیزوں سے چمٹ جاتا ہے اور ان کی پرزور مدافعت کرتا ہے۔ جمہوری ملکوں میں، جہاں تموّل اور خوشحالی میں پائداری نہیں ہے اور اکثر لوگ نَو دولتے ہوتے ہیں۔ لوگ نمود و نمائش زیادہ کرتے ہیں۔ چونکہ انھیں خدشہ رہتا ہے کہ وہ ان فائدوں سے محروم ہو جائیں گے۔ اس لیے انھیں اس بات کا زیادہ خیال رہتا ہے کہ لوگوں کو بتائیں کہ ابھی وہ چیزیں ان کے پاس ہی ہیں۔ جمہوریت میں رہنے والے لوگ اپنے ملک سے اسی طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اپنی ذات سے اور اپنی ذاتی خود نمائی کی عادت کو قومی تفخّر میں منتقل کر دیتے ہیں۔

۴۵۔ امریکی معاشرہ کی چند نمایاں خصوصیات

امریکہ کے معاشرہ کی ظاہری حالت چند دلچسپ خصوصیات کی حامل ہے۔ امریکہ میں لوگوں کی قسمتیں، خوشحالی، آراء و افکار اور قانون ہر لمحہ تغیر پذیر ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناقابلِ تغیر فطرت بھی یہاں تغیر پذیر ہو گئی ہے۔ اور یہ سب تبدیلیاں انسان کے ہاتھوں عمل میں آتی ہیں۔ لیکن بالآخر اس ہیجان انگیز معاشرہ کے منظر میں تنوع باقی نہیں رہتا اور اس رنگارنگ متحرک میلے کو تھوڑی دیر دیکھنے کے بعد تماشائی اکتا جاتا ہے۔

اشرافی ملکوں میں ہر شخص کی سماجی حالت اپنے دائرہ میں تقریباً ایک جگہ قائم رہتی ہے۔ لیکن لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ان کے جذبات، خیالات، عادات اور مذاق مختلف ہوتے ہیں۔ کسی شے میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ لیکن ہر شے مختلف ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جمہوریتوں میں سب لوگ یکساں ہوتے ہیں اور کم و بیش یکساں کام کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ آئے دن انقلابات اور تغیرات کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ انقلابات اور تغیرات بھی ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ صرف کرداروں کے نام بدل جاتے ہیں۔ امریکی معاشرہ کی حالت میں ایک زندگی اور حرکت ہے۔ کیونکہ لوگ اور اشیا ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں۔ ساتھ ہی اس میں اکتا دینے والا ٹھہراؤ بھی ہے کیونکہ تمام تبدیلیاں ایک ہی قسم کی ہوتی ہیں۔

جمہوری ملکوں کے لوگوں کی خواہشات لامحدود ہوتی ہیں۔ مگر اکثر خواہشات کا مدعا یا تو دولت

ہوتا ہے یا یہ دولت کی پیداوار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کی روح تنگ نظر ہے بلکہ یہ ہے کہ ایسے ہر دور میں صرف دولت ہی کو اہمیت حاصل رہتی ہے۔ جب معاشرہ کے تمام ارکان ایک دوسرے سے بے تعلق ہوں تو ان میں سے ہر ایک کا تعاون حاصل کرنے کے لیے تعاون کی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ اور اس دولت کی اہمیت اور قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب قدامت کا احترام اٹھ جاتا ہے تو لوگوں میں پیدائش، حالات اور پیشہ کے اعتبار سے کوئی امتیاز قائم نہیں رہتا۔ صرف دولت ہی لوگوں میں امتیاز پیدا کر سکتی ہے۔ دوسرے امتیازات کے خاتمہ کے ساتھ دولت سے پیدا ہونے والے امتیاز کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔ اشرافی اقوام میں، لوگوں کی خواہشات اور امنگوں کا بہت کم دخل ہوتا ہے۔ لیکن جمہوری اقوام میں دولت ہی سب کا مقصد عین ہوتا ہے۔

امریکی باشندوں کی تمام سرگرمیوں کی تہ میں دولت ہی کی خواہش کارفرما نظر آئے گی۔ اور اس خواہش کی عمومیت ان سب میں خاندانوں کی سی یکرنگی پیدا کرتی ہے اور اس طرح ان کا عام نظارہ اکتاہٹ کا باعث ہوتا ہے۔ ایک ہی خواہش اور جذبہ کو بار بار پیدا ہوتے ہوئے دیکھنا بجائے خود اکتا دینے کے لیے کافی ہے مگر اس خواہش کی تسکین کے لیے جو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں ان میں بھی تنوع نہیں ہوتا۔

امریکہ جیسے عظیم اور پُر امن ملک میں جہاں لوگ، سرکاری عہدوں وغیرہ کے ذریعہ سے دولت اکٹھی نہیں کر سکتے، دولت کی محبت لوگوں کو کاروبار اور تجارت کی طرف لے جاتی ہے۔ اگرچہ دولت کمانے کے یہ طریقے بسا اوقات ہیجان اور تباہی لاتے ہیں۔ لیکن تجارت اور صنعت باقاعدگی کے بغیر پنپ ہی نہیں سکتے اور دولت کمانے کی خواہش جس قدر زیادہ شدید ہو گی۔ لوگوں کی

عادات میں اتنی ہی باقاعدگی پیدا ہو گی اور ان کے کاموں میں یکسانیت ہو گی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکیوں کی خواہشات کی شدت ان میں باقاعدگی پیدا کرتی ہے۔ اگرچہ وہ ان کے ذہنی سکون کو درہم برہم کرتی ہے۔ لیکن زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہے۔

میں نے امریکہ کے بارے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے اس کا اطلاق ہمارے ہمعصروں پر بھی ہو سکتا ہے۔ نسل انسانی سے تنوع غائب ہو رہا ہے۔ آج کی دنیا کے ہر گوشہ میں ایک ہی قسم کا انداز فکر و عمل اور احساسات پائے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں ہے کہ اقوام ایک دوسرے پر اثر ڈالتی ہیں اور ایک دوسرے کی نقالی کرتی ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان اپنے پیشہ، نسل اور خاندان سے متعلق، اپنے احساسات اور تعصبات کو ترک کر دیتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی انسان کی فطرت کے قریب ہو جاتے ہیں جو ہر جگہ ایک سی ہے۔ اس طرح وہ ایک دوسرے کی نقالی کئے بغیر بھی آپس میں مشابہ ہو جاتے ہیں۔

۴۶۔ امریکہ میں حوصلہ مندوں کی کثرت

امریکہ میں کسی بیرونی سیاح کو سب سے پہلے جو چیز متاثر کرتی ہے۔ وہ ایسے لاکھوں لوگوں کی موجودگی ہے جو اپنی اصلی حالت سے ابھر کر ترقی کرنا چاہتے ہیں اور دوسری حیران کن بات یہ ہے کہ اس معاشرہ میں جو اولوالعزم انسانوں سے بھرا پڑا ہے حقیقی معنوں میں اعلیٰ تر مقاصد کی کمی ہے۔ کوئی امریکی ایسا نہ ملے گا۔ جو اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لیئے جدوجہد نہ کرتا ہو۔ لیکن شاید ہی کوئی امریکی ایسا ملے گا۔ جس کے پیش نظر اعلیٰ مقاصد کا حصول ہو۔ ہر شخص جائیداد، طاقت اور شہرت کے حصول کی تگ و دو میں ہے۔ لیکن چند ہی لوگ ان چیزوں کو بڑے پیمانہ پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بات اس سے بھی حیران کن ہے کہ امریکی قانون میں کوئی بات ایسی نہیں ملے گی۔ جس سے لوگوں کی خواہشات محدود ہوتی ہوں۔ سماجی مساوات کو امریکی کردار کی اس خصوصیت کا سبب نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کیونکہ فرانس میں جوں ہی سماجی مساوات قائم ہوئی۔ لوگوں کی عالی حوصلگی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ یہ صورتِ حال امریکہ کی سماجی حالات اور امریکہ کے جمہوری طرزِ معاشرت سے پیدا ہوئی ہے۔

انقلابات لوگوں کے حوصلوں میں وسعت پیدا کرتے ہیں اور یہ بات بطورِ خاص ان ملکوں پر صادق آتی ہے۔ جہاں انقلابات نے اشرافیہ کو ختم کر دیا ہو۔ جب لوگ ان رکاوٹوں کو گرا دیتے جو ان کی ترقی کی منزلوں کی راہ میں حائل ہو رہے تھے۔ تو تفوق اور برتری کی ایک ہمہ گیر تحریک شروع ہوتی ہے کامیابی

کے ابتدائی لمحات میں کوئی چیز ناممکن نظر نہیں آتی - قوانین اور رسوم اس طرح یکایک تبدیلی کے دور میں اور انتشار اور ہیجان میں، معاشرہ کے متعدد ارکان انتہائی تیزی سے عروج اور زوال پاتے ہیں اور اقتدار اس قدر سرعت سے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہوتا رہتا ہے کہ کسی شخص کو اس کے ہاتھ سے جانے کا غم نہیں رہتا۔

مگر یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ ایسی قومیں جو اشرافیہ کو تباہ کرکے انقلاب لاتی ہیں، انقلاب سے پہلے ایک زمانے تک اشرافیہ کے قانون کے تحت ہی زندگی بسر کرتی تھیں انھوں نے اس زمانے میں اشرافیہ کی شان وشوکت دیکھی اور غیر شعوری طور پر ان کے جذبات اور تصورات کو اپنایا تھا۔ اس طرح اشرافیہ کے ختم ہونے کے بعد بھی اشرافیہ کی سپرٹ باقی رہتی ہے اور اس کے رجحانات عرصۂ دراز تک قائم رہتے ہیں۔ جب تک جمہوری انقلاب جاری رہتا ہے لوگوں کے حوصلے بلند رہتے ہیں۔ اور یہ صورتِ حال اس وقت تک جاری رہتی ہے۔ جب تک انقلاب کی تکمیل نہ ہوجائے۔

انسانی آنکھوں نے جن غیر معمولی واقعات کا مشاہدہ کیا تھا اس کی یاد آسانی سے محو نہیں ہوتی۔ جن جذبات نے انقلاب کو پیدا کیا تھا۔ وہ انقلاب کی تکمیل کے فوری بعد تحلیل نہیں ہوجاتے۔ دوبارہ قائم ہونے والے نظام میں عدم استحکام کا ایک احساس باقی رہتا ہے۔ اور عجیب وغریب انقلابات کے بعد بھی آسانی سے کامیابی حاصل کرنے کا تصور باقی رہتا ہے۔ لوگوں کی امنگوں میں ابھی وسعت رہتی ہے اور ان امنگوں کی تسکین کے ذرائع البتہ روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں۔ بڑی بڑی جائدادوں کی خواہش باقی رہتی ہے بالآخر جب اس کشمکش کے آخری آثار بھی ختم ہوجاتے ہیں تو اشرافیہ کے

اثرات بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ عظیم حالات فراموش کر دیے جاتے ہیں۔ جن کی بنا پر اشرافیہ کو شکست دی گئی تھی۔ جنگ کی جگہ امن لیتا ہے۔ اور نظم وضبط کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے۔ لوگوں کی خواہشات بھی ان ذرائع کے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ جن سے ان خواہشات کی تکمیل کی جاسکتی ہو۔ لوگوں کی احتیاجات، احساسات اور افکار میں پھر ربط اور تسلسل پیدا ہوتا ہے۔ معاشرہ کی سطح مستقل طور پر معین کی جاتی ہے اور جمہوری معاشرہ قائم ہو جاتا ہے۔

ایسی جمہوری قومیں جو اس مستقل اور باقاعدہ مرحلہ تک پہنچ چکی ہیں ان میں ایسے حالات نہ ہوں گے۔ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

دولت کی تقسیم در تقسیم اور علم کے پھیلاؤ کے بعد کوئی شخص علم یا جائیداد کا محتاج نہیں رہتا۔ درجہ بندیاں اور سماجی مراتب ختم ہونے کے بعد لوگوں کے ذہن میں ترقی کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنی حالت کو بہتر سے بہتر بنائے۔ اس طرح قوم میں حوصلہ مندی ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔

لیکن جہاں مساوات معاشرہ کے تمام افراد کو ترقی کے وسائل عطا کرتی ہے وہیں وہ لوگوں کو زیادہ وسائل کے حاصل کرنے سے روکتی ہے۔ اس طرح وہ ان کی خواہشات کی حد پر قدغن لگا دیتی ہے۔ اس طرح جمہوری ملکوں میں لوگوں کی امنگیں زیادہ اور مسلسل ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا مقصد بلند نہیں ہوتا۔ زندگی ایسی اشیا کے حصول کی تگ و دو میں صرف ہوتی ہے جو معمولی ہوتی ہیں اور جن تک رسائی آسان ہو۔

جمہوری ملکوں کے لوگوں کی توجہات کو جو شے بلند تصورات سے ہٹاتی ہے وہ تمول اور جائداد کی کمی نہیں ہے۔ بلکہ ان مساعی کی شدت ہے جو

وہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لیے روبکار لاتے ہیں۔ متمول لوگوں کی محدود تعداد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ایک ایسا شخص جو بتدریج ترقی کرتا ہوا دولت اور طاقت کے مقام پر پہنچا ہو۔ ابتدائی مشقت طلب دور میں حزم و احتیاط کی عادات پیدا کر لیتا ہے۔ جن سے وہ چھٹکارا نہیں پا سکتا۔ اور یہی بات اس قسم کے لوگوں کی اولاد پر صادق آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اونچے مقام کے ساتھ پیدا ہوئے لیکن ان کے باپ غریب تھے اور انھوں نے مشقت اور محنت کے بعد دولت حاصل کی تھی۔ نتیجتہً اولاد کی پرورش ایسے ماحول اور نظریات میں ہوتی ہے۔ جن سے وہ بڑے ہو کر آسانی سے نجات حاصل نہیں کر سکتے اور ورثہ میں باپ کی دولت کے ساتھ وہ باپ کی خصوصیات اور اس کے رجحانات بھی حاصل کرتے ہیں۔

اس کے برعکس طاقتور اشرافیہ کی بعض غریب سے غریب اولاد بھی زبردست حوصلہ مندی کا مظاہرہ کر سکتی ہے۔ کیونکہ اس کی نسل کی روایات اور سپرٹ چند دنوں تک اس کو اس کی اپنی اصلی حالت سے بلند رکھتی ہے۔

جمہوری ملکوں میں ایک اور شئے جو لوگوں کو اعلیٰ مقاصد کے حصول سے باز رکھتی ہے۔ وہ وقت کا عنصر ہے۔ بڑے مقاصد کے حصول کے لیے وقت اور انتظار کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور جمہوری ملک کے لوگ، اپنے مخصوص سماجی حالات کی بنا پر اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

جمہوری معاشروں میں، دیگر معاشروں ہی کی طرح چند ہی لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں۔ مگر چونکہ ان عہدوں کی شاہراہیں ہر ایک کے لیے کھلی ہوتی ہیں۔ اس لیے سب کی رفتار سست ہوتی ہے۔ چونکہ سب امیدوار ایک ہی سے ہوتے ہیں اور مساوات کے اصولوں کو نقصان پہنچائے

بغیر ان میں سے کسی کا انتخاب مشکل ہوتا ہے تو ایسے معاشرہ میں یہی بہتر تصور کیا جاتا ہے کہ سب کو ایک رفتار سے بڑھنے دیا جائے اور سب کو ایک ہی قسم کی آزمائش سے گزارا جائے۔ اس طرح لوگ جس تناسب سے یکساں حالت پر ہوتے ہیں اور مساوات کے اصول ملک کے تمام اداروں میں رواج پاتے ہیں ترقی کے قواعد غیر لچکدار ہوتے جاتے ہیں۔ ترقی کی رفتار سست پڑ جاتی ہے اور ایک خاص بلندی پر پہنچنا مشکل سے مشکل تر ہو جاتا ہے۔

چین میں جہاں سماجی مساوات بہت زیادہ اور قدیم ہے کسی شخص کو سرکاری عہدہ اس وقت تک نہیں ملتا جب تک وہ آزمائشوں سے نہ گزرے۔ اس کی ملازمت کے دوران ترقی کی ہر منزل پر اسے متعدد امتحانوں سے گزرنا پڑتا ہے اور چینی تہذیب میں اس تصور کی جڑیں بڑی دور تک چلی گئی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ایک چینی ناول پڑھا تھا۔ ناول کا ہیرو مختلف کٹھن سے کٹھن امتحانوں سے گزر کر اپنی محبوبہ کے دل پر فتح حاصل کرتا ہے۔ اس قسم کے ماحول میں بلند تصورات بڑی مشکل ہی سے سانس لے سکتے ہیں۔

میں نے سیاسیات کے بارے میں جو مثال دی ہے اس کا ہر جگہ اطلاق ہوتا ہے۔ مساوات ہر جگہ یکساں قسم کے نتائج پیدا کرتی ہے۔

ایک مضبوط جمہوری معاشرہ میں جلدی اور تیزی سے ترقی شاید و باید ہی ہوتی ہے۔

جمہوری معاشروں میں رہنے والے لوگ بالآخر ان باتوں کی تہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ جان لیتے ہیں کہ ان کے ملک کے قانون نے ان کے لیے وسیع میدانِ عمل مہیا کیا ہے۔ لیکن کوئی شخص اس میدان کو فوری طور پر پار نہیں کر سکتا۔ نقطۂ آغاز سے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے بے شمار رکاوٹوں کو عبور کرنا پڑتا ہے

جوان کی رفتار کو سست کر دیتے ہیں اور یہ طریقہ کار انھیں بالآخر تھکا دیتا ہے اور ان کے حوصلوں کو توڑ دیتا ہے۔ وہ اس لیے ایسی امیدوں ہی کو ترک کر دیتے ہیں جو مشتبہ اور دور از کار ہیں۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ جمہوری دور میں بلند مقاصد ناپید ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں اس بات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ان فطری رکاوٹوں کے باوجود ایسے بلند مقاصد معرضِ وجود میں آتے ہیں تو ان کا کردار بالکلیہ مختلف ہوگا۔ اشرافی معاشروں میں ترقی کے امکانات وسیع ہیں۔ لیکن اس کی سرحدیں پہلے ہی سے متعین کر دی جاتی ہیں۔ جمہوری معاشروں میں امنگیں ایک ہی دائرہ کے اندر ہوتی ہیں۔ لیکن جب وہ اس دائرہ سے باہر نکل جاتی ہیں تو پھر ان کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔

۷۸۔ جمہوری ملکوں میں عہدہ پرستی

امریکہ میں جب کوئی شخص تھوڑی بہت تعلیم حاصل کر لیتا ہے اور تھوڑے بہت مالی وسائل کا مالک ہو جاتا ہے وہ یا تو تجارت اور صنعت کے ذریعے دولت مند بننے کی کوشش کرتا ہے یا جنگل میں زمین خرید لیتا ہے اور پیشرووں کی صف میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ مملکت سے سوائے اس کے اور کچھ نہیں چاہتا کہ وہ اس کی محنت اور مشقت میں خلل نہ ڈالے۔ یورپی ملکوں میں اس کے برعکس کوئی شخص جوان ہوتا ہے تو اس کی یہ خواہش ہوگی کہ سرکاری ملازمت حاصل کرے۔ ان دونوں متضاد اثرات کا سبب ایک ہی ہے۔

ملک میں جب سرکاری ملازمتوں کی کمی ہو، تنخواہیں کم ہوں اور اس کے ساتھ ہی مختلف منفعت بخش کاروبار کی راہیں کھلی ہوئی ہوں تو ترقی اور خوشحالی کے متلاشی سرکاری عہدوں کی طرف توجہ نہیں دیں گے۔ بلکہ کاروبار اور صنعت کا رخ کریں گے۔ مگر ایسی صورت حال میں جب کہ معاشرہ کی صفوں میں مساوات آ رہی ہو، لوگوں کی تعلیم نامکمل ہو یا ان میں جرأت مندی کا فقدان ہو۔ اور اگر تجارت اور صنعت کی ترقی پر قدغنیں لگی ہوئی ہوں تو معاشرہ کے مختلف ارکان، اپنی حالت کو اپنے طور پر بہتر بنانے کی مساعی سے مایوس ہو کر، صدر مملکت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کی امداد کے طالب ہوتے ہیں۔ سرکاری خزانے سے اپنی ضروریات کی تکمیل انھیں آسان ترین طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ اس کے ذریعہ اپنی موجودہ حالت کو بہتر بنایا جا سکیں۔

چنانچہ سرکاری ملازمت سب سے زیادہ عام پیشہ بن جاتا ہے۔

بڑی بڑی مرکزی شاہی مملکتوں میں خاص طور پر یہ بات صادق آتی ہے کیونکہ ان ملکوں میں با تنخواہ سرکاری عہدے بکثرت ہوتے ہیں اور ملازمتیں کافی حد تک محفوظ ہوتی ہیں۔ اور کم و بیش ہر شخص ایک عہدہ حاصل کرنے کے بعد اسے ایک عرصۂ دراز تک قائم رکھ سکتا ہے۔

سرکاری عہدوں کی اس ہمہ گیر خواہش کو میں سماجی بُرائی قرار نہیں دوں گا۔ اور نہ یہ کہوں گا کہ یہ شہریوں کے جذبہ حریت کے لیے زہر قاتل ہے اور یہ کہ تمام معاشرہ میں ضمیر فروش اور غلامانہ ذہنیت کو فروغ دیتی ہے۔ یہ مردانہ صفات کا گلا گھونٹ دیتی ہے اور نہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ اس قسم کی سوداگری ملک میں غیر منفعت بخش اور بے فائدہ سرگرمی پیدا کرتی ہے۔ اور ملک کے وسائل میں اضافہ کے بغیر ایک ہیجان سا پیدا کرتی ہے یہ تمام باتیں عیاں ہیں۔ لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو حکومت اس رجحان کی ہمت افزائی کرتی ہے۔ وہ خود اپنی سلامتی اور اپنے وجود کو خطرہ میں ڈالتی ہے۔

مجھے احساس ہے کہ اس دور میں جب کہ وہ محبت اور احترام جو پہلے اختیار سے وابستہ رہتا تھا مائل بہ زوال ہے۔ با اختیار لوگوں کے لیے شاید یہ ضروری ہو کہ اپنے مفاد میں ہر شخص کو اپنے قابو میں رکھیں لیکن یہ بات طویل عرصہ تک چل نہیں سکتی۔ جو بات آج بظاہر طاقت کا سرچشمہ دکھائی دے رہی ہے وہ بالآخر اس کی کمزوری اور پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔

جمہوری ملکوں میں سرکاری عہدے محدود ہوتے ہیں۔ مگر ان ملکوں میں

ان عہدوں کے امیدوار بے شمار ہوتے ہیں اور ان میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔
اسی صورتِ حال میں اگر سرکاری ملازمتیں ہی لوگوں کی امنگوں کا واحد ذریعہ ہوں تو حکومت کو بالآخر سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ اسے محدود ذرائع سے غیر محدود امنگوں کی تسکین کرنا ہوتی ہے۔ یہ یقینی ہے کہ جن لوگوں پر قابو پانے میں سب سے زیادہ مشکل پیش آتی ہے وہ عہدہ پرستوں کا طبقہ ہے۔ حکمران خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کریں۔ ان کو مطمئن کرنا ناممکن ہے۔ اور اس بات کا ہمیشہ خدشہ رہتا ہے کہ وہ بالآخر آئین اور حکومت کا ہی تختہ الٹ دیں اور مملکت کی ہیئت ترکیبی کو محض عہدوں کو خالی کرانے کے لیے بدل دیں۔

۴۸- عظیم انقلابات ناپید کیوں ہو جائیں گے؟

صدیوں تک جب کوئی قوم ایک خاص طبقاتی یا نسلی نظام کے تحت زندگی بسر کرتی ہے۔ اسے جمہوریت کی منزل تک پہنچنے کے لیے مختلف قسم کی متعدد تبدیلیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ تبدیلیاں تشدد آمیز مساعی اور مختلف انقلابات کے بعد لائی جاتی ہیں اور اس دوران میں جائیدادوں، افکار اور سیاسی طاقت میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں جو وقتاً فوقتاً بحران پیدا کرتی ہیں۔ چونکہ یہ تمام واقعات اس وقت رونما ہوتے رہتے ہیں جب کہ معاشرہ میں مساوات قائم ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے عام طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ اصول مساوات اور انقلابات کے درمیان ایک پوشیدہ رشتہ موجود ہے اور یہ کہ ایک دوسرے کے بغیر معرض وجود میں نہیں آسکتا۔

اس سلسلے میں منطقی استدلال سے وہی نتائج حاصل ہوتے ہیں جو تجربات سے ہوتے ہیں۔ ایسی اقوام میں جہاں مراتب اور درجہ بندیاں نہ ہوں، لوگوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے کوئی ظاہر رشتہ نہیں ہوتا یا ان کو کسی ایک مخصوص مقام سے وابستہ رکھا جاسکتا ہے۔ کسی کو حکومت کرنے کا مستقل حق حاصل نہیں رہتا۔ اور نہ ہی کوئی اطاعت شعاری پہ مجبور رہتا ہے۔ غرض یہ کہ جمہوری معاشروں میں مسلسل تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ آدمی، اشیا اور افکار اپنی جگہ اور اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ تبدیلی اور تغیر ہی جمہوریت کا قانون ہے؟ کیا سماجی

مساوات بطورِ عادت لوگوں کو مستقل طور پر انقلابات کے چکر میں رکھتی ہے۔ گیا معاشرہ کی ہئیتِ ترکیبی میں ایسے تلاطم انگیز اصول ہوتے ہیں جو معاشرہ میں کبھی بھی سکون کی کیفیت پیدا ہونے نہیں دیتے اور لوگوں کو اس بات کا عادی بنا دیتے ہیں کہ وہ اپنے قانون اصول اور آداب میں ہر وقت تبدیلیاں لاتے رہیں۔ مجھے ان سب باتوں سے اختلاف ہے۔

دنیا میں جس قدر بھی انقلابات آئے۔ ان کا مقصد سماجی عدم مساوات کو مضبوط کرنا یا اسے تباہ کرنا تھا۔ ثانوی وجوہات کو ہٹا کر کسی بھی انقلاب کا تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہ میں اصول عدم مساوات نظر آئے گا۔ یا تو غریبوں نے مالداروں کو تباہ کرنے کی کوشش کی ہے یا امیروں نے غریبوں کو غلام بنانے کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کبھی ایسا معاشرہ معرضِ وجود میں آگیا۔ جس میں ہر شخص کے پاس کچھ نہ کچھ ہو اور دوسروں کے پاس سے چھین لینے کے لیے کچھ نہ ہو تو یقیناً دنیا میں امن قائم ہو جائے گا۔

مجھے علم ہے کہ بڑی جمہوری قوموں میں بھی ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہوگی جو غریب اور فلاکت کے شکار ہوں گے۔ اور ایسے لوگ بھی ہوں گے جو دولت کی گود میں کھیل رہے ہوں گے۔ لیکن غریب اشرافی ملکوں کے مانند قوم کی اکثریت پر مشتمل نہ ہوں گے۔ ان کی تعداد بے حد کم ہوگی اور قانون انھیں اس بات کا پابند نہیں رکھے گا کہ وہ عمر بھر غربت ہی سے چمٹے رہیں۔

دوسری طرف جمہوری ملکوں میں امیروں کی تعداد کم ہوتی ہے۔ انھیں خاص مراعات اور حقوق حاصل نہیں رہتے۔ خود ان کی دولت بھی تغیر پذیر رہتی ہے۔ جس طرح غریبوں کی کوئی نسل نہیں ہوتی۔ امیروں کی بھی کوئی نسل نہیں ہوتی۔ امیر غریبوں ہی کے طبقہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور بعد میں اسی میں ضم ہو جاتے ہیں۔ چونکہ امیروں

کا کوئی خاص طبقہ نہیں ہوتا اور چونکہ وہ خود عام شہریوں کا ایک حصّہ ہوتے ہیں۔ اس لیے لوگ اپنے آپ کو نقصان پہنچائے بغیر ان کو نقصان پہنچا نہیں سکتے۔

جمہوری معاشروں میں لوگوں کی ان دو انتہائی قسموں کے درمیان لاکھوں لوگ ہوتے ہیں۔ جو ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے ہیں۔ نہ تو وہ امیر ہوتے ہیں نہ غریب۔ ان کے پاس اتنی پونجی ہوتی ہے کہ وہ ان کی ضروریات اور راحت کے لیے کافی ہوتی ہے۔ مگر اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ لوگ ان سے حسد اور رشک کرنے لگیں۔ اس قسم کے لوگ پُر تشدد، انقلابات اور بحرانوں کے دشمن ہوتے ہیں اور یہی لوگ معاشرہ میں توازن قائم رکھتے ہیں۔

یہ بات نہیں کہ یہ لوگ اپنی حالت پر قانع ہیں یا یہ کہ وہ انقلابات کو فطری طور پر نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس کے برعکس ان لوگوں کی بھی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی حالت کو بہتر بنائیں۔ مالدار بن جائیں۔ لیکن ان کے لیے یہ جاننا مشکل ہے کہ دولت کہاں سے حاصل کی جائے؛ معاشرہ کی حالت ہی، جو ان کے دلوں میں خواہش اور امنگ پیدا کرتی ہے۔ ان خواہشوں اور امنگوں کو ضروری حدود میں مقید رکھتی ہے۔ یہ لوگوں کو تبدیلی پیدا کرنے کی آزادی دیتی ہے۔ لیکن تبدیلی میں کم دلچسپی لیتی ہے۔

جمہوری ملکوں کے لوگ فطری طور پر انقلابات کے نہ صرف خواہش مند نہیں ہوتے بلکہ ان سے وہ خوفزدہ بھی رہتے ہیں۔ تمام انقلابات جائیداد کی ملکیت کے حق پر ضرب لگاتے ہیں۔ جمہوری ملکوں میں رہنے والوں کی بڑی تعداد جائیداد کی مالک ہوتی ہے۔ نہ صرف وہ جائیداد کی مالک ہوتی ہے۔ بلکہ جمہوری ملکوں میں جائیداد کو بے حد اہم تصور کیا جاتا ہے۔

اگر ہم معاشرہ کے ہر طبقہ کا الگ الگ مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ متوسط طبقہ میں

جائیداد سے وابستگی اور جائیداد کی خواہش بہت زیادہ ہوتی ہے۔ غریب کے پاس تو اولاً کچھ ہوتا ہی نہیں کہ اس کی فکر کرے اور اگر کچھ ہوتا بھی ہے تو وہ اپنے دیگر احتیاجات کے بوجھ تلے اس قدر دبا ہوتا ہے کہ اس سے لطف اٹھا ہی نہیں سکتا۔ دولت مندوں کو خواہشوں کی تسکین کے لیے دولت کے سوا دوسری دلچسپیاں بھی ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں ایک طویل عرصہ تک دولت اور اس کی برکتوں سے مستفید ہوتے رہنے کے بعد ان کے لیے دولت کی کشش گھٹ جاتی ہے۔ لیکن جن لوگوں میں صلاحیت ہوتی ہے۔ مگر زیادہ خوشحال اور دولت مند نہیں ہوتے۔ وہ اپنی اپنی ملکیتی اشیا کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ غربت چونکہ ان کے قریب رہتی ہے اس لیے انھیں غربت کی مصیبتوں کا اندازہ رہتا ہے اور وہ غربت سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ جائیداد کے تھوڑے سے حصے سے بھی دست بردار ہونے کا خیال ان کے لیے روح فرسا ہوتا ہے۔

جمہوری ملکوں میں اس قسم کے مشوش اور بے قرار لوگوں کا طبقہ اکثریت میں ہوتا ہے۔ اور سماجی مساوات میں ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی تعداد مسلسل بڑھتی رہتی ہے۔ اور اسی بنا پر جمہوری ملکوں میں عوام کی اکثریت کو انقلاب میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا ہے۔ اس کے برعکس انھیں اندیشہ رہتا ہے کہ انقلاب سے وہ گھاٹے میں رہیں گے۔

سماجی مساوات لوگوں میں تجارت اور صنعت کی طرف میلان پیدا کرتی ہے یہ جائیدادوں میں اضافہ کرتی ہے۔ اور پھر ان کی تقسیم کر دیتی ہے۔ لوگ ہمیشہ اپنی بہبود کے فروغ کے لیے تگ و دو میں رہتے ہیں۔ ممکن ہے کہ قومی انقلاب بالآخر تجارت اور صنعت کے لیے سود مند ثابت ہو۔ لیکن پہلے مرحلہ میں ہر انقلاب تجارت اور کاروبار کو تباہ کر دیتا ہے۔

تجارتی اور کاروباری آداب انقلابی رجحانات کے مخالف ہوتے ہیں۔ تجارت تمام تشدد پسند جذبات اور رجحانات کی مخالف ہوتی ہے۔ وہ دفع الوقتی کی قائل ہوتی ہے۔ مصالحت میں خوش رہتی ہے اور اشتعال اور ہیجان سے پرہیز کرتی ہے۔ تجارت' انتہائی متحمل' چالاک اور لچکدار ہوتی ہے۔ اور اس وقت تک انتہا پسندانہ طریقے اختیار نہیں کرتی جب تک حالات اسے مجبور نہ کردیں۔ کاروبار لوگوں کو ایک دوسرے سے بے نیاز کردیتا ہے اور افراد میں اپنی اہمیت کا غیر معمولی احساس پیدا کرتا ہے۔ انھیں اپنے معاملات کو اپنے طور نمٹانا سکھاتا ہے۔ اس طرح کاروبار لوگوں کو آزادی کے لیے تیار کرتا ہے۔ لیکن انھیں انقلابات سے محفوظ رکھتا ہے۔

نجی جائیدادوں کے مالکوں کو انقلابات سے سب سے زیادہ ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو ان کی جائیداد آسانی سے ضبط کی جاسکتی ہے اور دوسری طرف وہ کسی بھی لمحہ غائب ہوسکتی ہے۔ اس قسم کا خطرہ ان لوگوں کو لاحق نہیں رہتا جن کی غیر منقولہ جائیداد ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ اپنی جائیداد کی آمدنی سے محروم ہوسکتے ہیں۔ لیکن انھیں یہ آس تو رہتی ہے کہ وہ اپنی جائیداد بچالیں گے۔ اسی لیے نجی جائیداد کے مالک ثانی الذکر طبقہ سے زیادہ انقلابات سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسی اقوام میں جہاں لوگوں کے پاس نجی مال و متاع زیادہ ہوگا وہ انقلابات اور متشدد بحرانوں کو ناپسند کریں گے۔

علاوہ ازیں' لوگ خواہ کسی پیشہ پر عمل کریں اور ان کی جائیداد کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو سب میں ایک خصوصیت مشترک ہوتی ہے۔ ہر شخص اپنی موجودہ حیثیت پر پوری طرح قانع نہیں ہوتا اور سب ہزارہا طریقوں سے اپنی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ یہ بات نہ صرف لوگوں کو انقلابات

برپا کرنے سے روکتی ہے۔ بلکہ ان میں اس قسم کی خواہش ہی پیدا نہیں کرتی۔ تشدد انقلابات ایسے لوگوں کے لیے ذرہ برابر کشش نہیں رکھتے جنھوں نے اپنی زندگیوں اور صلاحیتوں کو اپنی بہبود کے فروغ دینے کے لیے وقف کر دیا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ جمہوری ملکوں میں وقتاً فوقتاً ایسے جرأت آزما اور حوصلہ مند لوگ پیدا ہوتے رہیں گے۔ جن کی غیر محدود امنگیں پرانے ڈگروں پر چلنے سے مطمئن نہ ہوں گی۔ اس قسم کے لوگ انقلابات پسند کرتے ہیں اور اس کی آمد کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ مگر انھیں خود ایسے انقلابات پیدا کرنے میں بے شمار مصائب کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ سوائے اس کے کہ غیر معمولی حالات ان کا ساتھ دیں۔ کوئی شخص اپنے زمانے اور اپنے ملک کی سپرٹ اور عام رجحان کا مقابلہ آسانی سے نہیں کر سکتا ہے خواہ وہ کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو اپنے ایسے احساسات کا شریک نہ بنا سکے گا جو اس کے احساسات اور تمناؤں کے خلاف ہوں۔

یہ تصور کرنا بھیانک غلطی ہے کہ جب مساوات قوم کی زندگی میں سرایت کر جاتی ہے اور مساوات معاشرہ کا لازمی جزو بن جاتی ہے تو لوگوں کو عاقبت نااندیش لیڈر یا سرپھرے موجد زبردست خطرات کے قبول کرنے پر آمادہ کر سکیں گے؛ لوگ اس قسم کے لیڈر کی یقیناً باقاعدہ منصوبے کے تحت مخالفت کریں گے۔ ممکن ہے کہ وہ اس کے خلاف جدوجہد نہ کریں۔ بعض اوقات ممکن ہے کہ وہ اس کی واہ واہ بھی کریں۔ لیکن وہ اس کی پیروی نہ کریں گے۔

میرا حاصل کلام یہ نہیں ہے کہ جمہوری ملکوں کے لوگ فطری طور پر جامد رہتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے معاشرہ کی تہ میں ایک دائمی حرکت رہتی ہے اور یہ کہ جمہوری معاشرہ سکون کے نام سے ناآشنا ہوتا ہے۔ لیکن انسان اپنے آپ پر چند پابندیاں عاید کرتے ہیں اور ان حدود سے آگے نہیں بڑھتے۔ وہ ہمیشہ

ثانوی اہمیت کی چیزوں میں تبدیلی اور تغیر لاتے رہتے ہیں - لیکن وہ بنیادی باتوں کو نہیں چھیڑتے - وہ تغیر سے محبت کرتے ہیں - لیکن انقلاب سے خوف کھاتے ہیں -

اگرچہ امریکی اپنے آئین وقوانین میں آئے دن تبدیلیاں اور ترمیم کرتے رہتے ہیں لیکن وہ کبھی انقلابی جذبات کا اظہار نہیں کرتے - جب کبھی ملک میں عوامی جذبات خطرناک حد تک برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور امریکیوں کو کسی انقلاب کا خدشہ ہوتا ہے تو جس سرعت اور پھرتی کے ساتھ وہ اس رجحان کو روکتے ہیں اور ملک میں سکون پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں - اس سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ امریکہ کا ہر شخص اس تباہی سے بچنے کے لیے ہر قربانی دینے پر آمادہ رہتا ہے - امریکہ سے زیادہ دنیا کے کسی ملک میں لوگوں کو جائیداد سے محبت نہیں اور دنیا کے کسی ملک کی اکثریت ان اصولوں سے اس قدر بے تعلقی کا اظہار نہیں کرتی جو جائیداد کے قانون پر اثر انداز ہوتے ہوں -

اور اس بنا پر انقلابی نظریے' جو جائیداد کی ملکیت کو خطرہ میں ڈال سکتے ہیں - امریکہ میں قبولیت عام حاصل نہیں کر سکتے - اگر بعض لوگوں نے انھیں اختیار بھی کیا تھا تو آبادی کی اکثریت نے ان نظریوں کو جبلی نفرت کے ساتھ مسترد کر دیا - فرانس میں عام طور پر جن معقولوں اور اصولوں کو جمہوری قرار دیا جاتا ہے - امریکی جمہوریت ان پر امتناع عائد کر دے گی - اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ میں لوگوں کے جذبات اور افکار جمہوری ہیں - اور یورپ میں ہمارے افکار اور جذبات ابھی تک انقلابی ہیں -

اگر امریکہ میں کبھی کوئی انقلاب آیا تو وہ امریکہ میں سیاہ فام نسلوں کی موجودگی سے آئے گا - اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس انقلاب کی تہ میں عدم مساوات کا

اصول کارفرما ہوگا۔

سماجی مساوات کی حالت میں لوگ ایک دوسرے سے الگ رہتے اور اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں۔ اگر جمہوری ملکوں کے حکمران اس رجحان کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دیں یا اس خیال کے تحت اس رجحان کی ہمت افزائی کریں کہ لوگوں کی توجہ سیاسیات سے ہٹی رہے گی اور اس طرح انقلاب بھی نہ آئیں گے۔ تو وہ ایک ایسی غلطی کا ارتکاب کریں گے۔ جس کی تلافی ممکن نہ ہو سکے گی۔ اور وہی خطرہ انہیں پیش آئے گا جس کے ڈر سے انھوں نے اس رجحان کی اصلاح نہ کی تھی یا اس کی ہمت افزائی کی تھی۔ عین ممکن ہے کہ ایک وقت ایسا آئے۔ جب کہ چند لوگوں کی غیر محدود امنگیں، دوسرے لوگوں کی غیر دانشمندانہ خود غرضی یا بزدلی کی مدد سے، معاشرہ کو عجیب وغریب انقلابات سے دوچار ہونے پر مجبور کر دیں۔ جمہوری ملکوں میں ایک محدود اقلیت کے سوا کوئی انقلاب کا خواہشمند نہیں ہوتا۔ لیکن بعض وقت یہ محدود اقلیت ہی انقلاب برپا کر سکتی ہے۔

میرا مدعا یہ نہیں ہے کہ جمہوری ممالک انقلابات سے محفوظ ہیں۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ ان قوموں میں معاشرہ کی حالت انقلاب کی طرف نہیں لے جاتی۔ بلکہ وہ انقلاب سے دور لے جاتی ہے۔ اگر جمہوری اقوام کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ بلاوجہ جھنجٹوں میں گرفتار نہیں ہوں گے۔ وہ انقلاب کی منزل کی طرف ممکن ہے بے خبری کی حالت میں بڑھتے جائیں۔

اس سلسلے میں عوامی ادارے زبردست کام انجام دے سکتے ہیں۔ وہ ایسے رجحانات کو دبا سکتے یا ہمت افزائی کر سکتے ہیں جو معاشرہ کے اندر پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں میں مکرر یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی قوم انقلاب سے اس لیے محفوظ نہیں رہ سکتی کہ وہاں مساوات قائم ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی قوموں میں خواہ اس کے ادارے کسی نوعیت کے ہوں۔

بڑے انقلابات میں تشدد کم ہوگا۔

واقعات کے بارے میں یہاں میں نے جس نقطۂ نظر کا اظہار کیا ہے اس کا اطلاق افکار پر ہوتا ہے۔ امریکہ میں دو باتیں حیرت انگیز ہیں۔ انسانی فعل و عمل میں تغیر پذیری — اور بعض نظریات اور اصولوں کا عدیم المثال استحکام۔ امریکہ میں لوگ ہر وقت متحرک ہیں لیکن ان کا ذہن تقریباً ساکت ہے۔ جب ملک میں ایک نظریہ قبول ہو جاتا ہے اور جڑیں پکڑ لیتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت انھیں اکھاڑ نہیں سکتی۔ امریکہ میں سیاسیات، مذہب، فلسفہ، اخلاق کے عام اصولوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور کوئی تبدیلی آتی بھی ہے تو غیر محسوس طور پر۔ یہاں تک کہ فاش تعصبات بھی انتہائی سست رفتاری کے ساتھ مٹائے جاتے ہیں۔

میں نے سنا تھا کہ جمہوریت کے مزاج میں یہ ہے کہ افکار اور احساسات میں آئے دن تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ممکن ہے چھوٹی جمہوریتوں میں یہ بات درست ہو۔ جہاں تمام آبادی کو ایک جگہ آسانی سے جمع کیا جا سکتا ہے اور خطیب کی سحر بیانی ان کے خیالات کو بدل سکتی ہے لیکن میں نے اوقیانوس کے اس پار اس عظیم جمہوریت کے باشندوں میں یہ بات نہیں دیکھی۔ وہاں جو بات مشکل نظر آئی۔ وہ یہی ہے کہ ایک خیال یا ایک رائے نے اگر جڑ پکڑ لی تو اس کا نکالنا مشکل ہے۔ اور ایک لیڈر کو قبول کر لیا۔ تو اس کا اثر کم نہیں کیا جا سکتا۔ نہ تو خطابت اور نہ تحریریں یہ کام انجام دے سکتی ہیں۔ صرف تجربہ ہی اس میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن تجربہ کو بار بار دہرانا ضروری ہے۔

بظاہر یہ حیرت انگیز ہے۔ لیکن ذرا توجہ سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان کے ذہن کو بدلنا آسان نہیں ہوتا۔ مسلمہ افکار اور قبولیتِ عامہ حاصل کیے ہوئے آرا کو اور تعصبات کو آسانی سے بدلا نہیں جا سکتا۔

۹۔ جمہوری اقوام امن اور جمہوری فوجیں جنگ کیوں چاہتی ہیں؟

جمہوری اقوام میں جو جذبات، خدشے اور مفادات انقلاب کو روکتے ہیں۔ وہی انھیں جنگ سے دُور رکھتے ہیں۔ اور ایک ہی قسم کے عوامل کی بنا پر فوجی فتوحات کی سپرٹ اور انقلاب کی سپرٹ کمزور ہوتی ہے۔ معاشرہ میں صاحبِ جائیداد لوگوں کی روز افزوں تعداد، نجی جائیدادوں کی ترقی، لوگوں کے طرزِ معاشرت میں نرمی، لوگوں کی جبلی شرافت، رحم و تلطف کے جذبات جو مساوات پیدا کرتے ہیں۔ اور قوت تفہیم — یہ تمام وجوہات مل جل کر جنگ کے جذبات کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ میرے خیال میں اس بات کو بطور اصول قبول کرنا چاہیے کہ مہذب اقوام میں جس رفتار سے سماجی مساوات قائم ہوگی۔ اسی رفتار سے جنگجویانہ جذبات میں کمی آتی جائے گی۔

لیکن جنگ ایک ایسا سانحہ ہے۔ جو ہر قوم کو درپیش آسکتا ہے۔ خواہ جمہوری ہو یا اشرافی۔ امن اور آشتی سے کسی قوم کو کتنی ہی وابستگی کیوں نہ ہو۔ اسے کسی جارحانہ حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہنا ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر انھیں فوج کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ اہل امریکہ کی یہ خوش نصیبی ہے کہ قدرت نے انھیں جہاں متعدد برکتوں سے نوازا ہے۔ وہیں انھیں ایک ایسی جگہ آباد کیا ہے۔ جہاں ان کا کوئی پڑوسی نہیں ہے۔ ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے چند ہزار سپاہی کافی ہیں۔ لیکن یہ خصوصیت صرف امریکہ تک ہی محدود ہے۔ دوسری جمہوریتوں پر یہ بات صادق نہیں آتی۔

سماجی مساوات اور سماجی مساوات سے پیدا ہونے والے ادارے اور طرز معاشرت کسی قوم کو فوج رکھنے کی ضرورت سے بے نیاز نہیں کرتے۔ اور ان کی فوجیں ان کی قسمتوں پر بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ اس لیے اس بات کا مطالعہ کرنا انتہائی اہم ہے کہ ان لوگوں کی فطری خصوصیات کیا ہوتی ہیں۔ جس پر یہ فوجیں مشتمل ہوتی ہیں۔

اشرافی اقوام میں، اور خاص طور پر ان اقوام میں جہاں پیدائش ہی برتری کا واحد سرچشمہ ہے۔ قوم ہی کی طرح فوج میں بھی عدم مساوات ہوتی ہے۔ افسر طبقہ امرا سے ہے تو سپاہی غلام، اول الذکر صرف حکمرانی کے لیے پیدا ہوا تو دوسرا صرف اطاعت کے لیے۔ اشرافی اقوام میں سپاہی کی امنگیں محدود ہوتی ہیں۔ اور اسی طرح افسر کی بھی امنگوں کی وسعتیں غیر محدود نہیں ہوتیں۔ اشرافی معاشرہ میں نہ صرف قوم میں درجہ بندی ہوتی ہے۔ بلکہ ہر طبقے کے اندر بھی اندرونی درجہ بندی ہوتی ہے۔ اور ہر درجہ کے ارکان آپس میں ہم مرتبہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس درجہ بندی کے مطابق ایک شخص تو ایک رجمنٹ کی کمان کر سکتا ہے تو دوسرا صرف ایک کمپنی کی کمان کے لائق تصور کیا جاتا ہے اور جب وہ اپنی معینہ حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ تو وہاں رک جاتے ہیں اور اپنی قسمت پر قانع ہو جاتے ہیں۔

اشرافی معاشروں میں ایک اور طاقتور سبب، افسر کی ترقی کی خواہش کو کمزور کرتا ہے۔ اشرافی معاشرہ کا افسر، فوج میں اپنے عہدہ سے قطع نظر، معاشرہ میں اپنے طور پر ایک الگ حیثیت کا مالک ہوتا ہے۔ فوجی عہدہ تو اس کے لیے ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ اور فوجی فرائض کو محض اس لیے انجام دیتا ہے کہ معاشرہ میں بہ اعتبارِ پیدائش اس کو جو مقام حاصل ہے۔ اس کا تقاضہ ہے کہ

وہ خدمت انجام دے ۔ وہ فوج میں اس لیے داخل ہوتا ہے کہ جوانی کے بیکار دنوں میں کچھ مشغولیت ہاتھ آجائے اور بعد ازاں فوجی زندگی کی چند خوشگوار اور قابل فخر یادیں اپنے ساتھ لیتا جائے ۔ لیکن فوج کی خدمت سے اس کا مقصد کسی قسم کی جائیداد، شہرت، اختیار یا طاقت حاصل کرنا نہیں ہوتا ۔ کیونکہ یہ سب چیزیں اسے بطور حق پہلے ہی حاصل رہتی ہیں ۔

جمہوری فوجوں میں تمام سپاہی افسر بن سکتے ہیں ۔ جس کی وجہ سے ترقی کرنے کی خواہش ہمہ گیر ہوتی ہے اور اسی تناسب سے فوجی حوصلہ مندی کے حدود وسیع ہو جاتے ہیں ۔ افسر کے لیے ایک عہدہ سے دوسرے عہدہ تک ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی ۔ اور ہر ایک ترقی اس کے لیے بے حد اہمیت کی حامل ہوتی ہے ۔ کیونکہ سماج میں اس کی عزت اور مرتبہ کا انحصار فوج میں اس کے عہدہ پر ہوتا ہے ۔ جمہوری ملکوں میں اکثر افسروں کے پاس تنخواہ کے سوا کوئی اور جائیداد نہیں ہوتی اور اس کے فوجی اعزاز کے سوا کوئی اور امتیاز نہیں ہوتا ۔ نتیجتہً جب اس کے فرائض بدل جاتے ہیں تو اس کی قسمت بھی بدل جاتی ہے ۔ اور اسے از سر نو زندگی شروع کرنا پڑتی ہے ۔ اشرافی معاشرہ میں جس چیز کو ضمنی حیثیت حاصل ہے وہ جمہوری معاشرہ میں سب سے زیادہ اہم ہے ۔

قدیم فرانسیسی شہنشاہیت کے تحت افسروں کو ان کے خاندانی خطاب سے پکارا جاتا تھا ۔ لیکن اب انھیں ان کے فوجی درجہ کے لحاظ سے پکارا جاتا ہے ۔ یہ ذرا سی تبدیلی اس بات کی شاہد ہے کہ معاشرہ کی ہیئتِ ترکیبی میں جو انقلاب آیا ہے وہ فوج میں بھی آچکا ہے ۔

جمہوری فوجوں میں ترقی کی خواہش ہمہ گیر ہوتی ہے ۔ لیکن زمانۂ امن میں ترقی کے امکانات جن افواج میں سب سے کم ہوتے ہیں وہ جمہوری افواج ہیں چونکہ فوجی عہدوں

کی تعداد محدود ہوتی ہے اور خواہشمندوں کی تعداد کہیں زیادہ، اور چونکہ مساوات کے اصول ہر جگہ یکساں ہوتے ہیں، اس لیے کوئی شخص تیزی سے ترقی نہیں کر سکتا ہے اور بعض تو ترقی ہی نہیں کر پاتے۔ اور یہ بات ترقی کی خواہش پر تازیانہ کا کام دیتی ہے اس لیے جمہوری فوجوں کی آرزو اور خواہش یہ ہوتی ہے کہ جنگ ہو۔ کیونکہ جنگ کی وجہ سے نئی آسامیاں خالی ہوتی ہیں اور جنگ کی ضروریات سنیارٹی کے قانون کو توڑنے پر مجبور کرتی ہیں۔

اس بحث کے بعد ہم جو نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ جو افواج جنگ کی خواہشمند ہوتی ہیں وہ جمہوری ملکوں کی افواج ہوتی ہیں۔ اور اقوام میں صرف جمہوری قوام ہی زیادہ امن پسند ہوتی ہیں۔ اور ان حقائق کو غیر معمولی اہمیت دینے والا عنصر یہ ہے کہ نظریۂ مساوات متضاد قسم کے اثرات پیدا کرتا ہے۔

جمہوری معاشرہ کے افراد، جو آپس میں ہم مرتبہ ہوتے ہیں۔ اپنی حالت کو بہتر بنانے کے آرزومند اور کوشاں ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ امن چاہتے ہیں۔ دوسری طرف جمہوری فوج کے ارکان بھی اپنی حالت ہی کو بہتر بنانے کے لیے جنگ چاہتے ہیں۔ تاکہ انھیں جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھانے اور دوسروں کے مقابلے میں اپنی اہمیت اور قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کا موقع ملے۔ دونوں صورتوں میں اصل محرک ایک ہی ہے۔ دونوں صورتوں میں زندگی کی مسرتوں میں اضافہ کی خواہش کارفرما ہے لیکن ان کی تسکین کے ذرائع مختلف ہیں۔

قوم اور فوج کے یہ متضاد رجحانات، جمہوری معاشرہ کے لیے ایک زبردست خطرہ ہیں۔ جب کوئی قوم عسکری جذبہ کو ترک کر دیتی ہے تو پیشۂ سپہ گری باعثِ افتخار نہیں رہتا اور فوجی ادنیٰ ترین سرکاری ملازم تصوّر کیے جاتے ہیں۔ ان کی نہ عزت کی جاتی ہے۔ اور نہ ان کی بات سنی جاتی ہے۔ اور اشرافی معاشرہ کے بالکل

برعکس صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اس لیئے فوج میں جو لوگ داخل ہوتے ہیں وہ گھٹیا درجے کے ہوتے ہیں۔ فوج کا پیشہ وہی اختیار کرتا ہے۔ جسے اور کوئی پیشہ نہیں ملتا۔ اسباب وعلل کا ایک چکر شروع ہوتا ہے جس سے بچ کر نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ قوم کا بہترین حصّہ فوجی ملازمت سے اجتناب کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ باعث عزت نہیں ہے۔ اور پیشہ کی عزت اس لیے باقی نہیں رہتی کہ قوم کا بہترین حصّہ اس میں شریک نہیں ہوتا۔

اس لیے یہ بات باعث حیرت نہیں ہے کہ جمہوری ملکوں کی فوجیں عام طور پر بے چین، بدمزاج اور اپنی حالت سے غیر مطمئن رہتی ہیں۔ اگرچہ ان کی طبعی حالت عام طور پر بہتر ہوتی ہے۔ لیکن ان میں نظم وضبط کا فقدان ہوتا ہے۔ سپاہی یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ کمتر حیثیت کا مالک ہے اور اس کا یہ زخم خوردہ احساس تفخر ملک میں ایسے جنگ وجدل کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ اس کی خدمات ضروری اور اہم سمجھی جائیں۔ یا اس میں انقلاب پیدا کرنے کی خواہش پیدا کرتا ہے تاکہ وہ اس دوران میں سیاسی اثر اور شخصی اہمیت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جس سے وہ محروم ہے۔

جمہوری فوجوں کی ہیئت ترکیبی کی یہ آخرالذکر خصوصیت کافی خطرناک ہے جمہوری معاشروں میں تقریباً ہر شخص کچھ نہ کچھ جائیداد کا مالک ہوتا ہے لیکن جمہوری فوجوں کی عنانِ قیادت عام طور پر بے جائیداد لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور ان میں سے اکثر کو جنگ اور خونریزی میں مال وجائیداد کھونے کا اندیشہ نہیں رہتا۔ ایک طرف تو آبادی کی اکثریت جنگ اور انقلابات سے خوف کھاتی ہے۔ لیکن فوج کے لیڈر عام طور پر جنگ پسند کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں چونکہ جمہوری ملکوں کے تعلیم یافتہ، متمول اور قابل ترین لوگ شاذ ونادر

ہی فوج کا پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ اس لیے فوج بحیثیت مجموعی ایک چھوٹی سی قوم کے مانند بن جاتی ہے۔ جہاں عام آبادی کی بہ نسبت لوگوں کا نقطہ نظر تنگ، عادات اور آداب ناشائستہ ہوتے ہیں۔ مگر یہی غیر مہذب چھوٹی قوم ہتھیاروں کی مالک ہوتی ہے۔ اور وہی ان کا استعمال جانتی ہے۔ اس کے برعکس عام آبادی کا مزاج امن پسند ہوتا ہے۔ اور اس طرح ان کی امن پسندی کو فوجوں کی جنگ جدل پسندی سے ہمیشہ خطرہ رہتا ہے۔ امن پسند اور غیر جنگجو اقوام کے لیے اس کی فوج سے زیادہ خطرناک اور کوئی شے نہیں ہوتی۔ لوگوں کی امن اور عاقبت کوشی کی بنا پر ملک کا آئین بالکلیہ فوجوں کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔

بطور کلیہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ایک طرف تو جمہوری اقوام اپنی مخصوص عادات اور خصوصیات کی بنا پر فطرتاً امن پسند ہوتی ہیں تو دوسری طرف ان کی فوجیں جمہوری اقوام کو انقلابات اور جنگوں کی طرف لے جاتی ہیں۔ اشرافی ملکوں میں فوجی انقلابات کے خدشات کم رہتے ہیں اور جمہوری ملکوں میں ان کا ہر وقت خطرہ لاحق رہتا ہے۔

جب کوئی جمہوری قوم یہ محسوس کرتی ہے کہ اس کی فوج میں بے چینی پیدا ہو رہی ہے۔ تو معاً اس قوم کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ اس بے چینی کو رفع کرنے اور فوجوں کے حوصلہ مندی کے جذبات کی تسکین کے لیے جنگ کرنا چاہیے۔ میں یہاں جنگ کی برائیاں گنانا نہیں چاہتا۔ جنگ تو انسان میں وسعتِ نظر پیدا کرتی ہے اور انسانوں کے کردار کو بلند کرتی ہے۔ اور بعض خاص حالات میں جنگ ہی ایسا واحد آلہ کار ہے۔ جس کے ذریعہ بعض ایسی خرابیوں کو روکا جا سکتا ہے جو معاشرہ میں مساوات کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور جمہوری قوموں کے لیے بعض مہلک بیماریوں کا واحد علاج ہے۔

بے شک جنگ کے بڑے فوائد ہیں۔ لیکن ہمیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیئے کہ جنگ ان خطرات کی روک تھام کر سکتی ہے۔ جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ جنگ کی وجہ سے اس خطرہ کے ظہور میں تاخیر تو ہو جاتی ہے۔ لیکن جنگ کے خاتمہ کے بعد وہ اپنی پوری قوت سے پھر منڈلانے لگتے ہیں۔ کیونکہ ایسی افواج جنہیں جنگ و جدل کا چسکا لگ چکا ہو۔ حالتِ امن میں چین سے بیٹھ نہیں سکتیں۔ جنگ ایسی ہی اقوام کے لیے علاج کا کام دیتی ہے۔ جن کی عسکری فتوحات کی پیاس کبھی نہ بجھتی ہو۔

میں یہ پیشگوئی نہیں کر سکتا کہ جمہوری اقوام میں جو بھی عسکری حکمران پیدا ہوں گے ان کے لیے یہ آسان ہو گا کہ فوجوں کی مدد سے نئی نئی فتوحات کی جائیں بہ نسبت اس کے کہ فتوحات کے بعد قوموں کو پرسکون رکھ سکیں۔ جمہوری قوموں کے لیے جنگ کا آغاز کرنا اور پھر جنگ کو بند کرنا دونوں مشکل ہیں۔

جہاں جمہوری ملکوں کو جنگ سے بعض فائدے پہنچتے ہیں۔ وہاں بعض ایسے خطرات بھی پیدا ہوتے ہیں جن کا اندیشہ اشرافی ملکوں میں نہیں رہتا۔ ان میں سے چند خطرات کا ذکر کروں گا۔

اگرچہ جنگ فوج کے جذبۂ خونریزی کی تسکین کرتی ہے۔ لیکن جنگ سے ہزارہا لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ جن کے متعدد امور کی تسکین کے لیے امن کی حالت ضروری ہے۔ اس طرح جس انقلاب اور بحران سے بچنے کے لیے جنگ چھیڑی تھی۔ اس انقلاب کا ایک اور شکل میں رونما ہونے کا اندیشہ ہر وقت رہتا ہے۔

طویل جنگیں جمہوری ملکوں کی آزادی کو خطرہ میں ڈالے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ بے شک خطرہ یہ نہیں رہتا ہے کہ ہر فتح کے بعد فتحیاب جرنل ملک کی تمام برتر طاقت اور اختیار کو سیلا اور سیزر کی طرح بزورِ قوت غصب کر لے۔ خطرہ

کی نوعیت دوسری ہے۔ جنگ کی وجہ سے جمہوری معاشروں میں ہمیشہ فوجی حکومتیں قائم نہیں ہوتیں۔ لیکن جنگ ملک کی حکومت کے اختیارات میں غیر معمولی اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ جنگ کے دوران حکومت کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ تمام وسائل اور اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لے۔ اگر اس سے ملک میں استبداد قائم نہ بھی ہوا تو لوگ ذہناً اس کے لیے خاموشی سے تیار ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ جمہوری ملکوں میں آزادیوں کو تباہ کرنا چاہتے ہیں انھیں جاننا چاہیے کہ جنگ ان کے مقصد کی تکمیل کے لیے واحد طریقہ ہے۔

سپاہیوں اور افسروں کی امنگوں اور ترقی کی خواہشات جب خطرناک دور میں داخل ہو جائیں۔ تو اس کے علاج کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ فوج میں اضافہ کر کے عہدوں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ مگر یہ علاج عارضی نوعیت کا ہے اور ملک کو شدید مصائب میں مبتلا کر سکتا ہے۔ اشرافی ملکوں میں فوج میں اضافہ سے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر شخص کو اپنی وقعت اور حدود کا علم ہوتا ہے لیکن جمہوری اقوام میں فوج میں توسیع سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جمہوری ملکوں میں امیدواروں کی تعداد ہمیشہ خالی جگہوں سے زیادہ ہو گی اور یہ لوگ بدستور غیر مطمئن رہیں گے۔ بلکہ ان کی بے چینی میں اضافہ ہی ہوتا رہے گا۔

میرا خیال ہے کہ جمہوری فوجوں کے مزاج ہی میں ہنگامہ پسندی اور بے چینی ہوتی ہے۔ اور یہ مرض لاعلاج ہے۔ اور ملک کے قانون ساز اگر اپنی ساری توانائیاں بھی صرف کر دیں تو کوئی موثر علاج دریافت نہیں کر سکتے۔

ان برائیوں کا علاج فوج کے اندر نہیں بلکہ ملک کے اندر تلاش کرنا چاہیے۔ جمہوری اقوام فطری طور پر ہنگامہ و فساد اور استبداد سے ڈرتی ہیں۔ مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ان جبلی خواہشات کو دانشمندی کے ساتھ قوم کی عادات اور مذاق

میں مستقل طور پر شامل کر دیا جائے۔ جب لوگ آزادی کا مفید اور پر امن استعمال سیکھ جاتے ہیں اور اس کی برکتوں اور فوائد کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اور جب وہ نظم اور امن سے محبت کرتے ہوئے اپنے آپ کو اپنی مرضی سے نظم و ضبط کے اصولوں کا پابند بنائیں گے تو یہی لوگ جب فوج میں شامل ہوں گے اپنے ساتھ غیر ارادی طور پر ہی سہی ان عادتوں کو لے جائیں گے۔ قوم کی مجموعی سپرٹ فوج میں بھی سرایت کر جائے گی۔ اس لیے پہلے شہریوں کو تعلیم یافتہ، منظم، آزاد اور مضبوط مزاج بنائیے تو سپاہی بھی منظم اور اطاعت شعار بن جائیں گے۔

۵۰۔ جمہوری افواج کی چند خصوصیات

طویل عرصۂ امن کے بعد، اگر جنگ چھڑ جائے تو ابتدا میں کسی بھی فوج کے شکست کھانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جو فوج طویل عرصہ تک جنگ و جدل میں مصروف رہی ہو۔ اس کی فتحیابی کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور اس صداقت کا بطور خاص اطلاق جمہوری ملکوں کی افواج پر ہوتا ہے۔ اشرافی ملکوں میں پیشۂ سپہ گری، ایک خاندانی اعزاز ہوتا ہے۔ اور زمانۂ امن میں بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان ملکوں میں قابل ترین اور شریف ترین لوگ اس پیشہ کو اختیار کرتے ہیں۔ فوج ہمیشہ قوم ہی کی سطح پر اور بسا اوقات قوم سے برتر تصور کی جاتی ہے۔

لیکن جمہوری ملکوں میں اچھے ذہن فوج سے دُور رہتے ہیں۔ اور زندگی کے دوسرے میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ طویل عرصہ تک امن رکھنے کے بعد۔ اور جمہوریتوں میں امن کا زمانہ طویل ہی ہوتا ہے —— فوج اپنی قوم سے پست تر رہتی ہے اور ایسی حالت میں جب ملک کو اس فوج کی خدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو اس سے ملک اور فوج دونوں کی سلامتی خطرہ میں رہتی ہے۔

میں نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ جمہوری ملکوں میں زمانۂ امن میں فوجی ملازمت میں ترقی کے لیے سنیارٹی کا اصول برتر اور غیر لچکدار ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان ملکوں میں افسروں کے فوجی اعزاز ہی ان کے لیے سب کچھ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے سماج میں اپنے فوجی مرتبہ کے لحاظ سے ہی قدر اور وقعت سے دیکھے جائیں گے۔ چونکہ فوج سے باہر ان کی اپنی کوئی جائیداد یا حیثیت نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ فوج سے سبکدوش

نہیں ہوتے اور آخر عمر تک فوج ہی سے وابستہ رہتے ہیں۔ ان دونوں عوامل کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طویل امن کے بعد جنگ چھڑ جاتی ہے تو فوج کے تقریباً تمام بڑے افسر عمر رسیدہ لوگ ہوتے ہیں۔ یہ حال جرنیلوں کا ہی نہیں ہے۔ بلکہ تمام نان کمشنڈ افسروں کا بھی ہے جو اس دوران میں یا تو ایک ہی عہدہ پر رہتے ہیں یا زینہ بہ زینہ بتدریج ترقی کرتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ بات خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ جمہوری ملکوں میں تمام سپاہی کم عمر لڑکے ہوتے ہیں۔ اور تمام افسر اپنی زندگی کی آخری منزلوں میں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اول الذکر میں تجربہ کی کمی ہوتی ہے اور ثانی الذکر میں توانائی کا فقدان ہوتا ہے اور شکست کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔ کیونکہ کامیاب سپہ سالاری کی اولین شرط جوانی ہے میں یہ رائے ظاہر کرنے کی جرأت نہ کرتا اگر اس خیال کا اظہار ہمارے اس دور کے ایک انتہائی کامیاب فوجی افسر نے کیا نہ ہوتا۔

اشرافی ملکوں کی افواج پر یہ دو عوامل اثر انداز نہیں ہوتے۔ چونکہ لوگوں کو ترقی سنیارٹی سے زیادہ ان کے پیدائشی حقوق کی بنا پر ملتی ہے۔ اس لیے فوج کی ہر صف اور ہر درجہ میں ایسے نوجوانوں کی کمی نہیں ہوتی جو اپنے جسم اور ذہن کی توانائی ساتھ لاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اشرافی ملکوں میں جو نوجوان فوج میں شامل ہوتے ہیں۔ معاشرہ میں ان کی حیثیت متعین ہوتی ہے۔ چنانچہ کم ہی لوگ بوڑھے اور از کار رفتہ ہونے تک فوج سے چمٹے رہتے ہیں۔ جوانی کا بہترین حصّہ فوج میں گزارنے کے بعد وہ اپنی خوشی سے ریٹائر ہو جاتے ہیں اور اپنی زندگی کے باقی ایام گھر ہی گزارتے ہیں۔

طویل زمانہ امن، جمہوری فوجوں کے افسروں کو نہ صرف بوڑھا کر دیتا ہے بلکہ ان میں ذہنی اور جسمانی طور پر ایسے عادات پیدا کرتا ہے جو زمانہ جنگ کے لیے انتہائی غیر موزون ہوتے ہیں۔ جمہوری ماحول اور معاشرہ کے خاموش اور پر امن ماحول

میں بڑا حصہ گزارنے کے بعد وہ جنگ کے مشقت طلب اور صبر آزما فرائض کو انجام دینے کے اہل نہیں رہتے۔ اور اگر فنونِ حرب سے ان کی وابستگی میں کمی نہ بھی آئی ہو تو ان کی سابقہ طرزِ زندگی انہیں جنگی فتوحات کے نا قابل بنا دیتی ہے۔

اشرافی ملکوں میں، شہری زندگی کی مسرتیں فوج کے عادات اور اطوار پر اس طرح اثر نہیں ڈال سکتیں۔ کیونکہ ان ملکوں میں فوج کی کمان اشرافی طبقات کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور اشرافی طبقات، خواہ کتنے ہی عیاشی میں مبتلا کیوں نہ ہوں اپنی شخصی بہبود کے علاوہ وہ مزید بے شمار دلچسپیوں اور جذبات کے حامل ہوتے ہیں اور ان کی تکمیل کے لیے وہ بسا اوقات اپنی ذاتی بہبود اور آرام کو بھی قربان کر دیتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ جمہوری ملکوں کی فوج میں زمانۂ امن میں ترقی کی رفتار سست ہوتی ہے۔ فوجی افسر ابتدا میں تو اس صورتِ حال کا بے صبری سے مقابلہ کرتے ہیں۔ بعد میں وہ اشتعال پذیر، بے چین اور برانگیختہ رہتے ہیں۔ لیکن بعد میں وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ کچھ فیصلہ کرتے ہیں۔ جن کی امنگیں اور خواہشیں زیادہ ہوتی ہیں اور جن کے پاس کچھ وسائل بھی ہوتے ہیں۔ فوج کو ترک کر دیتے ہیں۔ اور دوسرے جو فوج کی زندگی کے تھوڑے بہت عادی ہو جاتے ہیں۔ فوج کو بھی ایک پیشہ سمجھ کر اس سے ہمیشہ کے لیے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ فوجی ملازمت کو محض ایک ایسا پیشہ تصور کرتے ہیں۔ جس میں ان کا روزگار محفوظ ہے۔ اور اس بنا پر وہ اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ سکون اور امن سے اس پیشہ کے فائدوں سے لطف اٹھائیں۔ غرض یہ کہ امن کا طویل زمانہ نہ صرف فوج میں بوڑھوں کو بھر دیتا ہے۔ بلکہ ان لوگوں میں بوڑھوں کا نقطۂ نظر پیدا کرتا ہے جو ابھی جوان ہیں۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا ہے کہ جمہوری ملکوں میں زمانۂ امن میں سپہ گری کو باعث عزت نہیں سمجھا جاتا۔ اور جو لوگ اس پیشہ میں ہوتے ہیں۔ ان میں جوش و خروش کا فقدان ہوتا ہے۔ عوام کی نظروں میں یہ بے وقعتی فوج کی حوصلہ شکنی کا باعث رہتی ہے اور فوجوں کے ذہن پہ ایک بڑا بار بنی رہتی ہے۔ اور جب جنگ شروع ہوتی ہے تو وہ ایک دم اپنی توانائی اور جوش کو اُٹھا نہیں کر سکتے۔ اشرافی ملکوں کی فوج میں یہ اخلاقی کمزوری نہیں ہوتی۔

غرض ان متعدد وجوہ کی بنا پہ میری یہ رائے ہے کہ طویل زمانۂ امن کے بعد اگر کسی جمہوری ملک کو جنگ کا سامنا کرنا پڑے تو ابتدا میں اسے فوری شکست کا خطرہ قبول کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس قسم کی ابتدائی شکستوں سے انھیں دل شکستہ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ جمہوری فوجوں کی کامیابی کے امکانات میں جنگ کی طوالت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جب جنگ طویل عرصہ تک جاری رہتی ہے تو وہ معاشرہ کے تمام لوگوں کو ان کے پر امن پیشوں اور مشاغل سے ہٹا کر بیدار کر دیتی ہے۔ اور ان کے چھوٹے چھوٹے کاموں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ایسی صورت میں وہی جذبات اور احساسات جو ان لوگوں کو امن سے وابستہ کیے ہوئے تھے۔ ہتھیار اٹھانے پر آمادہ کرتے ہیں۔ جنگ جس نے ملک کا سارا کاروبار تباہ کر دیا ہو۔ خود ایک بڑے کاروبار کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہی جمہوری اقوام جو جنگ و جدل سے اس قدر بیزار ہوتی ہیں۔ بعض اوقات میدانِ جنگ میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیتی ہیں۔

جیسے جیسے جنگ لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف مبذول کرتی ہے اور جیسے جیسے مختصر مدت میں شہرت اور تمول کا سرچشمہ بنتی ہے۔ ملک کے بہترین اور منتخب عناصر فوجی پیشہ اختیار کرتے ہیں اور فوج میں ملک کا بہترین اور ذہین ترین

حصہ شامل ہو جاتا ہے ۔ چونکہ فوجی اعزازات کے امیدواروں کی تعداد بے پناہ ہوتی ہے اور جنگ ہر شخص کو اس کی اپنی مناسب سطح پر لا سکتی ہے اس لیے اس دوران میں بڑے بڑے جنرل پیدا ہوتے ہیں ۔ ایک طویل جنگ جمہوری فوج پر وہی اثر مرتب کرتی ہے جو انقلاب لوگوں پر ڈالتا ہے۔ جنگ کے زمانے میں قاعدے اور قانون بے اثر ہو جاتے ہیں ۔ اس لیے غیر معمولی ذہانت اور صلاحیت کے لوگوں کو عام سطح سے بلند ہونے کا موقع ملتا ہے ۔ عمر رسیدہ افسر یا تو ہٹا دیے جاتے ہیں یا مر جاتے ہیں اور ان کی جگہ سخت کوش نوجوان حاصل کر لیتے ہیں ۔ ان کی زندگی کی تمنا ترقی اور پیش قدمی ہوتی ہے ۔ اور دوسرے لوگ بھی ان کی پیروی کرتے ہیں ۔ مساوات کا اصول سب کے لیے ترقی کی راہیں کھول دیتا ہے ۔ اور سپاہیوں اور افسروں کی موت دوسروں کی امنگوں کی تکمیل کا موقع مہیا کرتی ہے ۔

علاوہ ازیں فوجی کردار اور جمہوریتوں کے کردار میں ایک پوشیدہ رشتہ بھی ہے ۔ جو صرف جنگ کے زمانے میں ظاہر ہوتا ہے ۔ جمہوری ملکوں کے لوگ فطری طور پر ان چیزوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ جنھیں وہ پسند کرتے ہیں ۔ اور چاہتے ہیں کہ پرسکون طریقے پر ان چیزوں سے لطف اٹھائیں ۔ اور وہ حادثات سے نہیں ڈرتے اور مشکلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے موت سے بھی لڑ جاتے ہیں ۔ اور وہ یہی سپرٹ اور جذبہ تجارت اور صنعت میں لے جاتے ہیں اور جب ان جذبات کو لے کر وہ میدان جنگ میں جاتے ہیں تو وہاں اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے سے نہیں گھبراتے ۔ تاکہ انھیں فتح کا انعام مل سکے ۔ جمہوری لوگوں کے لیے عسکری عظمت سے زیادہ کوئی چیز باعث کشش نہیں ہوتی ۔ کیونکہ یہ عظمت یکدم

اور شان و شوکت سے حاصل ہوتی ہے اور اس کے لیے جان کے سوا کسی اور چیز کو خطرہ میں ڈالنا نہیں پڑتا۔

غرض یہ کہ جہاں جمہوری معاشرہ کے مفادات اور ذوق لوگوں کو جنگ سے دُور رکھتے ہیں وہیں ان کی عادتیں جنگوں کو طویل عرصہ تک جاری رکھنے کے لیے موزون ہیں۔ جمہوری لوگوں کو ان کے کاروبار اور مسرتوں سے ہٹا دیا جائے تو وہ بہترین سپاہی بن جاتے ہیں۔

۵۱۔ جمہوری ممالک اور جنگ

مساوات کے اصول کا جب عام چرچا ہو رہا ہو اور مساوات نہ صرف ایک قوم بلکہ متعدد ہمسایہ قوموں میں قائم ہو رہی ہو تو ان مختلف ملکوں کے باشندے اپنی زبان، تہذیب، رسوم، روایات اور قوانین کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور جنگ سے وہ یکساں طور پر نفرت کرتے ہیں اور اسی تناسب سے انھیں امن سے محبت ہوتی ہے۔ غرض کہ اس نوع کے متعدد عوامل ان ملکوں میں جنگ کو ناپید کر دیتے ہیں۔

جیسے جیسے مساوات، بہ یک وقت متعدد ملکوں میں پھیلتی اور نشوونما پاتی ہے۔ ان ملکوں کے لوگ تجارت اور صنعت کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ نہ صرف ان کے مذاق میں یکسانیت پیدا ہوتی ہے بلکہ خود ان کے مفادات بھی ایک ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی قوم اپنے آپ کو نقصان پہنچائے بغیر دوسری قوم کو نقصان پہنچانے کا خیال دل میں نہیں لا سکتی۔ اور بالآخر تمام قومیں جنگ کو ایک ایسی آفت تصور کرنے لگتی ہیں جو فاتح اور مفتوح دونوں کے لیے تباہ کن ہے۔

اس طرح ایک طرف تو جمہوری دور میں قوموں میں باہمی جنگ کا چھڑنا بے حد مشکل ہوتا ہے تو دوسری طرف اگر ایسی کوئی دو قومیں بھی آپس میں نبرد آزما ہو گئیں تو دوسری اقوام اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ سب کے مفادات آپس میں اس قدر ملے جلے ہوتے ہیں اور ان کی ضروریات میں اس قدر یکسانیت ہوتی ہے کہ جب دو قومیں آپس میں دست بگریباں ہوں تو دوسرے خاموش

نہیں بیٹھ سکتے۔ اگرچہ جنگیں شاذ ہی لڑی جاتی ہیں۔ لیکن جب جنگیں چھڑ جاتی ہیں تو وہ وسیع علاقہ پر پھیل جاتی ہیں۔

ہمسایہ جمہوری اقوام نہ صرف بعض باتوں میں ایک دوسرے سے مشابہ ہوتی ہیں بلکہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ہر بات میں مشابہ ہو جاتی ہیں۔ قوموں کی باہمی مشابہت جنگوں کے سلسلے میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔

پندرھویں صدی کے اوائل میں یورپ کی طاقتور ترین اقوام بھی ہلوینک کانفڈریشن سے کانپ اٹھتی تھیں۔ لیکن آج اسی ملک کی طاقت، اس کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوئٹزرلینڈ کے لوگ آج اپنی ہمسایہ مملکتوں کے مشابہ ہو گئے ہیں اور سوئٹزرلینڈ کے ہمسایہ ممالک کے باشندے سوئس باشندوں کے مشابہ۔ اور اس کے بعد دونوں میں فرق صرف عددی طاقت کا رہ گیا ہے اس طرح یورپ میں جو جمہوری انقلاب جاری ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں عددی طاقت کو غلبہ ہو رہا ہے اور اس کی وجہ سے چھوٹی ریاستیں اپنے آپ کو بڑی ریاستوں میں مدغم کر رہی ہیں یا بڑی ریاستوں کی پالیسی اختیار کر رہی ہیں۔

چونکہ میدانِ جنگ میں کامیابی کے لیے عددی طاقت ہی کو اہمیت حاصل ہے اس لیے ہر ملک کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو میدانِ جنگ میں لائے۔ جس زمانے میں خاص قسم کے فوجی دستوں مثلاً سوئس پیادہ فوج یا فرانسیسی شہسوار دستے کی بھرتی ممکن تھی۔ بڑی بڑی فوجوں کی تشکیل کو غیر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مگر یہ صورتِ حال اس وقت بدل جاتی ہے۔ جب ایک سپاہی، بلکہ دوسرے سپاہی کی طرح بہتر ہو۔

وہی علت جو ایک نئی ضرورت پیدا کرتی ہے۔ اس کی تکمیل کے ذرائع بھی مہیا

کرتی ہے۔ اس لیے کہ جب تمام لوگ ایک ہی قسم کے ہوں تو وہ کمزور بھی ہوتے ہیں اور جمہوری ملکوں کی حکومت کی برتر طاقت اور ملکوں کی بہ نسبت زیادہ قوی ہوتی ہے۔ اور جب یہ اقوام ملک کی ساری آبادی کو فوج میں بھرتی کرنا چاہتی ہیں تو ان کے پاس اس مقصد کی تکمیل کے ذرائع اور وسائل بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ جمہوری ملکوں میں جنگ سے محبت تو کم ہوتی ہے لیکن فوجیں بڑی ہوتی ہیں۔

جمہوری ملکوں میں، اسی سبب سے، جنگ جاری رکھنے کے طریقہ کو بدلنا پڑتا ہے، میکاولی نے اپنی تصنیف "دی پرنس" میں لکھا ہے کہ ایسی قوم کو مطیع کرنا بے حد مشکل ہوتا ہے۔ جن کا ایک بادشاہ ہو اور بادشاہ کے امرا عوام کی قیادت کریں۔ بہ نسبت ایسی قوم کے جس پر بادشاہ اور اس کے غلاموں کی حکومت ہو" میکاولی کے اس مقولے میں لفظ "غلاموں" کی جگہ "سرکاری ملازم" استعمال کیا جائے۔ تو اس کا پورا پورا اطلاق ہمارے اس دور پر بھی ہو سکتا ہے۔

عظیم اشرافی اقوام نہ تو آسانی سے اپنے ہمسایہ ملک کو فتح کر سکتی ہیں اور نہ آسانی سے زیر ہو سکتی ہیں۔ وہ فتح اس لیے نہیں کر سکتیں کہ وہ اپنی تمام قوتوں کو کبھی بھی ایک جگہ اور طویل عرصہ تک مجتمع نہیں کر سکتیں اور وہ زیر اس لیے نہیں ہو سکتیں کہ دشمن کو ہر جگہ اور ہر قدم پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اشرافی ملکوں کے خلاف جنگ کو پہاڑی علاقوں کی جنگ سے مشابہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جہاں شکست خوردہ فریق کو اپنی قوت جمع کرنے اور کسی جگہ سے مدافعت کرنے کا ہمیشہ موقع حاصل رہتا ہے۔

جمہوری ملکوں میں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ وہ ساری فوج کو یکدم میدان میں لا سکتے ہیں اور جو قوم جس قدر زیادہ متمول اور آباد ہوگی وہ فتحیاب ہوگی۔ لیکن اگر وہ مفتوح ہو گی اور اس کے علاقہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ تو پھر وہ اپنی قوت جمع ہی نہیں کر سکتی اور اگر دشمن نے ملک کے صدر مقام پر قبضہ کر لیا تو پھر ملک ہاتھ سے

نکل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوری معاشرہ میں ہر شخص الگ الگ اور انفرادی طور پر کمزور رہتا ہے اور معاشرہ کے کسی فرد میں نہ اپنی آپ مدافعت کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ دوسروں کو ایک مرکز پر جمع کر سکتا ہے۔ جمہوری ملک میں سب سے زیادہ طاقتور حکومت ہے۔ فوج کی تباہی کے بعد حکومت کی فوجی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ اور صدر مقام پر دشمن کے قبضہ کے بعد ملک کا نظم و نسق مفلوج ہو جاتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ عوام کا انبوہ ہے۔ جس کے پیچھے نہ حکومت کی طاقت ہوتی ہے اور نہ وہ ادنیٰ حملہ کی مزاحمت کے قابل ہوتا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ اس خطرہ کو مقامی آزادیوں کو فروغ دے کر کم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ تدبیر ناکافی ثابت ہوتی ہے۔

اگرچہ مہذب اقوام کے قانون کے مطابق جنگ کا مقصد لوگوں کی انفرادی جائیداد اور ملکیت کو ضبط کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف سیاسی اقتدار پر قبضہ کیا جاتا ہے۔ ثانی الذکر مقصد کے حصول کے لیے لوگوں کی جائیداد شاذ صورتوں میں ضبط کی جاتی ہے۔

اشرافی ملکوں میں فوج کی شکست کے بعد، امراء جو معاشرہ کے متمول ترین افراد ہوتے ہیں۔ انفرادی طور پر دشمن کی مزاحمت کرتے رہیں گے۔ کیونکہ اگر فاتح نے ملک پر قبضہ جما لیا تو وہ انھیں ان کے سیاسی اقتدار سے بھی محروم کر دے گا۔ جس کو وہ مال و دولت سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اور اسی بنا پر وہ حملہ آور کی مدافعت کرتے ہیں اور وہ آسانی سے عوام کو اپنے ساتھ شامل کر لیتے ہیں کیونکہ لوگ سالہا سال سے ان کی اطاعت اور پیروی کے عادی ہوتے ہیں۔

جمہوری اقوام میں جہاں مساوات کارفرما رہتی ہے، انفرادی طور پر ہر شخص کا سیاسی اقتدار میں برائے نام حصہ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ہر شخص آزاد ہے اور

ہر ایک کے پاس کچھ نہ کچھ مال و متاع ہوتا ہے۔ اس لیے جمہوری ملکوں کے لوگوں کو مفتوح ہونے کا خوف نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اس صورت میں ان کی جائیداد محفوظ رہے گی۔ اس لیے جمہوری ملکوں کی آبادی جنگ کے شعلوں کے ان کی سرحدیں پہنچنے کے بعد یہ فیصلہ نہیں کر پاتی کہ اسے ہتھیار اٹھانا چاہیے یا نہیں۔ اس لیے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جمہوری ملکوں کے باشندوں کے کردار میں وہ خصوصیات پیدا کی جائیں جو اشرافی ملکوں کے امرا کے کردار میں ہوتی ہیں۔

جمہوری ملکوں کے حکمرانوں اور قائدین کو یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ آزادی کی محبت اور عادت ہی، جسمانی بہبود اور راحت کی محبت پر غلبہ پا سکتی ہے۔ ایسی آزاد اقوام، جن کے پاس آزاد ادارے نہ ہوں، جنگ میں شکست کے بعد آسانی سے اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔

پرانے زمانے میں میدان جنگ میں سپاہیوں کی ایک مختصر سی جماعت بھیجی جاتی جو چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتے اور یہ فوجیں طویل عرصہ تک محاصرے کیا کرتی تھیں۔ لیکن اب طریقِ حرب بدل گیا ہے۔ اب یک دم فیصلہ کن جنگیں لڑی جاتی ہیں۔ اور جوں ہی پیش قدمی کے لیے راہ کھل جاتی ہے تو فوجیں فوراً ملک کے صدر مقام کا رخ کرتی ہیں۔ تاکہ ایک ہی ضرب میں دشمن کو زیر اور جنگ کو ختم کیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ نپولین اس طریقہ جنگ کا موجد تھا۔ لیکن جنگ کے اس طریقے کی ایجاد کا سہرا کسی ایک شخص کے سر نہیں باندھا جا سکتا۔ خواہ وہ شخص کس قدر بڑا ہو۔ نپولین نے جس طریقہ جنگ کو جاری کیا۔ وہ در اصل اس کے دور کے معاشرہ کی پیداوار تھا۔ وہ طریقہ اس لیے کامیاب رہا کہ وہ اس معاشرہ کی ضروریات کے عین مطابق تھا۔ اور نپولین نے پہلی مرتبہ اسے آزمایا۔ نپولین

پہلا سپہ سالار تھا۔ جس کی قیادت میں افواج ایک پایۂ تخت سے دوسرے پایۂ تخت تک پیش قدمی کرتی چلی گئیں۔ لیکن نپولین کی راہ کو ہموار کرنے والا برباد شدہ جاگیرداری معاشرہ تھا۔ اگر تین سو سال پہلے کوئی غیر معمولی شخص نپولین کا طرزِ جنگ اختیار کرتا تو اسے شاید ایسی کامیابی نہ ہوتی۔

اس سلسلہ میں خانہ جنگیوں کا ذکر بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ بیرونی حملوں کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان کا اطلاق بحیثیتِ مجموعی داخلی جنگوں پر بھی ہوتا ہے۔ جمہوری ملکوں کے باشندے فطری طور پر عسکری جذبہ نہیں رکھتے۔ اگر انھیں بحالتِ مجبوری میدان جنگ میں اترنا پڑے تو وہ اس جذبہ کا اکتساب کرتے ہیں۔ یہ بات تو جمہوری قوموں کے مزاج میں داخل ہی نہیں ہے کہ وہ ایک جماعت کے طور پر اٹھیں اور اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر جنگ اور خاص طور پر خانہ جنگی کے خطرات میں جھونک دیں۔ آبادی کے معدودے چند انتہائی جرأت آزما افراد ہی یہ خطرہ قبول کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آبادی کا باقی حصہ بے حس و حرکت رہتا ہے۔

اور بالفرض محال آبادی حرکت کی طرف مائل بھی ہوئی تو اس کی راہ میں مختلف رکاوٹیں رہتی ہیں۔ وہ کسی ایسے قدیم اثر کے تحت نہیں جا سکتے۔ جس کی وہ اطاعت کرسکیں۔ ان کے پاس کوئی مشہور لیڈر نہیں ہوتا کہ ملک کے تمام غیر مطمئن عناصر کو ایک جھنڈے تلے جمع کرے اور نہ ان کے پاس کوئی سیاسی طاقت ہوتی ہے جو حکومت کے خلاف موثر مزاحمت کی تنظیم کرسکے۔

جمہوری ملکوں میں اکثریت کی اخلاقی طاقت بے پناہ ہوتی ہے۔ اور اس کے پاس جو مادی وسائل ہوتے ہیں۔ وہ ان وسائل سے کہیں زیادہ ہوں گے جو اکثریت کے خلاف مجتمع کیے جاسکتے ہیں۔ اس لیے وہ سیاسی جماعت، جو اکثریت کی

ترجمان اور نمائندہ ہوتی ہے۔ اور اکثریت کے نام پر ملک میں اقتدار کی مالک ہوتی ہے۔ تمام مزاحمتوں پر فوری قابو پالیتی ہے۔ وہ مخالفت کو معرضِ وجود میں آنے ہی نہیں دیتی۔ بلکہ پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔

جمہوری اقوام میں جو لوگ انقلاب لانا چاہتے ہیں اپنے مقصد کی تکمیل صرف حکومت کی مشنری پر اچانک قبضہ کے ذریعہ کر سکتے ہیں اور یہ کام جنگ کی بجائے ایک ہی ضرب سے بہتر طور پر تکمیل پا سکتا ہے۔ کیونکہ جب باقاعدہ جنگ شروع ہوجاتی ہے۔ تو وہی جماعت یقینی طور پر کامیاب ہوتی ہے جو مملکت کی نمائندگی کرتی ہے۔

خانہ جنگی صرف ایک صورت میں برپا ہوسکتی ہے۔ وہ یہ کہ فوج دو دھڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ ایک تو حکومتِ وقت کا وفادار ہو اور دوسرا دھڑا بغاوت کا علم بلند کرے۔ فوج ایک چھوٹے سے معاشرہ کے مانند ہوتی ہے۔ جس میں باہمی ربط زیادہ ہوتا ہے۔ چونکہ یہ بے پناہ توانائی اور قوت کی مالک ہوتی ہے۔ اس لیے وہ ایک عرصہ تک اپنی ضروریات کی تکمیل پر بھی قادر ہے۔ اس قسم کی خانہ جنگی بڑی خون آشام ہوگی۔ لیکن یہ طویل عرصہ تک جاری نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ یا تو باغی فوج اپنے وسائل کے بل بوتہ یا اپنی پہلی فتح کے اثر سے حکومت پر قابض ہو جائے گی تو جنگ فوراً رک جائے گی یا اگر جنگ شروع ہو جائے تو فوج کا وہ حصہ جسے حکومت کی تائید حاصل نہیں ہے تباہ کر دیا جائے گا یا خود بخود ہتھیار ڈال دے گا۔ اس بنا پر یہ بات قطعیت سے کہی جا سکتی ہے کہ مساوات کے دور میں خانہ جنگیاں شاذ صورتوں میں برپا ہوں گی اور وہ جلد ختم ہو جائیں گی۔

جزوچہارم

۵۲۔ مساوات اور آزاد ادارے

مساوات کا اصول، جو لوگوں کو ایک دوسرے سے بے نیاز کر دیتا ہے لوگوں میں اپنی مرضی اور رائے کے سوا کسی کی رہنمائی قبول نہ کرنے کی عادت پیدا کرتا ہے۔ اپنے نجی امور میں اور اپنے ہمعصروں سے تعلقات کے سلسلے میں لوگوں کو جو مکمل آزادی حاصل رہتی ہے۔ وہ لوگوں میں حاکمیت اور برتری سے ایک قسم کا حسد پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ چنانچہ جمہوری مساوات کے تحت رہنے والے فطری طور پر آزاد اداروں سے زیادہ وابستہ رہتے ہیں۔ جمہوری دنیا کے کسی شخص کو لیجیے اور اسے کریدیئے تو اس بات کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ تمام حکومتوں میں اس حکومت کو ترجیح دے گا۔ جس کے صدر کا خود اس نے انتخاب کیا ہو اور جس کے انتظام میں اس کا اپنا بھی حصّہ ہو۔

سماجی مساوات کے متعدد سیاسی اثرات ہیں، آزادی سے محبت ہی اہل بصیرت کو سب سے پہلے متاثر اور بزدلوں کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔ ان کی یہ گھبراہٹ بے جا نہیں ہوتی۔ کیونکہ جمہوری ملکوں کی مزاجی کیفیت بے حد نقصان دہ ہوتی ہے۔ چونکہ شہریوں کا ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور جوں ہی ملک کی برتر طاقت ناکام ہو جاتی ہے تو لاقانونی اور بدنظمی اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے۔ ہر شخص کی راہ چونکہ الگ الگ ہوتی ہے۔ اس لیے بالآخر معاشرہ کی عمارت گر جاتی ہے۔

مگر عام طور پر نراج کی برائی سے جمہوری ملکوں کو زیادہ خطرہ نہیں ہوتا۔ کیوں کہ مساوات کا اصول دو رجحانات پیدا کرتا ہے۔ ایک رجحان تو سیدھا آزادی کی طرف لے جاتا اور ممکن ہے کہ یکایک نراج کی طرف دھکیل دے۔ دوسرا رجحان، ایک طویل، زیادہ پوشیدہ لیکن یقینی راستے سے انھیں محکومی اور اطاعت شعاری کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اقوام پہلے رجحان کی شناخت فوراً کرلیتی ہیں اور اس کی مزاحمت کے لیے تیار رہتی ہیں۔ اور وہ غیر شعوری طور پر دوسری راہ پر چل پڑتی ہیں۔

۵۳۔ جمہوری اقوام کے افکار اور اقتدار میں مرکزیت

حکمران اور رعایا کے درمیان ثانوی طاقتوں کا تصور صرف اشرافی اقوام ہی میں فطری طور پر پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان معاشروں میں ایسے بے شمار افراد اور خاندان شامل رہتے ہیں۔ جو عام سطح سے بلند ہوتے ہیں اور جو بہ اعتبارِ پیدائش، تعلیم اور دولت حکمرانی کے اہل ہوتے ہیں۔ جمہوری ملکوں کے لوگوں کے ذہن میں اس تصور کا فقدان ہوتا ہے۔ اسے مصنوعی طور پر پیدا تو کیا جا سکتا ہے۔ مگر بڑی مشکل سے برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس جمہوری، معاشرے' بغیر کسی غور و فکر کے واحد اور مرکزی اقتدار کا تصور رکھتے ہیں۔ جو سارے معاشرے پر بلا واسطہ اثر انداز ہوتا ہے۔ علاوہ' سیاسیات' مذہب اور فلسفہ کے میدان میں جمہوری اقوام کی ذہانت صرف سادہ اور عام تصورات ہی قبول کر سکتی ہے۔ پیچیدہ نظام' جمہوری مزاج سے میل نہیں کھاتے۔ جمہوریت کا مجبوب تصور یہی ہے کہ ایک بڑی قوم ہو۔ جو ایسے شہریوں پر مشتمل ہو۔ جن کی نشو و نما یکساں طریقے پر ہو۔ اور جن پر صرف ایک طاقت کی حکمرانی ہو۔

مرکزی اور واحد اقتدار کے بعد جمہوری لوگوں میں جو دوسرا تصور پیدا ہوتا ہے وہ قوانین میں یکسانیت کا ہے۔ چونکہ ہر شخص مشاہدہ کرتا ہے کہ وہ اور اس کا ہم وطن بالکل ایک جیسے ہیں تو وہ یہ بات ہی سمجھ نہیں سکتا۔ کہ ایک قانون اگر کسی شخص پر لاگو ہو سکتا ہے۔ تو دوسرے پر کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مخصوص مراعات اور حقوق جمہوری طبیعت سے مغائرت رکھتے ہیں۔ ایک قوم کے سیاسی اداروں

میں ذرا سا بھی اختلاف اسے ناگوار گزرتا ہے اور وہ قوانین میں یکسانیت کو بہترین حکومت کی شرطِ اولین تصوّر کرتا ہے۔

اشرافی دور میں لوگ یکساں قانون اور حکومت کے تصور سے بالکلیہ ناآشنا تھے۔

ان متضاد رجحانات نے بالآخر ایسی اندھی جبلّتیں اور عادتیں پیدا کر دی ہیں کہ یہ اب بھی لوگوں کے فعل وعمل پہ اثر انداز ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے حالات اور معاشرہ میں جو فرق اور تنوع تھا۔ اس کے باوجود اس وقت بھی چند لوگ یکساں قسم کے حالات میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت نے اس وقت کے مروج قانون کو مختلف لوگوں کے مختلف حقوق اور فرائض متعین کرنے سے نہیں روکا۔ اس کے برعکس عہدِ حاضر میں حکومت کی تمام مساعی ایک ہی قسم کے قانون اور رسوم کو ایسے متعدد لوگوں پر مسلط کرتی ہے۔ جن میں باہمی مماثلت نہیں ہوتی۔

سماجی مساوات کی ترویج کے ساتھ ساتھ فرد کی قدر کم ہوتی جاتی ہے اور معاشرہ کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔ اور شہری انفرادی طور پہ ہجوم میں گم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ صورت حال جمہوری لوگوں کے ذہن میں معاشرے کی برتری اور اہمیت اور اس کے حقوق کا ایک عظیم تصور پیدا کرتی ہے۔ اور افراد کے حقوق کا تصور معمولی سارہ جاتا ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معاشرہ کے حقوق کو فوقیت حاصل ہے۔ اور افراد کے حقوق کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ یہ بھی تسلیم کرنے پہ آمادہ رہتے ہیں کہ معاشرے کی نمائندگی کرنے والی طاقت، معاشرہ کے دیگر افراد کے مقابلہ میں زیادہ باخبر اور باشعور ہے اور یہ کہ اس طاقت کا فرض اور حق ہے۔ کہ لوگوں پہ حکومت کرے اور ان کی رہنمائی کرے۔ عہد حاضر کے تمام جمہوری معاشروں کی تہ میں یہی سیاسی رجحانات کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

امریکیوں کا یہ نظریہ ہے کہ ہر مملکت میں طاقت کا سرچشمہ تو عوام ہیں لیکن جب یہ طاقت ایک مرتبہ قائم ہو جائے تو وہ اس طاقت کی حدود کا کوئی تعین نہیں کرتے اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس طاقت کو جو چاہے استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ شہروں یا خاندانوں یا افراد کو مخصوص مراعات اور حقوق دینے کا تصور ان کے ذہن میں ہی نہیں آسکتا۔ ان کا ذہن یہ بات قبول نہیں کر سکتا کہ ایک قسم کے قانون کا مملکت کے کسی حصہ پر اطلاق نہ کیا جانا بھی ممکن ہے۔

یہی نظریات یورپ میں بھی پھیل رہے ہیں۔ یورپ کے بعض لوگ تو اس حد تک غلو کر جاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ پر الزام عائد کرتے ہیں۔ وہ ایسی اقوام سے متعلق ہیں جو عوام کے اقتدار اعلیٰ کے نظریہ کو سختی سے مسترد کرتے ہیں۔ ایسی اقوام برتر طاقت کا سرچشمہ کسی اور شئے کو تصور کرتی ہیں۔ لیکن وہ اس طاقت کے ساتھ وہی خصوصیات منسوب کرتی ہیں۔ ان تمام ملکوں میں درمیانی طاقت کا تصور کمزور ہو گیا یا مٹا دیا گیا ہے اور ساتھ ہی بعض افراد کے حقوق کا تصور بھی ذہن انسانی سے محو ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس کی جگہ معاشرہ کی برتری اور اقتدار کا نظریہ حاصل کر رہا ہے۔ یہ تصورات اس رفتار سے ترقی کرتے ہیں۔ جس رفتار سے کہ مساوات ترقی کرتی ہے۔

فرانس میں جہاں جمہوری انقلاب اور مساوات دوسرے یورپی ملکوں سے زیادہ ترقی یافتہ حالت میں ہیں، ایسے نظریات لوگوں کے دلوں میں اپنا گھر بنا چکے ہیں۔ اگر ہم فرانس کی متعدد سیاسی جماعتوں کے افکار اور بیانات سنیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ فرانس کی ہر جماعت نے ان نظریات کو قبول کر لیا ہے۔ اکثر جماعتیں حکومت کی تنقید اور مذمت کرتی نظر آئیں گی۔ لیکن ساتھ ہی وہ تسلیم بھی کرتی ہیں کہ حکومت کو ملک کے ہر معاملہ میں دخل دینا چاہیئے۔ مختلف الخیال سیاسی جماعتیں جس بات پر متحد ہیں وہ یہی نظریہ ہے۔

۵۴۔ جمہوری قوموں کے جذبات سیاسی اقتدار میں مرکزیت کے ہم آہنگ ہوتے ہیں

اگر یہ حقیقت ہے کہ مساوات کے دور میں لوگ مرکزی اقتدار کے تصور کو آسانی سے قبول کرتے ہیں تو اس بات کی صداقت میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے کہ جمہوری قوموں کے عادات اور جذبات ان کو اس قسم کی مرکزی طاقت کو تسلیم کرنے کے لیے اور اس کی حمایت کرنے کے لیے پہلے ہی سے آمادہ رکھتے ہیں۔ میں اس نقطہ نظر کی وضاحت مختصر طور پر کروں گا۔

جمہوری ملکوں کے باشندوں میں نہ تو کوئی برتر اور نہ پست تر اور نہ ہی اس کے کاروبار میں لازمی طور پر کوئی شریک ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہی پر انحصار کرتے اور اپنے آپ کو بالکل الگ تھلگ تصوّر کرتے ہیں۔ اس بات کی وضاحت میں نے انفرادیت کی بحث میں کی ہے۔ چنانچہ اس قسم کے لوگ بڑی مشکل ہی سے اپنی نجی زندگی کو چھوڑ کر سیاسی الجھنوں میں حصّہ لیتے ہیں۔ اور وہ فطری طور پر ان امور کو معاشرہ کے مفادات کے مستقل نمایندے یعنی مملکت کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ان کو فطری طور پر سیاسی امور میں حصہ لینے کا شوق نہیں ہوتا۔ بلکہ عام طور پر ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ جمہوری معاشروں میں نجی زندگی بڑی ہی مصروف ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ عادتیں ناقابلِ تسخیر نہیں ہیں۔ اور میری اس تصنیف کا مقصد یہی ہے کہ جمہوری معاشروں کے باشندوں کے ان رجحانات کا قلع قمع کرنے کی کوشش کروں۔ میرا مدعا تو یہ ہے کہ آج کل لوگوں کے دنوں میں ان رجحانات کو کوئی خفیہ طاقت

پرورش کر رہی ہے - اور اگر ان کی روک تھام نہ کی گئی - تو یہ رجحانات ناقابل بیان اور خطرناک حد تک نشو و نما پا جائیں گے -

میں نے اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ دولت اور آسودہ حالی سے روز افزوں محبت اور جائیداد کی بیلانی کیفیت کس طرح جمہوری قوموں کو خونریز ہنگاموں اور انقلابات سے خوفزدہ رکھتی ہے - جمہوری معاشروں میں صرف امن اور سلامتی سے محبت کے جذبات باقی رہ جاتے ہیں - اور وقت گزرنے کے ساتھ یہ جذبہ بے حد طاقتور ہو جاتا ہے - اور یہ رجحان لوگوں کو فطری طور پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے زائد حقوق کو مرکزی اقتدار کے حوالے کر دیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف مرکزی طاقت ہی کو ان حقوق کی حفاظت سے دلچسپی ہے اور ان حقوق کی حفاظت کے لیے وہ وہی ذرائع استعمال کرتی ہے جو وہ اپنی حفاظت کے لیے کرتی ہے -

چونکہ مساوات کے تحت کوئی شخص اپنے ہم وطن کو مدد دینے کا پابند نہیں ہے اور نہ وہ کسی ہم وطن کی مدد کی توقع کر سکتا ہے - اس لیے یہ شخص بہ یک وقت آزاد بھی ہے اور کمزور بھی - یہ دو حالتیں، جمہوری ملک کے باشندوں میں دو متضاد خصوصیات پیدا کرتی ہیں - آزادی اس میں خود اعتمادی اور احساس فخر پیدا کرتی ہے اور اس کی کمزوری بیرونی مدد کی طالب ہوتی ہے - جو وہ اپنے ہمسروں سے حاصل نہیں کر سکتا - کیونکہ وہ خود بھی کمزور اور غیر ہمدرد ہیں - اس الجھن میں وہ قدرتی طور پر برتر طاقت کی طرف رجوع کرتا ہے - اس کی خواہشات اور اس کی احتیاجات ہمیشہ اس کی نظر کو اس برتر طاقت پر جمائے رکھتی ہیں اور بالآخر وہ اسی طاقت کو اپنی کمزوری کا واحد اور لازمی سہارا تصور کرنے لگتا ہے

لوگوں کو مخصوص مراعات اور حقوق سے جو ازلی نفرت ہوتی ہے - ان میں

اسی تناسب سے اضافہ ہوتا ہے جس تناسب سے یہ مراعات اور حقوق کم ہوتے ہیں۔ اور جمہوری جذبات کے شعلے، ایسا معلوم ہوتا ہے، اس وقت زیادہ بھڑکتے ہیں جب کہ ایندھن کم ہو اور اس کی وجہ میں نے اس سے پہلے بیان کی ہے۔ بات یہ ہے کہ جب حالات میں عدم مساوات ہو تو لوگوں کی نظر میں بڑی سے بڑی عدم مساوات نہیں کھٹکتی۔ لیکن جہاں حالت یکساں ہو تو ذرا سی بھی غیر یکسانیت فوراً لوگوں کی نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس لیے یہ فطری ہے کہ مساوات سے محبت میں اضافہ خود مساوات ہی کے ساتھ ترقی کرتا ہے

مخصوص مراعات اور چھوٹے چھوٹے حقوق کے خلاف لوگوں کی نہ ختم ہونے والی نفرت، بطور خاص ساری سیاسی طاقت کے بتدریج مملکت کے نمایندے کے ہاتھ میں مرتکز ہونے کے لیے بڑی سازگار ہوتی ہے۔ ملک کا حکمران، جو لازمی طور پر شہریوں سے بلند و بالا ہوتا ہے۔ لوگوں کے جذبات رشک و حسد کو نہیں ابھارتا اور ہر شخص یہ تصور کرتا ہے کہ وہ اپنے ہمسروں کے اختیارات چھین کر مملکت کے سربراہ کے حوالے کر رہا ہے۔ جمہوری ملک کا شہری، اپنے ہمسایہ کی اطاعت کبھی نہیں کرے گا۔ کیونکہ وہ اس کا ہمسر ہے۔ وہ اس کی برتر صلاحیتوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اس کی قوتِ فیصلہ پر شبہ کرتا ہے اور اس کی طاقت سے حسد کرتا ہے۔ وہ اس سے خوف کھاتا ہے اور اسے حقیر جانتا ہے اور وہ اپنے ہمسایہ کو یہ یاد دلانے سے مسرت محسوس کرتا ہے کہ وہ اور اس کا ہمسایہ دونوں مشترکہ طور پہ ایک آقا کے تابع اور محتاج ہیں۔

ہر مرکزی طاقت، جو اپنے فطری رجحانات کے تابع ہو، مساوات کے اصول کی پرورش اور ہمت افزائی کرتی ہے۔ کیونکہ مساوات ہی واحد ذریعہ ہے۔ جس کے طفیل مرکزی اقتدار کو محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔ اور اس کے دائرہ کار کو وسیع کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر مرکزی حکومت یکسانیت کی پرستار ہوتی ہے کیونکہ یکسانیت اسے مختلف الجھنوں سے نجات دلاتی ہے۔ جو اسے یکسانیت کی عدم موجودگی کی وجہ سے پیش آسکتی تھیں۔ حکومت کے لیے یہ آسان ہے کہ سب لوگوں سے ایک ہی قانون کی اطاعت کرائے بہ نسبت اس کے کہ مختلف لوگوں کے لیے مختلف قوانین رائج کرے۔ اس طرح حکومت اس بات کو پسند کرتی ہے جسے شہری پسند کرتے ہیں اور ان باتوں سے نفرت کرتی ہے۔ جس سے شہری متنفر ہوتے ہیں۔ یہ مشترکہ جذبات، جو جمہوری اقوام میں، حکمران اور رعایا میں ایک مستقل رشتۂ اتحاد کا کام دیتے ہیں۔ دونوں میں پائیدار اور مضبوط جذبۂ موانست پیدا کرتے ہیں۔ لوگ حکومت کی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں اور انتہائی صورتوں ہی میں عوام اپنی حمایت سے دست بردار ہوتے ہیں۔ مگر جمہوری اقوام عام طور پر ان لوگوں سے نفرت کرتی ہیں۔ جن کے ہاتھ میں یہ مرکزی طاقت ہوتی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ بذاتِ خود طاقت سے محبت کرتے ہیں۔

غرض یہ کہ دو مختلف راہوں سے میں ایک نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ مساوات کا اصول لوگوں میں واحد، یکساں اور طاقتور حکومت کا تصور پیدا کرتا ہے۔ اور اب میں نے بتایا کہ اصولِ مساوات جمہوری لوگوں میں اس قسم کا ذوق اور عادت پیدا کرتا ہے۔ ہماری اس دور کی اقوام اس قسم کی حکومت کی طرف جا رہی ہیں۔

۵۵۔ مرکزیت کی طرف لے جانیوالے مخصوص اسباب اور رکاوٹیں

تمام جمہوری اقوام فطری طور پر مرکزیت ہی کی طرف جاتی ہیں۔ مگر ہر قوم یکساں طریقے سے اس منزل کی طرف نہیں جاتی۔ اس کا انحصار ان مخصوص حالات پر ہوتا ہے جو معاشرہ کو اس کے فطری نتائج سے دوچار ہونے سے روکتے ہیں یا اس میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ یہ حالات متعدد نوعیت کے ہو سکتے ہیں۔ جن میں سے میں صرف چند کا ذکر کروں گا۔

ایسی اقوام میں، جو مساوات کے قیام سے پہلے بھی ایک طویل عرصہ تک آزاد رہ چکی ہوں۔ ان کے آزاد اداروں سے اخذکردہ رجحانات۔ سماجی مساوات کے پیدا کردہ میلانات کا مقابلہ کرتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسی اقوام میں مرکزی طاقت اپنے اختیارات میں اضافہ کرے۔ لیکن معاشرہ کے افراد اپنی آزادی سے کبھی دست بردار نہیں ہوتے۔ مگر جب ایسے ملکوں میں مساوات آتی ہے۔ جہاں کے لوگوں نے کبھی آزادی کا لطف نہ اٹھایا ہو۔ یا آزادی سے ایک عرصۂ دراز پہلے محروم ہو چکے ہوں اور جوں جوں پرانی عادتوں اور معاشرہ کی نئی حالت کی پیدا کردہ نئی عادتوں میں امتزاج ہوتا ہے تو تمام طاقتیں مرکز کی طرف دوڑتی نظر آتی ہیں اور یہ طاقتیں انتہائی سرعت کے ساتھ ایک جگہ جمع ہونا شروع ہوتی ہیں اور مملکت بالآخر انتہائی طاقت حاصل کر لیتی ہے اور اس کے برعکس فرد یکایک اپنی کمزوری کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے۔

تین سو سال پہلے جن انگریز زائرین نے نئی دنیا کے ساحلوں پر ایک جمہوری دولت

مشترکہ کا سنگِ بنیاد رکھا تھا، اپنے وطن میں آدابِ حکومت سے واقف تھے انھیں جمہوریت کے ذریعہ مقدمات کے اصولوں سے آگاہی تھی۔ وہ آزادیٔ صحافت اور آزادیٔ تقریر، شخصی آزادی اور تصورِ حقوق سے آشنا تھے۔ وہ اپنے ساتھ آزاد اداروں اور مردانہ صفات کو امریکہ لے گئے تھے۔ ان اداروں نے ان کو مملکت کی مداخلتِ بے جا سے محفوظ رکھا۔ اس طرح امریکہ میں پہلے آزادی آئی ـــــ اور مساوات اس کے بعد آئی۔ یورپ میں اس کے برعکس صورتِ حال پیدا ہورہی ہے۔ جہاں مستبد حکمرانوں اور مطلق العنان، بادشاہوں نے مساوات قائم کر رکھی تھی۔ اور آزادی کا تصور ان کے ذہنوں میں پیدا ہونے سے بہت پہلے مساوات کی پیدا کردہ عادتیں جڑ پکڑ چکی تھیں۔

جیسا کہ میں نے بارہا واضح کیا ہے جمہوری ملکوں میں حکومت کا تصور ایک مضبوط مرکزی طاقت سے عبارت ہے اور درمیانی طاقتوں کے تصور سے وہ نا آشنا ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کا بطورِ خاص اطلاق ایسے جمہوری ملکوں پر ہوتا ہے جنھوں نے خونیں انقلابات کے بعد مساوات کی حکمرانی قائم کی ہو۔ انقلابات میں وہ طبقات مٹا دیے جاتے ہیں جو مقامی حکومت چلانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ منتشر ذہن عوام میں نہ اس کی قابلیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی آپ تنظیم کر سکیں اور نہ کاروبارِ مملکت چلانے کی عادت ہوتی ہے۔ چنانچہ حکومت ہی نظم و نسق کی تمام جزئیات کی ذمہ داری فطری طور پر قبول کرتی ہے اور مرکزیت لازمی ہو جاتی ہے۔

فرانس میں طبقہ امراء اور متوسط طبقہ کے اعلیٰ ارکان کے یکا یک خاتمہ کے بعد نپولین کے ہاتھ میں ملک کی ساری طاقت کا مرتکز ہونا عین فطری تھا۔ جس کے لیے وہ نہ قابلِ مذمت ہے اور نہ قابلِ ستائش۔ سچ تو یہ ہے کہ نپولین کے لیے یہ تقریباً

ناممکن تھا کہ وہ ان اختیارات کو مسترد کرے ۔ مگر امریکہ میں ایسی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ۔ امریکی کسی انقلاب سے نہیں گزرے تھے ۔ اور ابتدا ہی سے اپنے آپ پر حکمرانی کرنے کے عادی تھے ۔ چنانچہ انھیں مملکت کو ایک خاص عرصہ کے لیے اپنا سرپرست بنانے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ غرض یہ کہ جمہوری ملکوں میں مرکزیت کی ترقی کا انحصار نہ صرف مساوات کی ترقی پر ہوتا ہے بلکہ اس طریقۂ کار پر بھی ہوتا ہے ۔ جس کے ذریعہ یہ مساوات قائم کی گئی ہو ۔

عظیم جمہوری انقلابات کے آغاز کے وقت' جب کہ معاشرہ کے مختلف طبقات آپس میں برسرجنگ رہتے ہیں' لوگ یہی کوشش کرتے ہیں کہ ساری انتظامی طاقت حکومت کے ہاتھ میں مرتکز ہو ۔ تاکہ اشرافی طبقات کے ہاتھوں سے مقامی امور کا انتظام چھین لیا جائے ۔ اس کے برعکس انقلاب کے اختتام کے وقت' مفتوح اشرافی طبقات مقامی امور کا اہتمام بذاتِ خود مملکت کے سپرد کر دیتے ہیں ۔ کیونکہ وہ لوگوں کے غضب سے ڈرتے ہیں ۔ جواب ان کے ہم مرتبہ ہو چکے ہیں ۔ چنانچہ معاشرہ کا صرف ایک ہی طبقہ حکومت کے اختیارات میں اضافہ کے لیے کوشاں نہیں ہوتا ۔ بلکہ جب تک کہ انقلاب جاری رہتا ہے ۔ اس دوران میں کوئی نہ کوئی طبقہ' اپنے مخصوص مفادات کے پیش نظر' حکومت کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنانا چاہتا ہے ۔ ممکن ہے کہ بعض وقت یہ طبقہ ان افراد پر مشتمل ہو ۔ جو بہ اعتبارِ دولت اور نمول طاقتور ہیں یا ان افراد پر مشتمل ہو جن کی تعداد زیادہ ہے ۔

عہدِ حاضر کے انگلستان میں ملک کے ادنیٰ طبقات اپنی بساط بھر کوشش کر رہے ہیں کہ مقامی آزادی کو ختم کر کے تمام انتظاماتِ مملکت کو مرکز کے سپرد کر دیں ۔ اور اعلیٰ طبقات کی یہ کوشش ہے کہ مقامی انتظام' قدیم روایات کے تحت چلتا رہے ۔ لیکن میں یہ قیاس کر سکتا ہوں کہ ایک وقت آئے گا ۔

جب صورت حال اس سے مختلف ہوگی ۔ ادنیٰ طبقات مقامی آزادی کا مطالبہ کریں گے اور اعلیٰ طبقات مرکزیت کی کوشش کریں گے ۔

مندرجہ بالا خیالات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ ایسے جمہوری ملکوں میں جہاں عوام کو مساوات کی منزل تک پہنچنے کے لیے ایک طویل جدوجہد سے گزرنا پڑا ہو۔ کس لیے مرکز طاقتور اور افراد کمزور ہوتے ہیں بہ نسبت ان ملکوں کے جہاں معاشرہ میں ابتدا ہی سے مساوات قائم ہے ۔ امریکہ کی مثال اس حقیقت کا مزید ثبوت مہیا کرتی ہے ۔ امریکہ کے باشندوں کے درمیان کبھی بھی امتیازات اور حقوق و مراعات کی حدیں قائم نہ تھیں ۔ وہ آقا اور غلام کے تصور سے نا آشنا تھے ۔ ادر چونکہ وہ ایک دوسرے سے نہ خوفزدہ تھے اور نہ متنفر، اس لیے انھیں مرکزی طاقت کے اپنے معاملات نمٹانے کے لیے طلب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ امریکیوں کی اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے ۔ انھوں نے انگلستان کے اشرافی طبقات سے انفرادی حقوق کا تصور اور مقامی آزادی کی عادات لی تھیں اور وہ دونوں کو برقرار رکھ سکے ۔ اس لیے کہ انھیں امریکہ میں اشرافی طبقات کا مقابلہ کرنا نہ پڑا ۔

تعلیم لوگوں کو اپنی آزادی کی مدافعت کے قابل بناتی ہے ۔ جمہوری ملکوں میں تو یہ بات بطور خاص درست ثابت ہوئی ہے ۔ جب سب لوگ ایک طرح کے ہوں تو محض فطری امداد سے ایک طاقتور حکومت کا قائم کرنا آسان ہوتا ہے مگر درمیانی طاقتوں کی تنظیم کرنے اور انھیں برقرار رکھنے کے لیے ذہانت، علم اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اور اس طرح شہری کی انفرادی کمزوری اور آزادی کے درمیان، ایسے ادارے قائم کرنا مشکل ہوتا ہے جو عام نظم و نسق کو تباہ کیے بغیر استبداد کے خلاف جدوجہد کر سکیں ۔

غرض یہ کہ جمہوری ملکوں میں طاقت میں مرکزیت اور لوگوں کی اطاعت پذیری

میں نہ صرف اس تناسب سے اضافہ ہوتا ہے۔ جس تناسب سے مساوات ترقی کرتی ہے۔ بلکہ جہالت اور لاعلمی بھی ترقی کرتی ہے۔

لیکن اشرافی اقوام کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ کیونکہ ایسے ملکوں میں بادشاہ یا حکمران اور معاشرہ کے ممتاز ارکان تقریباً یکساں طور پر تعلیم یافتہ اور باشعور ہوتے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ حکومت میں مرکزیت بالآخر معاشرہ کو کمزور کر دیتی ہے اور ایک طویل عرصہ کے بعد خود حکومت کو کمزور بنا دیتی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ایک خاص مدت میں مرکزیت کی حامل حکومت بڑے بڑے کارنامے انجام دے سکتی ہے۔ جنگ کے زمانے میں مرکزیت کی افادیت بے حد بڑھ جاتی ہے۔ جب کہ ملک کے تمام وسائل کو ایک نقطہ پر جمع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے جنگ کے زمانے میں اقوام مرکزی حکومت کی طاقت میں اضافہ کرتے ہیں۔ عسکریت پسند اور عسکری ذہانت کے حامل لوگ ہمیشہ مرکزیت کے دلدادہ ہوں گے۔ کیونکہ اس سے ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور مرکزیت پسند لوگ جنگ کے پرستار ہوں گے۔ کیونکہ جنگ قوم کو مجبور کرتی ہے کہ وہ سارے اختیارات کو ایک مرکزی طاقت کے سپرد کر دے۔ اس طرح ایسے جمہوری ملکوں میں، جو اپنے محل وقوع کی بنا پر ہمیشہ جنگ کے خطرات میں گھرے رہتے ہیں۔ مرکزیت کا رجحان زیادہ رہے گا۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ جمہوری اقوام، اندرونی ہنگاموں اور فسادات اور زاج سے خوف زدہ رہتی ہیں۔ اور اسی بنا پر وہ مرکزی حکومت کی طاقت کو زیادہ سے زیادہ دیکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ امن و سکون کی زندگی بسر کر سکیں۔ ایسے تمام

رجحانات، جو کسی جمہوری ملک میں ہیجان اور انتشار میں اضافہ کا باعث بن سکتے ہیں۔ بالآخر افراد کو فطری طور پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنے انفرادی اختیارات اور آزادی کو مرکز کے سپرد کر دیں۔۔اس طرح وہ امن عامہ سے محبت کی خاطر اپنی آزادیوں کی قربانی قبول کرتے ہیں۔

جمہوری ملکوں میں مرکزیت کے رجحان کے متعدد عوامل کا ہیں نے تجزیہ کیا ہے لیکن مرکزیت کا اہم ترین سبب ابھی زیر بحث نہیں آیا۔جمہوری ملکوں میں ساری طاقت کے ایک حکمران کے ہاتھ میں منتقل ہونے کے رجحان کی ایک مستقل اور بڑی وجہ خود حکمران کی ذات اور اس کے میلانات بھی ہوتے ہیں۔ جمہوری مساوات کے دور میں رہنے والے لوگ فطری طور پر مرکزی طاقت کے پرستار ہوتے اور اس کی طاقت میں ہمہ وقت اضافہ کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ لیکن جب یہی طاقت خود لوگوں کے مفادات کی پرخلوص طور پر نمائندگی کرے اور خود ان کے رجحانات کی پیروی اور نقل کرے۔ تو لوگ اس طاقت میں جو اعتماد قائم کریں گے اس کی کوئی حد و انتہا نہ ہو گی اور وہ تصور کرنے لگیں گے کہ اس مرکزی طاقت کو وہ جو بھی زائد اختیار دے رہے ہیں۔ دراصل وہ اپنے آپ کو نواز رہے ہیں۔

بادشاہوں کی حکومت میں لوگوں میں مرکزیت کا رجحان کم سے کم ہوگا۔کیونکہ وہ کسی نہ کسی طرح پرانے اشرافی تعلقات سے متعلق ہوتا ہے۔لیکن اس کے برعکس جمہوری ملکوں کے بڑے حکمران، خود لوگوں میں سے ہوتے ہیں۔جن کی پیدائش، جن کے میلانات، تعصبات اور عادات، مساوات کے مقصد سے ناقابل شکست رشتے سے بندھے رہتے ہیں۔غرض کہ جمہوری ملکوں میں اصول کے طور پر حکمران کا جس قدر کم تعلق اشرافی طبقات سے ہوگا اسی تناسب سے مرکزیت میں اضافہ ہوگا۔

۵۶۔ جمہوری قوموں کو کس قسم کے استبداد کا خدشہ ہو سکتا ہے؟

امریکہ کے قیام کے دوران میں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ امریکہ کے مشابہ معاشرہ میں جمہوری حالت، استبداد کے قیام کے لیے بڑی سازگار ہوتی ہے۔ اور یورپ واپس ہونے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہمارے حکمرانوں نے جمہوری سماجی حالات کے پیدا کردہ تصورات، جذبات اور ضروریات سے اپنے دائرۂ اثر اور اختیار کی توسیع کے لیے کس حد تک فائدہ اٹھایا ہے اور اس بات نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ عیسائی دنیا بھی شاید استبداد کے ایک ایسے بھیانک دور سے گزرے جس سے پرانی دنیا کی مختلف اقوام گزر چکی ہیں۔

اس موضوع پر مزید غور و فکر اور ۵ سال کے مزید مطالعہ کے بعد میرے ان خدشات میں کمی نہیں ہوئی۔ لیکن اس غور و فکر نے ان کا مقصد و مدعا بدل دیا ہے۔

پرانے زمانے میں کوئی حکمران اس قدر مطلق العنان اور طاقتور نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی درمیانی طاقت کی مدد کے بغیر ایک وسیع و عریض مملکت پر حکومت کر سکے۔ کوئی حکمران شخصی طور پر ملک کے ہر فرد بشر پر حکمرانی و ہدایت کا خیال تک ذہن میں نہیں لایا تھا اور اگر کسی نے ایسا سوچا بھی تھا تو اس کی لاعلمی، انتظامی نظام کی کمزوریاں اور سب سے بڑھ کر عدم مساوات کی پیدا کردہ رکاوٹیں اس کی راہ میں کھڑی ہو سکتی تھیں۔

شہنشاہیت روما، جب اپنے بام عروج پر تھی تو اس وقت بھی وسیع و عریض سلطنت کی مختلف اقوام نے اپنے مخصوص رسوم اور روایات کو برقرار رکھا تھا۔ اگرچہ وہ ایک ہی شہنشاہ کے تابع تھے۔ لیکن اکثر صوبوں پر الگ طور پر

حکومت کی جاتی تھی۔ ملک کے طول و عرض میں بلدیات اور اس قسم کی مقامی حکومتیں تھیں۔ غرض یہ کہ شہنشاہ کی برتری کے باوجود ملک کے متعدد انفرادی اور سماجی امور اس کے اختیار سے باہر تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہوں کو بے پناہ اور غیر محدود اختیارات حاصل تھے اور بسا اوقات وہ اپنے ان اختیارات کا ناجائز استعمال بھی کیا کرتے تھے۔ ان کا ظلم و ستم بعض لوگوں پر قیامت ڈھاتا۔ لیکن ہر شخص ان کے ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنتا۔ ان کی مطلق العنانی صرف چند امور تک محدود تھی اور انھوں نے باقی کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ ان کے استبداد میں غضب تھا۔ لیکن اس کا دائرہ محدود تھا۔

اگر عہدِ حاضر کے جمہوری اقوام میں استبداد قائم ہو جائے تو وہ ایک الگ شکل و کردار اختیار کرے گا۔ یہ وسیع تر ہوگا لیکن نرم۔ یہ لوگوں کو اذیت پہنچائے بغیر ذلیل کرے گا۔ اس میں شک نہیں کہ اس مساوات اور تفہیم کے دور میں حکمران آسانی سے سارے اختیارات کو اپنے ہاتھوں میں مرتکز کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے اور عہد قدیم کے حکمرانوں سے زیادہ قوت اور غضب کے ساتھ لوگوں کی نجی زندگیوں میں مداخلت کریں گے۔ لیکن مساوات کا وہی اصول' جو استبداد کی راہ ہموار کرتا ہے' اسے معتدل مزاج بھی بناتا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ مساوات کی ترویج کے ساتھ لوگوں کی طبیعت میں نرمی اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ اور جب معاشرہ کے کسی فرد کے پاس نہ دولت ہو اور نہ طاقت تو پھر استبداد کے لیے میدان صاف رہتا ہے جیسا کہ تمام لوگ زیادہ متمول نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کی خواہشات بھی محدود ہوتی ہیں۔ اور لوگوں کی یہ کیفیت خود حکمران میں بھی اعتدال پیدا کرتی ہے اور اسے اپنی خواہشوں کو غیر محدود بنانے سے روکتی ہے۔

جمہوری حکومتیں' عظیم خطرات کے موقع پر اور ہیجانی حالت میں انتہائی مستبد

اور بے رحم بن جاتی ہیں۔ لیکن ایسے بحران کم ہی آتے ہیں۔ میں جب اپنے ہمعصروں کے جذبات کا ان کی معتدل مزاجی، ان کی تعلیم، ان کے مذہب کی پاکیزگی، ان کی اخلاقی شرافت اور ان کے عادات کی باقاعدگی کو پیش نظر رکھتا ہوں تو میں بلا خوف خطر کہہ سکتا ہوں کہ ان کے حکمران مستبد اور ظالم نہیں ہوں گے۔ بلکہ سرپرست ہوں گے

اس بنا پر میں یہ تصوّر کرنے پر مجبور ہوں کہ جمہوری اقوام کو جس نوعیت کے استبداد سے خطرہ ہے وہ اس سے بالکل الگ ہے۔ جو اس سے پہلے دنیا میں موجود تھا۔ میں اپنے آپ میں قوتِ اظہار نہیں پاتا کہ میں اس نظریہ کو بیان کروں جو میرے ذہن میں موجود ہے۔ استبداد اور مطلق العنانی کے قدیم الفاظ غیر موزوں ہیں۔ یہ بذاتِ خود نئی چیز ہے۔ چونکہ میں اسے کوئی نام نہیں دے سکتا۔ اس لیے اس کی تشریح کی کوشش کروں گا۔

میں ان خاص حالات کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کروں گا۔ جن کے تحت دنیا میں استبداد دوبارہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ جمہوری معاشرہ کی اولیں متاثر کن بات یہ ہے کہ اس میں لاکھوں لوگ، جو ایک دوسرے کے ہم مرتبہ اور مساوی ہوتے ہیں دن رات اپنی خوشی اور مسرت کی چھوٹی چھوٹی باتوں اور چیزوں کے حصول میں منہمک رہتے ہیں۔ ہر شخص ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہے۔ اس کی آل اولاد اور اس کے قریبی دوستوں میں اس کی ساری دنیا ہے۔ اپنے دوسرے ہم وطنوں سے وہ قریب تو ہے۔ لیکن وہ انھیں دیکھتا نہیں۔ انھیں چھوتا تو ہے۔ لیکن محسوس نہیں کرتا ہے۔ اس کا وجود اپنے لیے اور صرف اپنے لیے ہے۔

انسانوں کی اس نسل پر ایک ایسی بے پناہ اور سرپرستانہ طاقت حکمران ہے جس نے ان کی تمام خواہشات اور ضروریات کی تکمیل اور ان کی قسمت کی نگہبانی اپنے ذمے رکھی ہے۔ یہ طاقت مطلق العنان ہے۔ ہمہ گیر ہے۔ باقاعدہ ہے

مہربان اور نرم مزاج ہے۔ اس کی حیثیت ماں باپ کی سی ہے۔ لیکن ماں باپ بچے کو انسان بننے کے لیے تیار کرتے ہیں۔ مگر اس طاقت کا مقصد بچے کو دائمی طور پر عالم طفولیت میں رکھنا ہوتا ہے۔ وہ اس بات پر خوش رہتی ہے کہ اس کے بچے خوش رہیں اور زندگی کا لطف اٹھائیں۔ بشرطیکہ وہ خوش رہنے سے زیادہ اور کوئی بات اپنے ذہن میں نہ لائیں۔ ایسی حکومت اپنے باشندوں کی خوشی اور مسرت کے لیے دل و جان سے کوشش کرتی ہے۔ مگر یہ فیصلہ خود کرتی ہے کہ ان کی خوشیاں کیا ہونی چاہئیں۔ غرض یہ کہ یہ طاقت ان کی سلامتی اور مسرتوں کے لیے ہر وہ کام انجام دیتی ہے جو احاطہ خیال میں آسکتا ہے۔

مگر اس طرح وہ بےزور لوگوں کی قوتِ ارادی اور آزادیٔ عمل کو کمزور اور بے فائدہ بنا دیتی ہے۔ لوگوں کی خواہش اور ارادہ کو معینہ حدود میں مقید کر دیتی ہے۔ لوگوں کو مساوات کا اصول ان تمام باتوں کے لیے تیار کرتا ہے اور انھیں برداشت کرنے کا پہلے ہی سے عادی بنا دیتا ہے۔

معاشرہ کے ہر رکن کو اپنی طاقتور گرفت میں لینے اور انھیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کے بعد یہ برتر طاقت اپنا دائرۂ اثر سارے معاشرہ پر محیط کر دیتی ہے۔ پیچیدہ، ہمہ گیر اور یکساں قوانین کا ایک جال معاشرہ کے گرد تان دیتی ہے اور کسی ذہین اور ہوشیار شخص کے لیے بھی ممکن نہیں رہتا کہ وہ اس جال سے باہر نکل کر اپنے آپ کو دوسروں سے ممتاز کر سکے۔ انسان کی قوت ارادی تباہ نہیں ہوتی۔ وہ نرم کر دی جاتی ہے۔ لوگوں کو یہ قوت عمل کرنے پر شاید ہی مجبور کرتی ہے۔ لیکن وہ انھیں مسلسل عمل کرنے سے روکتی ہے۔ ایسی طاقت تباہ نہیں کرتی۔ لیکن زندگی کو روکتی ہے یہ ظلم و ستم نہیں کرتی بلکہ آہستہ آہستہ دباتی ہے، کمزور کرتی ہے، شعلوں کو بجھاتی ہے اور لوگوں کو بیوقوف بناتی ہے۔ تا آنکہ ہر قوم احمق اور محنتی جانوروں کے ایک گلّے کے مانند ہو جائے۔ جس کا چرواہا حکومت ہو۔

عہد حاضر کے لوگوں میں یہ دو متضاد جذبات کام کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی کوئی رہنمائی کرے۔ اور وہ آزاد بھی رہنا چاہتے ہیں اور دونوں میں سے کسی ایک رجحان کو ترک اور تباہ کرنا چاہتے۔ اور بہ یک وقت دونوں کی تسکین چاہتے ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے واحد، سرپرستانہ اور طاقتور حکومت کو جنم دیا۔ لیکن اس کا انتخاب عوام کے ہاتھوں میں رکھا۔ انھوں نے مرکزیت کے اصول اور عوامی اقتدارِ اعلیٰ کے اصولوں کا امتزاج کیا۔ اس طریقہ کار سے انھیں مہلت مل گئی۔

اس نظام کے ذریعہ وہ اپنی غلامی کے جوئے کو اتنی مدت کے لیے اتار پھینکتے ہیں کہ وہ اپنے آقا کا انتخاب کرلیں اور اس کے بعد پھر غلامی کی حالت میں چلے جاتے ہیں۔ عہد حاضر کے بے شمار لوگ انتظامی استبداد اور عوامی اقتدار اعلیٰ کے مابین اس مصالحت پر پر قانع ہیں اور ان کا خیال ہے کہ انھوں نے انفرادی آزادی کی حفاظت کے لیے مضبوط حصار قائم کرلیا ہے۔ یہ بات مجھے مطمئن نہیں کرتی۔ میرے لیے یہ بات کم اہمیت کی حامل ہے کہ میں کسی شخص کی اطاعت کروں۔ جو بات میرے لیے اہم ہے وہ یہ ہے کہ مجھ سے زبردستی یہ اطاعت کیوں حاصل کی جارہی ہے۔

مگر میں اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کرتا کہ اس قسم کا آئین اس آئین پر قابل ترجیح ہے جس کے تحت تمام اختیارات کو حکومت میں مرتکز کرکے انھیں انتہائی غیر ذمہ دار شخص یا گروہ کے ہاتھوں میں دے دیا جاتا ہے۔ جمہوری استبداد جو مختلف اشکال اختیار کرسکتا ہے۔ ان میں یہ آخرالذکر شکل انتہائی بدترین ہے۔

جب حکمران منتخبہ ہو اور آزاد اور منتخبہ مجلس قانون ساز اس پر گہری نظر رکھتی ہو تو ایسے حکمران کا استبداد، جو ممکن ہے بعض وقت بہت زیادہ ہو، لوگوں کے لیے باعثِ توہین نہیں رہتا۔ کیونکہ ہر شخص یہ تصور کرتا ہے کہ اگر وہ اطاعت پر مجبور ہے تو وہ دراصل اپنی آپ اطاعت کررہا ہے۔

۵۷۔ حاصلِ کلام

میں اس موضوع پر اپنی بحث ختم کرنے سے پہلے طوعاً وکرہاً موجودہ معاشرہ کی مختلف خصوصیات کا دوامی جائزہ لینا چاہتا ہوں اور انسانیت کے مستقبل پر مساوات کے تصوّر نے جو عام اثر ڈالا ہے اس کا تجزیہ ضروری سمجھتا ہوں۔

عہدِ حاضر کا معاشرہ، جس کا میں نے نقشہ کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ابھی ابھی معرضِ وجود میں آیا ہے۔ وقت نے اسے ابھی اپنی مکمل شکل اختیار کرنے کا موقع نہیں دیا ہے، جس عظیم انقلاب نے اس معاشرہ کو پیدا کیا تھا، وہ ابھی جاری ہے ختم نہیں ہوا۔ اور اس موقع پر یہ فیصلہ دینا ناممکن ہے کہ انقلاب کن کن چیزوں کو اپنے ساتھ بہا لے جائے گا اور کونسی چیزیں باقی رہ جائیں گی۔ اور جو نئی دنیا عالمِ ظہور میں آ رہی ہے، ابھی اس کی راہ میں زوال پذیر دنیا کے کھنڈرات رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ اور اس ہیجان اور افراتفری کے عالم میں کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ کہ کس قدر قدیم ادارے اور آداب زندہ رہیں گے۔ اور کتنے غائب ہو جائیں گے۔

سماجی حالات، خوانین، افکار اور انسانی احساسات کا جو انقلاب رونما ہو رہا ہے، اگرچہ وہ ابھی اپنے اختتام کی منزل سے بہت دور ہے۔ لیکن اس کے جو کچھ بھی نتائج ظاہر ہو رہے ہیں وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ آنے والا دور اور اس کے حالات اس سے بالکل مختلف ہوں گے۔ جن کا مشاہدہ قدیم دنیا نے کیا ہے۔ تاریخ کے صفحات اُلٹ

دیجئے۔ اور عہدِ عتیق تک پہنچ جائیے۔ لیکن آج جو کچھ ہو رہا ہے اس کی مثال دنیا کے کسی دور میں اور کسی ملک میں نہ ملے گی۔ چونکہ ماضی نے انسان کے مستقبل پر روشنی ڈالنے سے عاجزی کا اظہار کر دیا ہے۔ اس لئے انسان ذہنی اندھیرے میں گم گشتہ راہ ہے۔

مگر اس کے باوجود بعض نمایاں خصوصیات اب بھی پہچانی جا سکتی ہیں۔ دنیا کی اچھی چیزیں اور زندگی انسانی دنیا میں مساوی طور پر منقسم ہیں۔ تموّل اور دولتمندی عنقا ہیں۔ چھوٹی چھوٹی جائیدادوں کے مالک زیادہ ہوں گے۔ خواہشات اور ان کی تسکین کے ذرائع میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن غیر معمولی خوشحالی اور ناقابل علاج مفلسی سے دنیا نا آشنا ہو گی۔ حوصلہ مندی کے جذبات ہمہ گیر ہوں گے لیکن حوصلہ مندی اور جرأت آزمائی کا دائرہ تنگ ہے۔ ہر فرد کمزور ہے اور الگ تھلگ ہے۔ لیکن معاشرہ بحیثیت مجموعی فعّال، عاقبت اندیش اور طاقت ور ہے۔ فرد کے کارنامے معمولی اور ہیچ اور مملکت کے عظیم ہیں۔

کردار میں ہیجان نہیں ہے لیکن آداب مہذب اور قانون انسانیت پر مبنی ہیں۔ خال خال بہادری اور نیکی کی اعلیٰ ترین اور روشن مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن عام طور پر لوگوں کی عادات باقاعدہ ہیں۔ تشدد کا فقدان ہے اور بے رحمی سے لوگ تقریباً نا آشنا ہیں۔ حیاتِ انسانی طویل ہے۔ اور لوگوں کی جائیداد زیادہ محفوظ ہے۔ زندگی میں امن اور سکون اور سہل ہے۔ نہ تو معاشرہ میں عالم و فاضل لوگ موجود ہیں اور نہ جاہل اور اَن پڑھ۔ ذہین لوگ کم ملیں گے۔ لیکن لوگ باخبر زیادہ ہیں۔ فنی تخلیقات میں برتری کی کمی ہے۔ لیکن ان کی کثرت ہے۔ نسل، مرتبہ اور ملک کے اختلافات کم ہیں

اور انسانیت کے رشتہ کی بندھنیں مضبوط ہیں۔

اگر ان تمام مختلف خصوصیات میں سب سے نمایاں اور اہم خصوصیت کو معلوم کرنے کی کوشش کروں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے مقدر میں جو انقلاب آرہا ہے۔ اس کا اظہار مختلف شکلوں میں ہو رہا ہے۔ تمام انتہائیں ختم ہو رہی ہیں۔ ہر چیز سکڑ کر درمیان میں آرہی ہے۔ نہ تو کوئی زیادہ بلند اور نہ زیادہ لپست، نہ زیادہ چمکدار اور نہ زیادہ تاریک۔

جب میں لوگوں کے اس انبوہ غفیر پر نظر ڈالتا ہوں جن میں سے ہر ایک دوسرے جیسا ہے جن میں نہ کوئی بلند ہے اور نہ لپست ہے۔ تو اس آفاقی یکسانیت کا منظر مجھے پژمردہ کر دیتا ہے۔ اور مجھے گذرے ہوئے معاشرہ کو یاد کر کے افسوس ہوتا ہے۔ جب دنیا میں بڑے اور چھوٹے لوگ، اہم اور معمولی، متمول اور غریب۔ عالم اور ان پڑھ موجود تھے۔ تو میری نگاہ صرف ان ہی پر پڑتی جن سے میرے ہمدردی کے جذبہ کی تسکین ہوتی۔ لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ میری یہ تسکین میری اپنی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کہ میں اس قابل ہوں کہ میں ایک دم میں اپنے سارے گرد و پیش پر نظر ڈال سکوں۔ اور اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ میں صرف اپنی پسند کی اشیاء پر نظر رکھوں۔ لیکن یہ حال خدا تعالےٰ کی ذات کا نہیں ہے۔ خدا تعالےٰ کی نگاہ ساری انسانیت اور ساری مخلوق پر ہوتی۔

اور اس حقیقت کو پہچاننے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ خدا تعالےٰ کے لئے چند لوگوں کی خوشحالی کے منظر سے زیادہ عام بہبود کا منظر خوش کن ہے اور مجھے جو بات انسان کے لئے باعث زوال نظر آتی ہے اُس کی نظر میں وہ ترقی ہے جسے میں تکلیف دِہ سمجھتا ہوں، وہ اُس کے لئے قابلِ قبول ہے۔ یہ مساوات کی حالت شاید زیادہ بلند نہ ہو۔ لیکن وہ زیادہ انصاف پر مبنی ہے۔

اور اس کا انصاف پر مبنی ہونا اس کی عظمت اور حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ اور میں بلند ہو کر اس "ربانی نقطہ نظر" سے اور انسان کے مسائل سے جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔

صفحہ ہستی پر کوئی ذی حیات تیقّن کے ساتھ نہیں کہ سکتا۔ کہ دنیا کی یہ نئی حالت پرانی حالت سے بہتر ہے۔ لیکن اس وقت بھی یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ یہ حالت مختلف ہے۔ اشرافی اقوام کے آئین کی بعض مراعات اور اچھائیاں اس قدر عیاں تھیں اور موجودہ دور کے لوگوں کے کردار سے اس قدر متناقض ہیں کہ وہ بہر حال ان میں نفوذ نہیں کر سکتیں۔ موجودہ دور بعض اچھے رجحانات سے اور بُرے میلانات سے پرانا دور نا آشنا تھا۔ غرض یہ کہ یہ دونوں نوع انسانوں کیلئے ایک علیحدہ علیحدہ نظاموں کی طرح ہیں۔ جس میں ہر ایک کے اپنے محاسن اور معائب ہیں۔ اسلئے اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ نئے معاشرہ کے تصورات اور نظریات کو پرانے معاشرے کے تصورات اور نظریات کی اساس پر نہیں جانچنا چاہیئے کیونکہ اس کے معاشرہ کا وجود ہی باقی نہیں رہا ہے۔ دونوں معاشرے بالکلیہ مختلف نوعیت کے تھے اس لئے ان میں کسی قسم کا مقابلہ اور موازنہ نا انصافی پر مبنی ہے اگرچہ کہ ابھی تک اس بات کو اچھی طرح سمجھا نہیں جا سکا ہے۔ اس لئے میرے متعدد ہمعصر اشرافی اقوام کے اداروں، افکار اور تصورات میں سے چند کا انتخاب کر کے۔ اس کا نئی دنیا کے حالات پر انطباق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ اپنا وقت اور توانائی ایک لاحاصل بات پر ضائع کر رہے ہیں۔ مقصد تو یہ نہیں ہے کہ ان مخصوص فوائد کو برقرار رکھا جائے جو عدم مساوات نے دنیا کو دیئے ہیں۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان فائدوں کو محفوظ کیا جائے جو مساوات نے ہمیں مہیا کئے ہیں۔ ہمیں اپنے آپ

کو اپنے اسلاف کے مانند نہیں بنانا بلکہ ہمیں اس عظمت اور خوشی کی تلاش کرنا ہے جو ہماری اپنی ہے۔

مجھے احساس ہے کہ میرے اکثر ہمعصر اس عقیدہ کے حامی ہیں کہ اس دنیا میں کوئی قوم اپنی قسمت کی آپ مالک نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ لازمی طور پر کسی ناقابلِ فہم اور ناقابلِ تسخیر طاقت کی اطاعت پر مجبور ہیں۔

اس قسم کے اصول جھوٹے اور بزدلانہ ہیں۔ اس قسم کے اصول صرف بزدل اور کمزور افراد اور ڈرپوک قومیں پیدا کر سکتی ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے انسانیت کو بالکلیہ محتاج یا بالکلیہ آزاد نہیں بنایا ہے۔ یہ درست ہے ہر شخص کے گرد ایک مہلک دائرہ کھینچ دیا جاتا ہے۔ جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتا۔ لیکن اس وسیع دائرہ کے اندر وہ طاقتور بھی ہے اور آزاد بھی۔ اور یہی حال اقوام کا ہے۔ موجودہ دور کی اقوام انسانوں کو مساوات سے نہیں روک سکتیں۔ لیکن اس بات کا انحصار خود ان پر ہے کہ آیا اصولِ مساوات ان کو غلامی کی طرف لیجاتا ہے یا آزادی کی طرف۔ علم و دانش کی طرف رہنمائی کرتا ہے یا بربریت کی طرف۔ خوشحالی کی طرف لے جاتا ہے یا بدنصیبی کی طرف۔